سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اُردو (ہند) نمبر ۱۷۲

پیاری زمین

مشہور امریکی مصنّفہ مسز پرل بک کے ناول

گڈ ارتھ GOOD EARTH

کا اُردو ترجمہ

جس پر مصنّفہ کو نوبل پرائز عطا کیا گیا تھا

مترجمہ

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

شایع کردہ

انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی

تعارف

پرل اِس بک کو ۱۹۳۸ء کا نوبل انعام "حد [illegible] بق زندگی کی سچی اور دل چسپ تصویر کشی اور سوانح کے شہ کاروں کے لیے" دیا گیا۔

سویڈش اکیڈمی کے ڈاکٹر پَر ہالسٹروم نے مصنفہ کی تصنیفوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا:

"پرل بک کو ان کی ممتاز تصنیفوں کے لیے جو قومی اور نسلی حد بندیوں سے بے نیاز ایک عالمگیر ہمخیالی اور ہمدردی کا ڈول ڈال رہی ہیں، نیز اُن افکار اور تحریروں کے لیے جو انھوں نے انسانی نصب العین کے متعلق لکھی ہیں اور اب جن کی حیثیت بلاشبہہ ایک اعلیٰ اور زندہ فن کی ہوگئی ہے سویڈش اکیڈمی اس سال کا انعام دیتے ہوئے محسوس کرتی ہے کہ وہ الفرڈ نوبل کے مستقبل کے منصوبوں کے مطابق عمل کر رہی ہے۔"

پرل بک نے ایک مرتبہ بتایا کہ چین کی ہستی اور فطرت کی ترجمانی کا منصب انھیں کیسے حاصل ہوا وہ اس طرف محض ادبی امتیاز حاصل کرنے کے لے نہیں متوجہ ہوئیں۔ یہ منصب انھیں بغیر کسی ارادے کے خود بخود مل گیا۔ وہ کہتی ہیں:

"میری سب سے بڑی دل چسپی اور مسرت کا موجب ہمیشہ عام لوگ رہے ہیں اور چونکہ میں چینیوں میں رہتی ہوں اس لیے خاص کر چینی لوگ میرے مرکز رہے ہیں۔ جب مجھ سے یہ پوچھا جاتا ہے

کہ وہ کس طرح کے لوگ ہیں تو میں جواب نہیں دے سکتی۔ وہ ایسے یا ویسے نہیں وہ صرف لوگ ہیں۔ جس طرح میں اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے بارے میں نہیں کہہ سکتی اسی طرح ان کی تفصیل بھی نہیں بیان کر سکتی۔ میں ان سے اتنی نزدیک رہی ہوں اور میرا ان سے اتنا گہرا تعلق رہا ہے کہ اس سوال کا موقع ہی نہیں آیا۔"

وہ ہمہ تن چینیوں میں رہی ہیں، ان کے تمام تغیرات کی شریک — اُن کی خوشحالی میں بھی اور قحط سالی کی مصیبتوں میں بھی، انقلاب کے خونی ہنگاموں میں بھی اور خیالی نظام کے بحران میں بھی۔ ان کا تعلق جدید تعلیم یافتہ اونچے طبقے سے بھی رہا ہے اور اصلی قدیم دہقانوں سے بھی جنھوں نے ان سے پہلے کسی مغربی انسان کی شکل تک نہ دیکھی تھی۔ اکثر شدید خطروں میں اجنبی کی حیثیت سے رہتے ہوئے بھی انھوں نے اپنے کو اجنبی محسوس نہیں کیا۔ غرض کہ ان کا مطمح نظر ہمیشہ گہری اور پرجوش انسانیت رہا ہے۔ خالص واقعیت پسندی سے انھوں نے اپنے تجربے اور معلومات میں ایک جان ڈال دی ہے اور دنیا کے سامنے وہ "دیہاتی داستان" پیش کی ہے جس نے انھیں سارے عالم میں مشہور کر دیا۔

مسز پرل بک امریکی ہیں لیکن ان کا ذہنی اور روحانی تعلق چین سے ہے۔ ان کے لکھنے لکھانے کے شوق کی ابتدا چینی ناولوں سے ہوئی۔ کہانی کیسے لکھنی اور کیسے کہنی چاہیے اس کا خیال انھیں سب سے پہلے چین میں پیدا ہوا۔ ان کا یقین ہے کہ چینی ناول مغربی ناول اور مغربی ناول نویسوں کے لیے موجب بصیرت ہوں گے۔

نوبل پرائز دیے جانے کے وقت ان سے کسی ادبی موضوع پر تقریر کرنے کی درخواست کی گئی تھی، کئی سال سے وہ دیسی چینی ناول کا مطالعہ کر رہی تھیں

اور اس موقع پر انھوں نے اسی کے متعلق اظہار خیال کیا۔ یہ تقریر ۱۲ دسمبر ۱۹۳۸ء کو سویڈش اکیڈمی کے سامنے کی گئی تھی۔ ذیل کا مضمون اسی تقریر سے ماخوذ ہے:

چینی ناول

چینی ناول سے ان کی مراد دیسی چینی ناول ہے۔ جدید چینی ناول کو وہ "دوغلی تصانیف" کہتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جدید چینی مصنفوں پر مغربی اثرات بہت ہیں اور وہ اپنے ملک کے قیمتی خزانوں سے ناواقف ہیں۔

چینی ناول کو صناعی کا درجہ کبھی نہ ملا اور نہ چینی ناول نویسوں نے اپنے کو صناع سمجھا۔ چینی ناول، اس کی تاریخ، وسعت اور مقصد، لوگوں کی زندگی میں اس کی جگہ ــــ نہایت اہم جگہ ــــ کو اس حقیقت کی تیز روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ آج کل جب کہ ناول کو صناعی تصور کیا جاتا ہے یہ بات عجیب معلوم ہوگی لیکن چین میں صناعی اور ناول کا دور کا تعلق بھی نہیں رہا ہے۔ وہاں ادب بحیثیت صناعی عالموں کی مخصوص ملکیت تھا، ایسی صناعی جسے انھوں نے خود ایک دوسرے کے لیے اپنے قواعد و ضوابط کے مطابق بنا رکھا تھا۔ اور اس میں ناول کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ اور ملک میں ان چینی عالموں کو بڑی قوت اور اقتدار حاصل تھا۔ مستبدانہ قدیم قانون کی رو سے فلسفہ، مذہب اور فن و ادب اُن کی ملک میں تھے کیونکہ ذرائع تعلیم انھیں کو حاصل تھے اس لیے کہ پڑھنا لکھنا صرف وہی جانتے تھے۔ ان کی قوت اور اثر سے بادشاہ بھی ڈرتے تھے اور اسی لیے بادشاہوں نے ان کو خود اُنھیں کے علم میں مقید کر دینے کا طریقہ نکالا یعنی سرکاری امتحانات کو سیاسی اقتدار کا ذریعہ بنا دیا اور امتحان بھی ایسے غیر معمولی سخت کہ جن کی تیاری میں انسان کا دماغ اور زندگی دونوں

بجھ کر رہ جاتے۔ ان کی تیاری کے لیے مردہ قدیم کتابوں کے رٹنے اور نقل کرنے میں اس طرح ڈوب جانا پڑتا کہ زمانۂ حال اور اس کی غلط کاریوں پر نگاہ ڈالنے کی فرصت ہی نہ ملتی۔ پچھلے زمانے میں عالموں نے فن کے قوانین بنائے تھے لیکن ان میں ناول کو کوئی جگہ نہ دی حالانکہ وہ موجود تھا مگر وہ اسے نہ دیکھ سکے کیونکہ ناول عوام کی زندگی میں پیدا ہوتے ہیں، اور زندہ لوگ کیا کر رہے تھے اس کی عالموں کو کچھ خبر نہ تھی اس لیے کہ اہل علم ادب ہی کو صناعی سمجھتے تھے۔

اہل علم نے لوگوں کو نظر انداز کیا تو لوگوں نے بھی ان کا خوب مذاق اڑایا۔ ان پہ بے شمار پھبتیاں کہی گئیں اور ان عالموں کا طبقہ ایک زمانے سے چینیوں کے مذاق کا نشانہ بنا رہا۔ ناولوں میں ان کا اکثر ذکر آتا ہے لیکن ہر جگہ ان کی ہیئت ایک ہی سی پائی جاتی ہے جیسے کہ وہ فی الحقیقت زندگی میں پائے جاتے ہیں۔ مردہ ماضی اور قدیم تصنیفات کی رسمی تحریروں کے مطالعے نے تمام چینی عالموں کو ایک سا بنا دیا ہے اور ان کے خیالات بھی ایک جیسے ہیں۔ سوا چین کے اور کہیں اس کی مثال نہیں ملتی ـــ شاید اکے دُکے افراد کہیں اور بھی ہوں لیکن چین میں تو یہ ایک خاص طبقہ ہے ان کے متعلق لوگوں کے عجیب و غریب تخیلات ہیں۔ ادبی جلسوں کے سوا یہ کہیں نظر نہیں آتے۔ ان کا سارا وقت مردہ ادب کے مطالعے اور اس کی نقالی میں ویسا ہی نیا ادب پیدا کرنے کی کوشش میں گزرتا ہے۔ نئی اور جدید چیزوں سے انھیں نفرت ہے کیونکہ جن موضوعات کو وہ جانتے ہیں ان میں یہ چیزیں کہیں کھپ نہیں سکتیں اور جب ان جانے ہوئے موضوعات اور عنوانات کے تحت وہ کسی تحریر کو نہیں لا سکتے تو انھیں یقین ہو جاتا کہ یہ کوئی قابل وقعت چیز نہیں اور ظاہر ہے کہ ان کی رائے کی صحت میں کوئی شبہہ نہیں ہو سکتا! جب وہ کہتے کہ "یہ ہے آرٹ" تو اس کے یہ معنی

ہوئے کہ یہ چیز کہیں اور نہیں مل سکتی کیونکہ جس چیز کو وہ تسلیم نہ کرتے اس کا وجود ہی نہ ہوتا اور چونکہ ناول ان کی فہرست میں نہ تھا اس لیے ان کے نزدیک اس کا بحیثیت ادب کوئی وجود نہ تھا۔

چین کے ایک بڑے ادبی نقاد یاؤ نئی نے ۱۷۷۶ء میں ان موضوعات کی فہرست مرتب کی تھی جو ادب میں شمار ہوتے ہیں۔ اس میں مقالے، سرکاری نوٹ، سوانح عمریاں، لطیفے، کتبے، نظمیں اور غزلیں، نوحے اور تاریخ کا تذکرہ تھا لیکن ناول کا نام تک نہ تھا حالانکہ چینی ناول عوام میں صدیوں سے مقبول چلا آرہا تھا اور اس وقت انتہائی ترقی کر چکا تھا۔ چینی ادب کی عظیم الشان تالیف سسو کو چوئن شو میں بھی (جس کی تالیف ۱۷۷۲ء میں شہنشاہ چین لنگ کے حکم سے ہوئی تھی)، ناول کا ادب کے سلسلے میں کہیں تذکرہ نہیں۔

یہ چینی ناول اور چینی ناول نویسوں کی خوش قسمتی تھی کہ عالموں نے اسے ادبی حیثیت نہ دی۔ ان عالموں کی تنقید اور ان کے فنی مطالبات، ان کے اظہار بیان کے اصول اور ادبی اہمیت کے معیار، غرض کہ ان کی اس ساری بحث سے کہ آرٹ کیا ہے اور کیا نہیں ہے وہ محفوظ رہے۔ عالموں کے نزدیک آرٹ گویا ایک مستقل بالذات شے تھی۔ انھیں احساس تک نہ تھا کہ یہ بدلتی رہنے والی چیز ہے جس میں ہمیشہ اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے۔ بہر حال چینی ناول عالموں کی دستبرد سے محفوظ عوام کی مقبولیت کے گہوارے میں نشو و نما پاتا رہا۔
امریکی شاعرہ ایملی ڈکنسن نے کہا ہے:

”فطرت ایک آسیب زدہ مکان ہے لیکن آرٹ ایسا گھر ہے جو آسیب زدہ ہونے کی کوشش کرتا ہے۔“

تو چینی عالموں کو ناول کی نشو و نما اور ترقی کا کبھی علم نہ ہوا۔ اگر ہوا بھی تو

انھوں نے اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔ بد قسمتی سے انھیں کبھی کبھی اس کی طرف نگاہیں اٹھانی پڑیں کیونکہ نوجوان بادشاہوں کو ناول پسند آتے۔ ایسے موقعوں پر بے چارے عالموں کو بڑی مشکل پیش آتی۔ لیکن انھوں نے "سماجی اہمیت" کی اصطلاح نکالی اور لمبے لمبے رسالے یہ ثابت کرنے کو لکھ ڈالے کہ ناول ناول نہ تھے بلکہ "سماجی اہمیت" رکھنے والی دستاویز۔ امریکہ کے نہایت ہی جدید ادیبوں کو "سماجی اہمیت" کی اصطلاح ابھی حال ہی میں معلوم ہوئی ہے لیکن چین کے پرانے عالم اسے ہزاروں سال پہلے جانتے تھے اور اس وقت انھوں نے بھی مطالبہ کیا تھا کہ فن کا درجہ حاصل کرنے کے لیے ناول میں "سماجی اہمیت" ہونی چاہیے۔

لیکن زیادہ تر چینی عالم ناول کے متعلق کچھ اس طرح سوچتے :

" ادب فن ہے۔ تمام فن میں سماجی اہمیت ہوتی ہے

اس کتاب میں سماجی اہمیت نہیں، اس لیے یہ ادب نہیں ہے۔"

اور اس بنا پر چین میں ناول کا ادب میں شمار نہ تھا۔

مسز پرل بک کی تعلیم انھیں اصولوں پر ہوئی۔ انھوں نے عالموں سے یہ سیکھا کہ خالص ادب میں ناول کی کوئی جگہ نہیں۔ فن ادب عالم ہی بنا سکتے تھے۔ ذہن اور تخیل کے سیلاب کی، اس ابلتے ہوئے دھارے کی جو زندگی کی گہرائیوں سے پھوٹتا ہے، روک تھام کے لیے عالموں کے دماغ قانون وضع کرتے ہیں۔ فن، قدیم ہوں یا جدید، مثل ظروف کے تھے جن میں ذہن اور تخیل کی تخلیقات عالموں اور نقادوں کے سامنے پیش ہونی چاہئیں۔ . . . لیکن چینی عوام نے اس کی پروا نہ کی۔ کہانی کی دھار فطرت کی سہولتوں کے سہارے بہتی رہی اور صرف عوام اس سے تسکین اور سیرابی حاصل کرتے رہے۔

چین میں ناول عوام کی پیدا کی ہوئی چیز ہے اور انھیں کی ملک۔ اس کی زبان تک ان کی اپنی ہے۔ کلاسکل وِن لی عالموں کے ادب کی زبان تھی۔ چینی ناول پائ ھوا یعنی "سادہ بولی" میں ہوتے ہیں۔ یہ لوگوں کی بولی ہے۔ اور بذات خود یہی بات عالموں کے لیے حد درجہ قابل نفرت تھی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس بولی میں لکھنے کی وجہ سے اسلوب اتنا سادہ اور آسان ہو جاتا ہے کہ اس میں طرز نگارش اور انداز بیان کی خوبیاں نہیں پیدا ہو سکتیں۔

لیکن ان میں چند مستثنیات بھی ہیں۔ یہ وہ عالم ہیں جو ہندستان سے بودھ مذہب کا تحفہ لے کر چین آئے تھے۔ مغرب میں پیوریٹنزم (PURITANISM) ناول کی دشمن رہی۔ لیکن مشرق میں بودھ مذہب والے ان سے زیادہ عقلمند نکلے۔ اس زمانے میں جو تاریخ میں چھ خاندانوں کا عہد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جب وہ چین آئے تو انھوں نے دیکھا کہ ادب کا لوگوں سے کوئی تعلق نہیں اور رواج اور دستور کی پابندی میں اس کا دم نکل رہا ہے۔ پیشہ ور ادیب اس وقت بھی تصنیف اور تخلیق سے زیادہ اپنے مقالات اور منظومات کے عنوانات اور موضوعات طے کرنے میں محو تھے۔ وہ ان تمام تحریروں سے نفرت کرنے لگ گئے تھے جو ان کے قواعد پر پوری نہ اترتی تھیں۔ اس پابند ادبی فضا میں بودھ مترجمین اپنے آزاد خیالی کے خزانے لیے ہوئے پہنچے۔ ان میں کچھ تو ہندستانی تھے اور کچھ چینی۔ انھوں نے صاف صاف کہا کہ ان کا مقصد عالموں اور ادیبوں کے اصول تحریر اور قوانین اسلوب کی پابندی کرنا نہ تھا بلکہ اپنی تعلیم کو عوام کے سامنے سادہ اور سلیس طریقے سے پیش کرنا انھوں نے اپنی مذہبی تعلیمات عام زبان میں پیش کیں یعنی اس زبان میں جو ناول کے لیے استعمال کی جاتی تھی اور چونکہ عام لوگوں کو کہانیاں پسند ہوتی ہیں اس لیے

انھوں نے کہانی کو ذریعۂ تبلیغ بنایا۔ بودھ مذہب کی مشہور کتاب فاۂ شو جنگ کے دیباچے میں لکھا ہے: "دیوتاؤں کا کلام سادہ لفظوں میں ہونا چاہیے۔" چینی ناول نویسوں کا تقریباً یہی مسلک رہا ہے۔ ان کے نزدیک لوگ دیوتا ہیں اور دیوتا لوگ۔

چینی ناول کا اصل مقصد لوگوں کو خوش کرنا ہوتا تھا۔ خوش کرنے کے معنی ہنسانا نہیں، اگرچہ چینی ناول کے مقاصد میں یہ بھی شامل ہوتا ہے۔ خوش کرنے کے معنی ہیں دل چسپیوں کو ابھارنا، زندگی کی تصویریں واقعیت کے ساتھ پیش کر کے لوگوں کے دماغوں کو روشن کرنا، فن کی موشگافیوں سے قطع نظر ہر زمانے کے لوگوں کی زندگی کی کہانیاں اس طرح پیش کرنا کہ پڑھنے والے اس میں اپنا عکس دیکھیں۔ بودھ مذہب والے جب تبلیغ کرنے چلے تو انھیں بھی پتا چل گیا کہ اگر دیوتاؤں کو عوام کی روزانہ زندگی کے ذریعے پیش کیا جائے تو لوگ انھیں زیادہ اچھی طرح سمجھ سکیں گے

لیکن دیسی بولی میں چینی ناول کے لکھے جانے کا اصل سبب یہ تھا کہ عوام لکھ پڑھ نہ سکتے تھے اور اس لیے ناول ایسی زبان میں لکھا جانا چاہیے کہ جب پڑھ کے سنایا جائے تو وہ لوگ سمجھ سکیں جنھیں صرف بول چال کی زبان آتی ہو۔

دو سو نفوس کے گانو میں شاید صرف ایک آدمی لکھا پڑھا ہوتا۔ چھٹیوں کے دن یا شام کے وقت وہ لوگوں کو کوئی کہانی پڑھ کے سناتا۔ چینی ناول کی ابتدا اس سیدھے سادے طریقے سے ہوئی۔ رفتہ رفتہ یہ رواج چل نکلا کہ سننے والے قصہ خواں کو پیسے دو پیسے دے دیتے کہ وہ چائے پی کر حلق تر کر لے۔ یا اس لیے کہ اس طرح جو اس کا وقت ضایع ہوتا تھا اس کا معاوضہ

ہوجائے۔ اب اگر پیسے زیادہ ملنے لگتے تو وہ اپنا کام چھوڑ چھاڑ پیشہ ور قصہ خواں بن جاتا۔ اور جو کہانیاں یہ قصہ خواں پڑھ کے سناتے تھے انھیں سے ناول کی ابتدا ہوئی۔ اس طرح کی کہانیاں اتنی زیادہ تعداد میں لکھی ہوئی نہ تھیں کہ جینیوں جیسے ڈرامائی کہانیوں کے دلدادہ لوگوں کی مانگ پوری ہوتی۔ اس لیے داستان گو اپنا ذخیرہ بڑھانے لگا۔ عالموں کی لکھی ہوئی خشک داستانوں میں سے اس نے کچھ باتیں لیں اور پھر اپنے تخیل کی مدد سے، جو عوام کے میل جول کے تجربات سے مالا مال تھا، ماضی کی مردہ شخصیتوں میں نئی روح پھونک دی۔ اس نے درباری زندگی اور وہاں کی ریشہ دوانیوں کی کہانیاں بنائیں۔ بادشاہوں کی منظور نظر ہستیوں کے نام ڈھونڈھ نکالے جن کی خاطر بہت سے خاندان تباہ ہوئے تھے۔ گانو گانو مارے مارے پھرنے کے سلسلے میں اس نے اپنے زمانے کے بھی عجیب و غریب قصے سنے اور انھیں لکھ لیا۔ لوگ اس سے اپنے تجربے اور آپ بیتیاں بیان کرتے اور دوسرے لوگوں کو سنانے کے لیے وہ انھیں بھی لکھ لیتا اور ان میں نمک مرچ لگا کر تھوڑی سی رنگینی پیدا کرتا اور لوگوں کو سناتا۔ لیکن یہ چاشنی ادبی اصطلاحوں اور فنی استعاروں سے نہیں پیدا کی جاتی کیونکہ لوگوں کو اس کی پروا کہاں تھی۔ داستان گو کے پیش نظر اس کے سننے والے تھے اور اسے معلوم تھا کہ انھیں وہ انداز بیان پسند تھا جو وہ خود استعمال کرتے تھے، سادہ اور سلیس، جس میں ان کے روزمرہ کی بول چال کے چھوٹے چھوٹے لفظ ہوتے تھے۔ کوئی ادیبانہ رنگ یا صناعی نہ ہوتی۔ ہاں کہیں کہیں کسی شخص یا کسی جگہ کے بیان میں کچھ رنگینی ہوتی تھی تو صرف اس قدر کہ سمجھنے میں آسانی ہوجائے، کہانی کے بہاؤ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ کہانی میں رکاوٹ ڈالنے والی کوئی چیز نہ ہونی چاہیے کیونکہ اصل چیز جو وہ چاہتے تھے وہ قصہ ہی ہوتا تھا۔

لیکن کہانی کے معنی بے مقصد عمل یا صرف بھونڈا عمل نہیں۔ چینیوں کا مذاق اس سے بہت بلند ہے۔ ناول میں وہ کردار چاہتے ہیں۔ تین اول درجے کے ناولوں میں شوی ھوچوان کا شمار صرف اسی وجہ سے نہیں ہے کہ اس میں حرکت کی تیز لپٹیں ہیں بلکہ اس لیے کہ اس میں ایک سو آٹھ کردار کا اس صفائی سے بیان ہے کہ ہر ایک الگ الگ پہچانا جا سکتا ہے۔ اس ناول کے متعلق اکثر یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ: "ان ایک سو آٹھ کرداروں میں سے کوئی بھی جب سامنے آتا ہے تو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ یہ فلاں ہے۔ اس کے منہ سے جو الفاظ نکلتے ہیں انھیں سے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ کون ہے۔" تو گویا چینی ناول کی سب سے پہلی خصوصیت جیتی جاگتی کردار نگاری ہے اور پھر یہ کہ یہ کردار نگاری مصنف کے بیان سے نہ ہو بلکہ خود کردار کے حرکات اور گفتگو سے۔

یہ عجیب بات ہے کہ اس وقت جب کہ چائے خانوں میں اور گانو اور چھوٹے شہروں کی سڑکوں پر اس معمولی طریقے سے ناول کی ابتدا ان کہانیوں کی بنیاد پر ہو رہی تھی جو ان پڑھ آدمی اپنے جیسوں کو سنا رہے تھے، شاہی محلوں میں بھی کچھ اسی طرح سے اس کی بنا پڑ رہی تھی۔ شہنشاہوں کا (اور خصوصاً اگر خاندان بیرونی ہوتا) یہ پرانا قاعدہ تھا کہ چند ملازم جنھیں "شاہی کان" کہا جاتا تھا اس کام پر مامور ہوتے تھے کہ معمولی لوگوں کے بھیس میں وہ شہروں اور گانوں کی سڑکوں پر چائے خانوں میں لوگوں سے ملتے ملاتے اور ان کی باتیں سنتے۔ اصل مقصد تو اس کا یہ تھا کہ بادشاہ کو معلوم ہوتا رہے کہ رعایا میں بددلی تو نہیں پھیل رہی ہے اور خاص کر یہ کہ کہیں یہ بددلی اس طرح کے انقلابوں کا پیش خیمہ تو نہیں جو پچھلے خاندانوں کا تختہ الٹ چکے تھے۔

لیکن بادشاہ آخر انسان ہی ہوتے تھے اور ان میں اکثر تو کوئی عالم فاضل

بھی نہ ہوتے۔ بلکہ زیادہ تر تو بگڑی عادتوں والے عیش پرست اشخاص ہوتے۔ "شاہی کانوں" کو طرح طرح کے عجیب و غریب قصے سننے کا موقع ملتا تھا اور جب انھوں نے دیکھا کہ ان آقاؤں کو سیاست سے زیادہ ان کہانیوں کے سننے میں مزا آتا ہے تو اپنی رپورٹ پیش کرنے میں شہنشاہ کو خوش کرنے کے لیے وہی چیزیں سناتے جو اسے پسند تھیں۔ زندگی کی حقیقتوں سے دور سنہرے گنبد۔ میں بند پڑے ہوئے شہنشاہ کو آزادی سے سڑکوں پر گھومنے والے عوام کی عجیب اور دلچسپ باتیں سناتے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے ان باتوں کو لکھ کے سنانا شروع کیا۔ اور کوئی عجب نہیں اگر بادشاہوں کے یہ مخبر اپنے آقا کو لوگوں کی باتیں سنانے کے بعد لوگوں تک بادشاہ کے قصے بھی پہنچاتے ہوں۔ شہنشاہ کے مشغلے، اولاد نہ ہونے کی وجہ سے ملکہ سے جھگڑے، ملکہ کا خواجہ سرا سے مل کر بادشاہ کی چہیتی کنیز کو زہر دینے کی سازش، یہ اور اسی طرح کی اور باتیں لوگوں تک پہنچتی ہوں گی اور اس میں انھیں بڑا لطف آتا ہوگا۔ کیونکہ اس سے انھیں یہ معلوم ہوتا کہ کچھ بھی ہو بادشاہ انھیں جیسا انسان ہے اور اس کے ساتھ بھی پریشانیاں لگی ہوئی ہیں۔ اس طرح ناول کی ترقی کا ایک اور راستہ نکل آیا جس میں آگے چل کے بہت قوت پیدا ہونے والی تھی۔ لیکن پیشہ وراد یبوں نے اس کے وجود کو کبھی تسلیم نہ کیا۔

اس معمولی طریقے سے چینی ناول کی بنیاد پڑی۔ اس کی زبان ہمیشہ دیسی بولی رہی اور اس میں وہی سب چیزیں ہوتیں جن سے لوگوں کو دلچسپی ہوتی دیو پری کے قصے، دیوتاؤں کی کہانیاں، محبت کی داستانیں، سازشوں کے بیان، جنگ و جدال کے ہنگامے غرض کہ ہر وہ چیز جو انسان کی زندگی میں پیش آتی ہے۔

چین میں مغرب کی طرح چند مشہور ہستیوں نے ناول کا ڈول نہیں ڈالا۔ وہاں ناول نویس سے زیادہ ناول کو اہمیت دی گئی ہے چین میں کوئی ڈکنس، ڈیفو، ہارڈی، تھیکرے، بالزاک، فلابر یا ڈوما نہیں ہوا۔ لیکن ناول ایسے ہیں جو دنیا کے کسی ملک کے اچھے سے اچھے ناول کے مقابلے پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔

تو ان ناولوں کے لکھنے والے کون تھے؟

چینی ادیب آج کل اس کا پتہ لگانے میں مصروف ہیں۔ مغربی یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ ادبی نقادوں نے پچھلے پچیس برسوں سے اپنے کس مپرسی میں پڑے ہوئے ناولوں کا کھوج نکالنا شروع کیا ہے۔ لیکن ان کے لکھنے والوں کا پتہ نہیں چلتا۔ اس وقت یہ کہنا مشکل ہے کہ شوئی ھوچوان ایک ہی شخص کے قلم کا رہین منت ہے یا مختلف صدیوں کے مختلف دماغوں کی کاوشوں کا نتیجہ۔ لکھنے والوں نے اپنے زمانے میں جو کچھ دیکھا اور سنا اسے قلمبند کیا لیکن اپنے بارے میں خاموشی اختیار کی ھُنگ لئو ھنگ (سرخ کمرے کا خواب) کا مصنف اپنی تصنیف کے دیباچے میں لکھتا ہے:

"ہان اور تانگ کے عہد کے بارے میں جاننا کچھ ضروری نہیں۔ —— اپنے زمانے کی باتیں بتانا کافی ہے۔"

وہ اپنے زمانے کی باتیں لکھتے اور پرسکون گمنامی میں زندگی گزارتے۔ اپنے ناولوں کے تبصرے یا تنقیدیں نہ پڑھتے، نہ تو انھوں نے اس لطیف فضا تک پہنچنے کی کوشش کی جس میں اہل علم سانس لیتے تھے نہ یہ سوچنے کی زحمت اٹھائی کہ بڑای کے متعلق عالموں کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ کبھی تو وہ بے جانے بوجھے بہت اچھا لکھ جاتے اور بعض مرتبہ ان کی تحریریں اتنی اچھی نہ ہوتیں

اسی گمنامی میں انھوں نے آخری سانس لی اور اب کہ چین کے سارے اہل علم ان کا کھوج نکالنے کو اکٹھے ہوئے ہیں ان کا پتا نہیں ملتا ۔ وقت گزر چکا، ان کا کھوج نکالنا مشکل ہے لیکن انھوں نے جو کچھ لکھا وہ موجود ہے کیونکہ چین کے عوام، جاہل عوام، ناول کو زندہ رکھتے ہیں ـــــ دست بدست نہیں، زبانی ۔

شوئی ھوچوان کے اِدھر کے اڈیشنوں میں شہ نئی آن نے، جس کا اس ناول کی ترتیب میں کافی حصہ ہے، لکھا ہے :

"میری خواہش ہے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں لوگ اسے سمجھیں۔ چاہے پڑھنے والا اچھا آدمی ہو یا بُرا، جاہل ہو یا عالم، اس کتاب کو پڑھ لے۔ کتاب کی طرزِ تحریر اچھی ہے یا بُری، یہ بات اتنی اہم نہیں کہ کوئی اس کی فکر کرے ـــــ افسوس مجھے ایک دن مرجانا ہے۔ کیا پتا میرے بعد آنے والے اس کتاب کو پڑھ کے کیا رائے قایم کریں گے؟ یہ تک معلوم نہیں کہ خود میں دوسرے جنم میں اس کے متعلق کیا خیال کروں گا۔ کیا خبر کہ اس وقت میں اسے پڑھ بھی سکوں گا ۔ تو پھر اتنی فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے ۔"

یہ عجیب بات ہے کہ بعض اہل علم کو اس گمنامی کی آزادی پر رشک آتا تھا ۔ اپنے دکھوں کے بوجھ سے گھبرا کے یا اپنے خشک فن کی تکان سے چور ہو کے وہ فرضی ناموں سے ناول بھی لکھتے اور ناول لکھتے وقت وہ اپنی تمام صناعی اور اس کے اصول اور قواعد و ضوابط کو الگ رکھ دیتے اور معمولی ناول نویسوں کی طرح بڑی سادگی سے لکھتے ۔

چین میں اچھا ناول نویس وہ ہے جو سادگی سے، انداز بیان کو مرصع کیے بغیر، فطری طور پر مضمون کی آمد کے ساتھ لکھتا چلا جائے۔ اس کا کام بس یہی ہے کہ

صرف زندگی کو پیش کردے اور زمان و مکان اور واقعات کے اتھاہ سمندر میں سے کام کی چیزیں نکال لے۔ صفحے کے صفحے پڑھ جایئے لیکن یہ پتا نہیں چلے گا کہ کس کی تحریر ہے کیونکہ اگر کوئی خاص اسلوب قایم ہو جائے تو ناول نویس اسی اسلوب کا پابند ہو جاتا ہے۔ اس حد تک وہ اچھا ناول نویس نہیں رہتا بلکہ ادبی صناع ہو جاتا ہے۔ چینی ناول نویس کو اصول بیان کا شعور نہ ہونا چاہیے۔ محض نفس مضمون کے لحاظ سے لکھنا چاہیے۔ اور ناول نویس نفس مضمون کی مناسبت سے طرز تحریر بھی بدلتے رہتے تھے۔

مغربی معیاروں پر یہ ناول پورے نہیں اترتے۔ شروع سے آخر تک ان میں ایک ربط، تسلسل اور پیوستگی نہیں ہوتی (لیکن زندگی ہی کب ایسی مرتب اور مربوط ہوتی ہے؟) زیادہ تر بہت طویل ہوتے ہیں، بہت سے واقعات اور بے شمار کردار سے بھرے ہوئے۔ ان میں واقعات اور افسانے حقیقت اور رومان کا امتزاج ہوتا ہے۔ جادو کے اَن ہونے واقعات یا خواب کی خیالی باتوں کا بیان کچھ اس قطعی طور سے ہوتا ہے کہ عقل و شعور کے خلاف ان کو سچ ماننے پر مجبور ہو جانا پڑتا ہے۔ ابتدائی ناول دیہاتی قصے کہانیوں سے بھرے ہوئے ہیں کیونکہ اس زمانے میں لوگ انھیں چیزوں کو پسند کرتے تھے لیکن ان ناولوں کو پڑھے بغیر آج کل کے چینی ذہن و دماغ کو سمجھنا ناممکن ہے۔ کیونکہ موجودہ چینی دماغ کی تشکیل میں ناولوں کا بھی حصہ ہے اور باوجود اس کے کہ چینی سیاست کار اور مغربی تعلیم پائے ہوئے اہل علم دنیا کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ادب العوام یعنی عوام کے عقاید و روایات کا کہیں پتا نہیں، واقعہ اس کے برعکس ہے۔ چین کا اصلی ذہن و دماغ ابھی تک وہی ہے کہ:

"اپنی دیہاتی سادگی میں ہر بات کا یقین کر لیتا ہے۔ یہ چاندی کے

بادبانوں والے سونے کے جہازوں، سفید روشن شہروں اور رنگین
پریوں کی تخلیق کرتا ہے اور جب یہ کشادہ دیہاتی دماغ سیاست کی
طرف رُخ کرتا ہے تو ہر چیز کے لیے آمنا و صدقنا کہنے پر تیار ہو جاتا ہے۔"

اسی عوام کے دماغ سے کہانیاں نکل نکل کے ہزاروں سال کی زندگی کے تجربوں میں پل کے ناول بنتی گئیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان ناولوں میں بھی تبدیلی آتی گئی۔ چین کے مشہور ناولوں کے ساتھ کسی ایک لکھنے والے کا نام منسوب نہیں۔ اس لیے کہ کسی ایک نے انھیں نہیں لکھا پہلے معمولی سا قصہ ہوتا۔ رفتہ رفتہ مختلف بیانوں کے ترمیم و اضافہ کے بعد پوری ایک عمارت کھڑی ہو جاتی۔ مثال کے طور پر بہت مشہور کہانی "سفید سانپ" (پئی شی چوان) کو لیجیے پہلے پہل کسی نامعلوم شخص نے تانگ خاندان کے زمانے میں اسے لکھا۔ اس وقت یہ ایک معمولی سی مافوق الفطرت کہانی تھی جس کا ہیرو ایک عظیم الشان سفید سانپ تھا۔ دوسری صدی کے بیان میں سانپ کی جگہ ایک خبیث عورت نے لے لی تیسرے بیان میں کچھ انسانی عنصر کی آمیزش ہوئی۔ خبیث عورت کی جگہ ایک باوفا بیوی آگئی جو اپنے شوہر کی خدمت کرتی ہے اور اُس کے ایک بیٹا ہوتا ہے۔ اس طرح قصے میں نئے کردار ہی نہیں بڑھائے گئے بلکہ اس میں نئی خصوصیات بھی آئیں اور اب اس کا اختتام مافوق الفطرت کہانی جیسا نہیں بلکہ انسانوں کی زندگی کے ناول جیسا ہو گیا۔

اسی طرح چینی تاریخ کی ابتدا میں بہت سی ایسی کتابیں ملتی ہیں جو ناول نہیں لیکن جن سے ناول کی سوت پھوٹتی ہے۔ بہت سی ایسی کتابیں تو ضایع ہوگئیں کیونکہ پہلے ان کی کوئی اہمیت نہ سمجھی گئی۔ لیکن کچھ بچ رہیں۔ مثلاً ہان کی ابتدائی کہانیاں جن کا اسلوب اتنا زوردار اور پرشکوہ ہے کہ آج

بھی کہا جاتا ہے کہ ان میں "طوفان کی تیزی اور شعلوں کی لپیٹ ہے"۔ منگ خاندان کے زمانے میں کس طرح ان میں سے بہت سی تالی پنگ کوان شی نام کے ایک بڑے مجموعے میں شامل ہوگئیں۔ اس مجموعے میں توہمات اور مذہب، رحم اور نیکی، جزا و سزا، خواب اور معجزے، اژدہے اور دیوی دیوتا اور پروہت، شیر اور لومڑی، آواگون اور قیامت ہر موضوع پر کہانیاں ہیں۔

ابتدائی زمانے کی ان کہانیوں کے موضوع زیادہ تر خرق عادات واقعات تھے۔ مثلاً کنواریوں کے پیٹ سے پیدا ہونے والا دیوتا، انسانوں کا روپ دھارن کرنے والے دیوتا وغیرہ۔ اور یہ بودھ مذہب کے زیر اثر ہوا۔ معجزے اور مجازیہ قصوں کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ مثلاً غریب اہل علم کے قلم کا کھل کے پھول بن جانا۔ مردوں اور عورتوں کا خواب میں عجیب و غریب سرزمین میں پہنچ جانا وغیرہ۔ لیکن ان کہانیوں میں ہر زمانے کا عکس پایا جاتا ہے ھان کے عہد کی کہانیوں میں جوش بیان ہے اور ان کے موضوع قومی معاملات ہیں اور ان کے کردار بڑے آدمی اور ہیرو ہوتے ہیں۔ اس عہد زرین میں مزاح کی طرف بھی بہت رجحان تھا۔ اس کے بعد اس سنہرے زمانے کا رنگ پھیکا ہوتے ہی حالات بھی بدلے لیکن چینی اس زمانے کو کبھی نہیں بھولتے اور آج بھی اپنے کو "ھان کے بیٹے" کہنا پسند کرتے ہیں۔ بعد میں گھن لگے ہوئے زمانے میں کہانیوں کا طرز نگارش بھی کمزور اور مصنوعی ہوگیا اور موضوع بھی بہت معمولی اختیار کیے گئے۔ بقول چینیوں کے "چھی خاندانوں کے عہد میں لوگ معمولی چیزوں، مثلاً عورت، آبشار یا چڑیا کے بارے میں لکھتے تھے"۔

ھان کے خاندان کا زمانہ "عہد زرین" تھا تو تانگ خاندان کا زمانہ "عہد سیمیں" اور افسانہائے عشق، جن کے لیے یہ عہد ممتاز ہے، چاندی کی روشن

لکیریں ہیں۔ یہ عشق و محبت کا زمانہ تھا۔ یانگ کوئی فئی اور مئی فئی جیسی حسینان حرم کی ہزاروں کہانیاں لکھی گئیں۔ عہد تانگ کے یہ افسانہائے حسن و عشق بعض جگہ تو اپنی وحدت اور پیچیدگی میں مغربی ناولوں کے معیار پر آجاتے ہیں۔ چینی کہتے ہیں :

"تانگ کے زمانے کی کہانیاں پڑھنی چاہئیں کیونکہ، گو ان کے موضوع نہایت غیر اہم ہیں، لیکن ان کا انداز بیان اتنا پُر اثر ہے کہ آنسو نکل پڑتے ہیں۔"

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ان سب افسانہائے عشق کے موضوع وہ عشق نہیں جن کا انجام شادی ہے یا جو شادی کا نتیجہ ہوتے ہیں بلکہ وہ جو رشتۂ ازدواج سے باہر ہیں قابل غور بات یہ ہے کہ جس کہانی کا موضوع شادی ہے اس کا انجام المیہ ہے۔ دو مشہور کہانیاں پیئی لی شی اور چیاؤ فینگ چی تو بالکل ناجائز محبت کی داستانیں ہیں جن کے لکھنے کا مقصد ہی غالباً بیوی پر کسبیوں کی برتری دکھانا ہے۔ کسبیاں پڑھی لکھی، موسیقی کی ماہر ہشیار حسینائیں تھیں، اور بیوی "زرد چہرے والی" ان پڑھ عورت!

اس رجحان نے اتنا زور پکڑا کہ حکومت ایسی کہانیوں کی مقبولیت سے گھبرا گئی اور انھیں انقلابی اور خطرناک قرار دے کر ان کی روک تھام کی۔ کیونکہ ان کا حملہ چینی تہذیب کی بنیاد، نظام خاندان پر تھا۔

تانگ خاندان کے زمانے کے رومانوں کی اہمیت اس لیے نہیں کہ ان کے علاوہ اور کسی قسم کی کہانیاں نہ تھیں بلکہ اس لیے ہے کہ اس عہد کے ناولوں کا خاص موضوع مرد و عورت کی محبت ہے۔ مزاحیہ اور طنزیہ ناول بھی لکھے گئے اور خاص کر ایک کہانی تو عجیب و غریب ہے جو مرغ بازی سے متعلق ہے۔

اس زمانے میں مرغ بازی کا بہت شوق تھا اور دربار کا تو یہ محبوب مشغلہ تھا۔

زمانے کے ساتھ ساتھ ہر چیز میں تبدیلی ہوتی ہے۔ ناول کی اصل شکل سُنگ خاندان کے عہد میں ظاہر ہوتی ہے اور یوآن خاندان اس کے انتہائی عروج کا زمانہ ہے۔ اس زمانے کے ناولوں سے بہتر ناول پھر کبھی نہیں لکھے گئے۔ سُنگ خاندان کے زمانے کا ایک ناول "سرخ کمرے کا خواب" کچھ اس ٹکر کا ہے۔ صدیوں سے عوام کی پسندیدگی اور مقبولیت کے گہوارے میں حقیقی زندگی سے سیراب ہوتے ہوئے ناول کی آہستہ آہستہ پرورش ہو رہی تھی۔ رفتہ رفتہ شاخیں پھیل رہی تھیں اور کونپلیں پھوٹ رہی تھیں اور یوآن خاندان کے زمانے میں پھل پھول لگ آئے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اس قدیم ملک پر منگولی فاتحوں کا قبضہ ہوا اور ان کا بھوکا، غیر تہذیب یافتہ پرجوش دماغ تسکین ڈھونڈھ رہا تھا اور قدیم ادب کی سوکھی ہوئی بھوسی سے اس کی تشفی ناممکن تھی اس لیے ڈراما اور ناول کی طرف ان کی نگاہیں اُٹھیں۔ اس وقت شاہی پسندیدگی کے سایے میں چین کے تین مشہور ناولوں میں سے دو لکھے گئے: شوئی ھوچوان اور سان کئو (تیسرا "سرخ کمرے کا خواب" ہے)

ان تینوں ناولوں کی چینیوں کے نزدیک کیا اہمیت اور حیثیت ہے یہ بتانا بہت مشکل ہے۔ چین کے مقبول ترین ادب، عوام کے ادب، کے یہ بہترین نمونے ہیں۔ ادیبوں اور عالموں نے ان کو بھی نظر انداز کیا۔ ابتدائی حکومتوں نے انھیں انقلابی، خطرناک اور ردی قرار دیا۔ لیکن چونکہ لوگ انھیں پڑھتے تھے، ان کی کہانیاں کہتے، ان کے گیت گاتے، اور ان کے ڈرامے کھیلتے تھے اس لیے یہ مٹائے نہ جا سکے۔ آخر کار اہل علم بھی بادل ناخواستہ ان کی طرف توجہ کرنے پر مجبور ہوئے اور کہا کہ یہ ناول نہیں بلکہ مجازیہ قصے ہیں اور اس حیثیت سے

توان کا ادب میں شمار ہونا چاہیے۔ لیکن لوگوں نے نہ توان نظریوں کی پروا کی اور نہ علماء کے رسالوں اور تبصروں کو پڑھا۔ انھوں نے یہ ناول محض ناول کی حیثیت سے تیار کیے تھے، اپنے جذبات واحساسات کے اظہار کے لیے یہ کہانیاں لکھی تھیں اور وہ انھیں پڑھ کے بہت خوش تھے۔

واقعی ناول اپنی تخلیق کے لیے سراسر عوام ہی کے رہین منت ہیں۔ گرچہ شوئی ھوچوان کے جدید نسخے میں شانئی آن کا نام مصنف کی حیثیت سے ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک شخص کے قلم کا نتیجہ نہیں۔ سُنگ خاندان کے زمانے میں ڈاکوؤں کے متعلق کچھ کہانیاں تھیں اور یہی کہانیاں اس ناول کی بنیاد ہیں۔ اس کی ابتدا تاریخ کے ورقوں میں ہے۔ وہ جگہ جہاں ڈاکوؤں کا اڈا تھا شانتنگ میں ابھی تک موجود ہے۔ تیرھویں صدی عیسوی چین کے لیے بہت بڑا زمانہ تھا یہ شاہی خاندان کے تنزل اور تباہی کا زمانہ تھا عجیب افراتفری اور انتشار پھیلا ہوا تھا۔ ایک طرف دولت مندوں کے خزانے بھرتے چلے جا رہے تھے۔ دوسری طرف غریبوں کی مفلسی بڑھتی جا رہی تھی اور جب اس کو درست کرنے والا کوئی نہ رہا تو شریف ڈاکو میدان میں آئے۔

اس طویل ناول کی عہد بہ عہد ترقی اور اس کے ترمیم واضافہ کی تفصیل بیان کرنی ممکن نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شہ نئی آن کو یہ کسی دکان میں مل گیا اور اس نے اسے نئے سرے سے لکھا۔ اس کے بعد اور بھی یہ قصہ مختلف طریقے سے لکھا گیا۔ آج کل اس کے پانچ چھ مختلف نسخے ایسے ہیں جن کی بڑی اہمیت ہے۔ ایک نسخہ وہ ہے جو سرکاری طور پر تیار کیا گیا تھا۔ اس میں سرکاری فوج کے ہاتھوں ڈاکوؤں کی پسپائی اور تباہی دکھائی گئی ہے۔ لیکن چین کے عوام بہت آزاد مزاج ہیں۔ انھوں نے اس سرکاری نسخے کو قبول نہیں کیا اور خود اپنی داستان

قایم رکھی۔ یہ چینی حکام کے خلاف عوام کی جدو جہد کی ایک مثال ہے۔

یہاں پر یہ تذکرہ کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ شوئی ھوچوان کے کچھ حصے کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں بھی ہوچکا ہے اور انگریزی میں مکمل ترجمہ مسز پرل بک نے "تمام انسان بھائی ہیں" (ALL MEN ARE BROTHERS) کے نام سے کیا ہے۔

یہ ناول زمانے کے جھکولے سہتا آج تک باقی رہا ہے اور اب تو اس پر ایک نئی خصوصیت آگئی ہے۔ چینی کمیونسٹوں نے اس کا ایک نیا اڈیشن دیباچے کے ساتھ چھاپ کر پہلے کمیونسٹ ادب کی حیثیت سے اسے شایع کیا ہے۔ وقت کی قید سے بے نیازی اس ناول کی بڑائی کا سب سے اہم ثبوت ہے۔ آج بھی اس میں اتنی ہی حقیقت ہے جتنی پچھلی نسلوں میں تھی۔ اس کے اوراق پر اب بھی چینی زندگی کی سچی تصویریں ہیں۔ مذہبی رہنما اور درباری، تاجر اور اہل علم، پاکدامن عورتیں اور حسن فروش کسبیاں، بوڑھے، جوان، بلکہ شریر بچے تک اس میں جھانکتے ہیں۔ کمی ہے تو صرف مغرب میں تعلیم پائے ہوئے جدید اہل علم کی۔ لیکن اس کتاب کے آخری صفحے لکھنے والے کے زمانے میں بھی اگر یہ پی ایچ ڈی والے اہل علم ہوتے تو ان صفحوں پر ضرور ان کا تذکرہ ہوتا۔ اپنی نئی تعلیم کی مضحکہ خیزی کے ساتھ یہ بیکار، نااہل، قابل رحم ہستیاں قدیم دستار فضیلت پر ایک معمولی سے دھبے کی طرح ضرور دکھائی جاتیں۔

چینیوں کا خیال ہے کہ "شوئی ھو نوجوانوں کو نہیں پڑھنا چاہیے اور سان کئو بوڑھوں کو"۔ اس لیے کہ نوجوانوں کو ڈاکو بن جانے کی ترغیب ہوگی اور بوڑھے ایسی جوشیلی حرکتوں پر آمادہ ہوجائیں گے جو ان کی عمر کے لحاظ سے مناسب نہیں۔ کیونکہ جہاں شوئی ھوچوان چینی زندگی کا مرقع ہے وہاں

سان کئو جنگ اور سیاست کاریوں کی داستان۔ اور ھنگ لئو منگ (سرخ کمرے کا خواب) گھریلو زندگی اور انسانی محبت کا بیان ہے شوئی ھو کی طرح سان کئو (یا تین سلطنتوں کی تاریخ) بھی صناعی کے لحاظ سے عجیب و غریب ہے اور اس کے مصنف کے متعلق بھی شبہہ ہے۔ قصے کی ابتدا ھان خاندان میں ہوئی اور اختتام ستانوے برس بعد چھ خاندانوں کے عہد میں۔ اس ناول کی آخری شکل کی تکمیل لوکوان چنگ نے کی ہے خیال کیا جاتا ہے کہ وہ شہ نئی آن کا شاگرد تھا اور غالباً اس نے اپنے استاد کے ساتھ شوئی چوان کے لکھنے میں بھی حصہ لیا تھا لیکن یہ مسئلہ متنازعہ فیہ ہے۔

'لوکوان چنگ' یو آن خاندان کے آخر زمانے میں پیدا ہوا تھا اور اس نے منگ خاندان کا زمانہ بھی دیکھا۔ اس نے بہت سے ڈرامے بھی لکھے لیکن اس کے ناول زیادہ مقبول ہوئے اور ان میں سان کئو بلاشبہہ بہترین ہے۔ کانگ ھسی کے زمانے میں اس ناول کا جو نسخہ ماؤ چن کان نے نظر ثانی کر کے تیار کیا تھا وہی آج کل چین میں عام طور سے رائج ہے۔ ماؤ چن کان نے صرف نظر ثانی ہی نہیں کی بلکہ کتاب پر تنقید بھی کی، ترمیم، حذف و اضافہ بھی کیا۔ مثلاً ایک کردار کی بیوی، سُوان فورن کی کہانی بڑھائی۔ اس نے اسلوب بھی بدلا۔ اگر آج کل شوئی ھوچوان کی اس لحاظ سے اہمیت ہے کہ یہ عوام کی جنگ آزادی کا ناول ہے تو سان کئو کی یہ اہمیت ہے کہ اس میں جنگ کے علوم و فنون کے چینی تخیل کی تفصیل ہے، اور بلاشبہہ یہ تخیل مغرب کے فن جنگ کے تخیل سے بہت مختلف ہے۔ چین کے گوریلا، جنھوں نے جاپان کا قدم اپنی سرزمین میں جمنے نہ دیا اور دشمن کے چھکے چھڑا دیے۔ کھیتوں میں کام کرنے والے ان پڑھ کسان ہیں جنھیں سان کئو لفظ بہ لفظ زبانی یاد ہے۔ انھوں نے

خود نہیں پڑھا لیکن جاڑے کے بیکار دنوں اور گرمی کی لمبی راتوں میں قصہ گو "تین سلطنتوں" سان کئو کے سورما سپاہیوں کی جنگ کی داستان سنی ہے اور یہ گوریلے انھیں قدیم اصول جنگ پر بھروسا رکھتے ہیں۔ سپاہی کو کیسا ہونا چاہیے، کیسے آگے بڑھنا اور پیچھے ہٹنا چاہیے، دشمن زور سے آگے بڑھ رہا ہو تو کیسے آہستہ آہستہ اسے جگہ دینی چاہیے اور جب اس کی چال دھیمی پڑنے لگے تو کیسے اس پر حملہ کر دینا چاہیے ——— یہ سب کچھ انھوں نے اس ناول سے سیکھا جسے چین کا بچہ بچہ جانتا ہے۔

ھنگ لئو منگ (سرخ کمرے کا خواب) ان تینوں ناولوں میں سب سے آخری اور جدید ترین ہے۔ مانچو خاندان کے عہد حکومت میں ایک سرکاری عہدہ دار تساؤ ھسویہ چنگ نے خود نوشت سوانحعمری کے طور پر اسے لکھا تھا۔ لیکن وہ اسے مکمل نہ کر سکا اور آخری چالیس باب کسی دوسرے شخص نے جس کا نام غالباً کاؤ اُد تھا، اضافہ کیا۔ پچھلے زمانے میں یوآن مئی نے اور آج کل ھو شِہ نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ تساؤ ھسویہ چنگ خود اپنی آپ بیتی لکھ رہا تھا۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو اس کتاب کا پہلا نام شِہ تئو چی تھا۔ یہ تقریباً ۱۷۶۵ء میں پیکنگ سے شایع ہوئی اور پانچ ہی چھ سال میں تمام مشہور ہو گئی۔

قصہ موضوع کے لحاظ سے بہت سادہ ہے لیکن مفہوم، مطالعہ کردار اور انسانی محسوسات کے بیان کے لحاظ سے پیچیدہ۔ یہ تقریباً گھن لگے ہوئے روگی انسانیت کا مطالعہ ہے۔ قصہ ایک امیر بڑے گھرانے کا ہے جس پر شاہی عنایت تھی اور اس لیے یقیناً اس کی ایک خاتون بادشاہ کی منظور نظر۔ لیکن قصہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب عروج کے دن ختم ہو چکے ہیں۔ خاندان پر

تباہی آچکی ہے۔ دولت ختم ہو رہی ہے اور خاندان کا آخری چشم و چراغ چیا پاؤ یو اپنے گھر ہی کے زوال پذیر اور مایل بہ انحطاط اثرات کے ماتحت بگڑ رہا ہے۔ اگرچہ اس کے پیدایشی ذہین و فطین ہونے کو اس کنایے سے ظاہر کیا گیا ہے کہ "اس کے منہ میں زمرد کا ٹکڑا ہے۔ دیباچے میں لکھا ہے:" ایک مرتبہ جنت کی چھت ٹوٹ گئی اور مرمت ہوئی تو ایک ٹکڑا بچ رہا اور یہی ٹکڑا چیا پاؤ یو کے منہ کا مشہور مرد ہے۔" مافوق الفطرت اور خرق عادت واقعات میں چینیوں کی دلچسپی ابھی تک باقی ہے۔ آج بھی یہ ان کی زندگی کا جز ہے۔

یہ ناول لوگوں میں بے حد مقبول ہوا۔ خاص کر اس لیے کہ اس میں ان کی اپنی گھریلو زندگی کے واقعات نظر آتے تھے۔ گھر میں عورتوں کا اقتدار مطلق، نانی اور ماں کے ساتھ خانہ دار لونڈیوں تک کا جو زیادہ نوجوان اور حسین ہوتی تھیں اور اکثر گھر کے بیٹوں کے کھلونے بن جاتیں، انھیں تباہ کرتیں اور خود بھی تباہ ہو جاتیں۔ چینی گھروں میں عورتوں کا راج تھا اور چونکہ یہ جاہل اور گھر کی چار دیواری میں بند ہوتی تھیں اس لیے ان کی حکومت نہایت سخت ہوتی وہ بچوں کی طرح مردوں کی دیکھ بھال کرتیں، انھیں بے موقع بے محل محنت اور مشقت سے باز رکھتیں۔ چیا پاؤ بھی اسی لاڈ پیار کا بگاڑا ہوا نوجوان تھا اور ہم اس کا المناک انجام ہنگ لئو منگ میں پڑھتے ہیں۔

جب علمار نے دیکھا کہ لوگوں میں اس ناول کی مقبولیت بڑھتی جا رہی ہے اور بادشاہ تک اسے پسند کرنے لگے ہیں تو انھوں نے مثالیت اور مجاز و کنایہ کے پردے میں اس کی تاویل کرنے کی کوشش کی۔ کوئی تعجب نہیں اگر وہ اسے چوری چھپے پڑھتے ہوں۔ چین میں علمار کے متعلق اکثر ایسے لطیفے بھی ہیں کہ وہ چھپ کے تو ناول پڑھتے ہیں لیکن علانیہ اس کے وجود تک سے

انکار کرتے ہیں۔

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند

بہرکیف، اہل علم نے متعدد رسالے یہ ثابت کرنے کے لیے لکھے کہ ھنگ لئو منگ ناول نہیں ہے بلکہ ایک سیاسی مجازیہ قصہ ہے اس میں مانچو خاندان کی بدیسی حکومت کے زمانے میں چین کا تنزل دکھایا گیا ہے۔ کتاب کے نام میں "سرخ" کا لفظ مانچو کے لیے ہے۔ کمسن حسینہ جو باؤیو کی منگیتر تھی اور جو مرجاتی ہے اس سے مراد چین ہے اور اس کی کامیاب رقیب باؤتسی سے جو زمرد حاصل کرلیتی ہے، مراد بدیسی حاکم ہیں۔ وعلی ہذالقیاس۔ خود "چیا" کے معنی جھوٹ کے ہیں۔" لیکن یہ سب دور از کار تاویلیں تھیں۔ ایک با اقتدار مغرور خاندان کے تنزل کی حالت حقیقت پسندی اور رومانیت کے امتزاج کے ساتھ مخصوص چینی انداز میں پیش کی گئی ہے اور بس۔ یہ کتاب محض ناول کی حیثیت سے لکھی گئی تھی اور اسی لحاظ سے اس کی اہمیت ہے۔ اس کے اوراق پر چین کی اس زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں جس میں ہزاروں مرد اور عورتیں نسلہانسل سے ایک ہی چھت کے نیچے رہتی آئی ہیں۔

ان تینوں ناولوں کو خصوصیت سے بیان کرنے میں محض چینیوں کی تقلید کی گئی ہے۔ ان کے سامنے جب "ناول" کا نام لیا جائے تو وہ کہتے ہیں شوئی ھو، سان کئو، ھنگ لئو منگ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ چین میں سینکڑوں اور ناول نہیں ہیں۔ مثلاً ھسو یوچی (سفر مغرب کی داستان) کو لیجیے۔ یہ بھی تقریباً اتنا ہی مقبول ہے پھر فنگ شن چوان ہے جس میں ایک سپاہی کی کہانی ہے جسے تقریباً دیوتا کی حیثیت مل گئی ہے مصنف کا

نام معلوم نہیں لیکن یہ غالباً منگ کے زمانے کا تھا۔ پھر رولنگ وائی شی ہی جس میں تسنگ خاندان کی برائیوں پر طنز ہی خصوصاً علما پر۔ ان کا مذاق اڑایا گیا ہی جو عمل سے بے بہرہ ہیں اور جنھیں روزمرہ کی زندگی کے واقعات کا کچھ پتا نہیں جو رسم و رواج کے اس قدر پابند ہیں کہ کوئی نئی چیز پیش نہیں کرسکتے۔ اگرچہ کتاب بہت طویل ہی لیکن کوئی مرکزی کردار نہیں مختلف کردار محض واقعات کی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔ عہد حاضر کے مشہور چینی مصنف مرحوم لوھسون نے اس کے بارے میں کہا تھا:

"ایسا معلوم ہوتا ہی کہ ساٹن اور ریشم کے خوشنما رنگین ٹکڑے ایک دوسرے سے سی دیے گئے ہیں۔"

پھر یی شئو پی ین ہی۔ یہ کیانگ ین کے ایک مشہور شخص شیا کی تصنیف ہی جسے سرکاری ترقی میں مایوسی اور ناکامی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ ایک عجیب و غریب کتاب چنگ ھواین ہی۔ یہ عورتوں کی حیرت خیز کہانی ہی ان کی ملکہ عورت تھی اور اہل علم بھی عورتیں ہی تھیں۔ یہ کتاب عورتوں کو عقل و صلاحیت میں مردوں کے برابر دکھلانے کے لیے لکھی گئی تھی لیکن اس کا اختتام اس مقصد کے خلاف ہی۔ عورتوں اور مردوں میں جنگ ہوتی ہی۔ مرد فتحیاب ہوتے ہیں۔ ملکہ تخت سے ہٹا دی جاتی ہی اور عنان حکومت مردوں کے بادشاہ کے ہاتھ میں آجاتی ہی۔

بہر حال چینی عوام کے لاتعداد پسندیدہ ناولوں کا ذکر کرنا ممکن نہیں۔ اور خود چینی بھی یہی چاہتے ہیں کہ صرف ان کے تین بڑے ناولوں کا ہی تذکرہ کرنا کافی ہی۔ وہ انھیں کو اپنی دولت سمجھتے ہیں۔ ان تینوں ناولوں میں وہ زندگی ہی جو انھوں نے بسر کی ہی اور آج بھی بسر کر رہے ہیں۔ ان میں وہ گیت

ہیں جو وہ گاتے ہیں، وہ باتیں ہیں جن پر وہ ہنستے ہیں اور جو انھیں پسند ہیں۔
ان ناولوں میں ان کی نسلہا نسل کی زندگی سموئی ہوئی ہے اور اس زندگی کو تازہ کرنے کے لیے وہ بار بار انھیں ناولوں کی طرف رجوع ہوتے ہیں، ان میں سے نئے گیت، نئے ناٹک اور نئے ناول نکالتے ہیں۔ ان میں سے نکالے ہوئے بعض قصے تو بہت مشہور ہو چکے ہیں۔ مثلاً شہوانی محبت کی رومانی داستان جس کی بنیاد شوئی جوان کے محض ایک واقعے پر ہے۔

لیکن آج ان ناولوں کی فہرست کا تیار کر دینا کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ایک عظیم الشان جمہوری قوم کے ذہن ودماغ کی یہ پر عظمت اور شاندار ترقی اپنے زمانے اور اپنے ملک میں ادب کی حیثیت سے نہیں مانی گئی۔ چینی زبان میں کہانیوں کو ھسیائ شو کہتے ہیں جس کے معنی ہیں "چھوٹی بات" اور ناول بھی صرف تسانگ پئن ھسیائ شو یعنی یہی "چھوٹی بات جس میں ذرا طوالت" تھی گویا اور بھی غیر اہم اور بیکار! تو گویا چینیوں نے اصول ادب وانشا سے الگ اپنا ادب پیدا کیا اور آج یہی ادب زندہ ہے اور اسی پر آیندہ کے ادب کی بنیاد پڑ رہی ہے۔ اس رسمی ادب کا جسے آرٹ اور صناعی کہا گیا تھا، کہیں پتہ نہیں۔

ان ناولوں کے پلاٹ اکثر نامکمل اور ادھورے ہیں۔ محبت کی داستانوں کا کوئی انجام نہیں ہوتا۔ اکثر ہیروئنیں حسین نہیں اور نہ ہیرو جانباز اور دلیر قصے کا ہمیشہ کوئی انجام بھی نہیں ہوتا۔ کہانی چلتی چلتی بس یک بیک رک جاتی ہے لیکن زندگی کا بھی تو یہی حال ہے۔ اس وقت کہ کچھ خیال بھی نہیں ہوتا یک بیک موت کی تیز دھار داستان ہستی کو درمیان سے کاٹ کے رکھ دیتی ہے۔

یہ ہیں چینی ناول کی روایات جن کے سایے میں پرل بک کی ادبی

زندگی کی ابتدا اور پرورش ہوئی چینی ناول نگار کی طرح وہ ادب وانشا کے اصول اور قواعد وضوابط کو دیکھتی ضرور ہیں لیکن اس طرح جیسے کوئی پتھر کے نہایت عمدہ ترشے ہوئے بے جان مجسمے کو دیکھے اور اس کی تعریف کرے۔ لیکن اس سرد مجسمے کو جیتے جاگتے انسانوں سے کیا نسبت؟ انسان ہمیشہ حسن اور صناعی کے مکمل نمونے نہیں ہوتے۔ اکثر بدصورت ہوتے ہیں انسانی اعتبار سے بھی ناقص اور نامکمل لیکن ان میں زندگی ہوتی ہے! اور چینی ناول نگار کے لیے اصل چیز زندگی ہی ہے۔ اس کا مقصد خالص ادب پیش کرنا نہیں ہوتا۔ اس کے نقاد عام لوگ ہوتے ہیں اور وہ انھیں کے لیے لکھتا ہے وہ کسانوں سے ان کی کھیتی باڑی کی باتیں کرتا ہے۔ بوڑھوں کو امن وسکون کا پیام دیتا ہے، بوڑھیوں سے ان کے بیٹے بیٹیوں کا قصہ چھیڑتا ہے اور نوجوانوں کو انھیں کی باتیں سناتا ہے۔ اور اگر یہ لوگ اس کی باتیں دل چسپی سے سنتے ہیں تو یہی اس کی کامیابی ہے!

تمنائی

باب - ۱

آج وانگ لُنگ کے بیاہ کا دن ہے۔ آنکھ کھلنے پر مچھّر دانی کے دھندلکے میں پہلے تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ آج صبح میں یہ نرالا پن کیوں ہے۔ مکان میں سنّاٹا تھا، بس بوڑھے باپ کی ٹھوں ٹھوں کا سلسلہ جاری تھا، جس کا کمرا اس کے اپنے کمرے کے مقابل تھا۔ بڑے میاں کی کھانسی اس کے لیے بانگ فجر تھی۔ وانگ لُنگ بستر پر پڑے پڑے اسے سنا کرتا۔ تاوقتیکہ یہ آواز قریب تر نہ آجاتی اور ابّا کے کمرے کا دروازہ اپنی چولوں پر چرچرانے نہ لگتا۔

لیکن آج اس نے آلکسی نہ کی اور لپک کر پردہ کھینچ دیا۔ بھور کے گلابی پن میں ابھی سیاہی کا پہلو باقی تھا۔ اور اس چوکونے سوراخ سے جو کھڑکی کا کام دیتا تھا۔ ایک لبلبا کاغذ اُڑ اُڑ کر تمتمائے ہوئے آسمان کی جھلک دکھا رہا تھا۔ پاس جاکر اس نے وہ کاغذ پھاڑ دیا اور زیرلب کہا: "بسنت میں اس کی کیا ضرورت"۔

اسے بآواز یہ کہنے کی جرأت نہ ہوئی کہ آج وہ اپنے گھر کو لپا پُتا دیکھنا چاہتا ہے۔ بمشکل اس کا ہاتھ سوراخ کے باہر جا سکا۔ تاکہ ہوا کو محسوس کر سکے۔ ہلکی ہلکی پُروا چل رہی تھی ـــــ برسات میں بھیگی ہوئی، گنگناتی اور گاتی ہوئی۔ یہ تو شگونِ نیک تھا۔ فصل خشک لب تھی۔ اگر ہوا نے رُخ نہ بدلا تو آج نہیں تو تیسرے

چوتھے بارش ہوگی ہی۔ مبارک ہو۔ کل کی بات ہی کہ وہ ابّا سے کہہ رہا تھا کہ اگر یہ چلچلاتی ہوئی دھوپ یوں ہی رہی تو گیہوں کی بالیاں مرجھا کر رہ جائیں گی۔ لیکن قدرت نے برکت کے لیے یہی دن انتخاب کیا تھا۔ مٹّی سونا اُگل دے گی۔

نیلا پایجامہ چڑھاتے اور چھاتی پر نیلا فیتہ لپیٹتے ہوئے وہ بیچلے کمرے کی طرف چھپٹا۔ جب تک غسل کا پانی گرم نہ ہوگیا، اس نے اوپری جسم کو ننگا رہنے دیا۔ پھر وہ سایبان کی طرف گیا جو مکان پر جھکا ہوا تھا اور باورچی خانے کا کام دیتا تھا۔ اس کے جھروکے سے سر نکال کر ایک بیل ڈکارنے لگا۔ مکان اور سایبان مٹّی کے اُن لوندوں سے بنائے گئے تھے جو اس کے کھیت سے لائے گئے تھے اور پرال میں سانے گئے تھے اس کے بچپن میں اس کے دادا نے یہ تندور بنایا تھا۔ جو برسوں کے استعمال کی وجہ سے اب کالا پڑگیا تھا۔ تندور پر لوہے کی ایک گول اور گہری دیگ رکھی ہوئی تھی۔

نزدیک رکھے ہوئے گھڑے سے پانی نکال کر وہ دیگ میں بھرنے لگا۔ پانی انڈیلتے وقت پہلے تو وہ جھجکا کیونکہ یہاں پانی کا کال تھا۔ پھر سارا گھڑا دیگ میں اوندھا کر دیا۔ آج وہ جی بھر کر نہائے گا۔ جب سے اس نے ماں کا دودھ چھوڑا ہی آج تک کسی نے اس کے بدن کو نہ دیکھا تھا۔ لیکن آج کسی کی نظر اس پر پڑے گی، اس کی صفائی ضروری ہی۔

تندور کے پیچھے جاکر اس نے پرال اور ایندھن بٹورا اور بڑے جتن سے اسے تندور کے منہ پر بچھایا۔ چقماق سے آگ نکال کر

چند تنکے جلائے اور فوراً لپٹ بھڑک اٹھی۔

آخری مرتبہ وہ اپنے ہاتھ سے تندور جلا رہا تھا۔ ماں کے انتقال کے بعد چھ سال سے وہ یہ کرتا آیا تھا۔ آگ جلاکر وہ پانی گرم کرتا اور اسے تسلے میں بھر کر اپنے باپ کے کمرے میں لے جاتا۔ باپ پلنگ پر بیٹھے ہوئے کھانسا کرتا اور فرش پر جوتے ٹٹولتا ہوتا۔ متواتر چھ سال سے ہر صبح یہ بڈھا گرم پانی طلب کرتا تاکہ غرارہ کر کے کھانسی کو کچھ سکون دے۔ اب باپ بیٹے دونوں کے آرام کے دن آگئے تھے۔ گھر میں ایک عورت آنے والی تھی۔ گرمی ہو یا سردی، وانگ لنگ آگ جلانے کے لیے ہرگز نہ اٹھے گا۔ پلنگ پر لیٹے لیٹے وہ بھی گرم پانی کا تسلا منگا سکے گا اور اگر فصل اچھی ہوئی تو چائے کا دور چلا کرے گا۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔

اور جب یہ عورت تھک جائے گی تو اس کی اولاد یہ خدمت انجام دے گی ——— وہ اولاد جو وانگ لنگ اس کی کوکھ سے پیدا کرے گا۔ وانگ لنگ ٹھٹک کر ان بچوں کے تصور میں مگن ہوگیا جو تینوں کمروں میں کلول کرتے پھریں گے۔ اسے ہمیشہ سے یہ تین کمرے خالی خالی سے معلوم ہوتے تھے، ماں کے مرنے کے بعد گھر سنسان سا لگتا تھا۔ جن رشتے داروں کے گھر ریل پیل رہتی تھی، ان کے حملے سے بچنا ہوتا تھا ——— خصوصاً اس کا چچا جو بچوں کی ایک جھول لیے ہوئے یوں باتیں بنایا کرتا: "دو مردوں کو اتنے کمروں کی ضرورت ہی کیا؟۔ کیا باپ بیٹے ساتھ نہیں سوسکتے؟۔ جوان کے جسم کی گرمی بڑھاپے کی کھانسی کی اچوک دوا ہے۔"

مگر بڑے میاں کا جواب ہوتا: "میرا پلنگ میرے پوتے کے کام آئے گا۔ صرف وہی میری ہڈیوں کو گرما سکتا ہے۔"

اب پوتوں کا ورود ہونے والا تھا ——— یکے بعد دیگرے!۔ کونے کھدروں میں۔ بچھلے کمرے میں چارپائیوں کا تانتا لگ جائے گا۔ وانگ لنگ اس خیال میں ایسا گم سم ہوا کہ دیگ میں پانی گنگناپڑنے لگا اور تندور کی آنچ دھیمی ہوگئی۔ اتنے میں دروازے پر بوڑھے کا سایہ نظر آیا جو اپنے بے بند لباس کو ہاتھ سے تھامے ہوئے تھا۔ تھوکتے کھکارتے ہوئے وہ بولا: "میرے پھیپھڑے برف ہوئے جارہے ہیں۔ اب تک پانی گرم کیوں نہیں کیا گیا؟"

وانگ لنگ اپنی خود فراموشی پر سخت نادم ہوا۔ تندور کی اوٹ سے جواب دیا: "لکڑیاں بھیگ گئی ہیں۔ ہوا کی نمی ———"

بڑھا جان بوجھ کر کھانستا گیا اور تب تک چپ نہ ہوا جب تک پانی گرم نہ ہوگیا۔ وانگ لنگ نے پیالہ بھرا اور تندور پر رکھے ہوئے مرتبان سے چائے کی آٹھ دس سوکھی ہوئی پتیاں نکال کر اس میں گھول دیں۔ بوڑھے کی آنکھیں ٹنکی کی ٹنکی رہ گئیں اور وہ بڑبڑانے لگا: "تو کس قدر فضول خرچ ہے! چائے اور چاندی میں کیا فرق ہے؟"

وانگ لنگ نے ہنس کر کہا: "آج کے دن سب روا ہے۔ کھاؤ اور اللہ اللہ کرو۔"

بوڑھے نے گرہ دار سوکھی انگلیوں سے پیالہ پکڑا اور برابر بڑبڑاتا رہا۔ وہ دیکھتا رہا کہ پانی میں پتی کے بل کس طرح کھلتے ہیں۔ اور اس بیش قیمت مشروب کو ہونٹوں تک لانے کا حیاؤ نہ کرسکا۔

وانگ لنگ نے یاددہانی کی: "چائے ٹھنڈی ہوجائے گی۔"
بڑے میاں نے گھبرا کر کہا: "ہاں، ہاں"۔ اور وہ گرم گرم چائے غٹاغٹ گلے کے نیچے اتارنے لگا اور ایسا حیوانی اطمینان محسوس کرنے لگا جو بچے کو دودھ پیتے وقت میسر ہوتا ہے۔ لیکن وہ ایسا بھی بدحواس نہ ہوا تھا کہ وانگ لنگ کو دیگ سے کونڈے میں پانی انڈیلتے نہ دیکھ لے۔ سر اٹھا کر وہ اپنے بیٹے کو گھورنے لگا اور بول اٹھا:
"اتنے پانی سے تو ایک کھیت کی سنچائی ہوسکتی ہے!"
وانگ لنگ نے ایک ایک بوند پانی انڈیل لیا اور جواب میں میں کچھ نہ کہا۔
بڈھے نے زور سے ڈانٹ بتائی: "تجھے یہ کیا سوجھی ہے؟"
وانگ لنگ نے آہستہ سے کہا: "نوروز کا دن اور آج کا دن، قسم لے لیجیے جو اس بیچ میں میں نے پنڈا دھویا ہو۔"
اسے اپنے باپ سے یہ اقرار کرتے ہوئے شرم آئی کہ وہ ایک عورت کو دکھلانے کے لیے اپنا جسم پاک کر رہا ہے۔ وہ کونڈا لیے ہوئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کواڑ ایک سڑی ہوئی چوکھٹ پر اٹکا ہوا تھا اور ٹھیک طرح سے بند نہ ہوتا تھا۔ بوڑھا گرتے پڑتے بیچلے کمرے میں گیا اور درار سے جھانک کر چلایا۔
"اگر اس عورت کے استقبال میں یہ ٹھسّے برتے گئے —— صبح صبح چائے اور غسل —— تو اس گھر کی خیر نہیں۔"
وانگ لنگ نے پکار کر کہا: "اجی یہ تو ایک دن کی بات ہے —— اور میں پانی کھیت میں ڈال آؤں گا، وہ ضائع نہ ہونے پائے گا۔"

یہ سُن کر بڑے میاں چُپ پڑ گئے اور وانگ لنگ کپڑے اتارنے لگا۔ ایک تولیے کو گرم پانی میں بھگو کر وہ اپنے چھریرے جسم کو زور زور سے ملنے لگا۔ وہ سمجھا تھا کہ ہوا گرم ہے مگر بدن کے بھیگتے ہی وہ سردی محسوس کرنے لگا۔ وہ بار بار تولیہ بھگو کر جلدی جلدی ادھر اُدھر ملتا گیا۔ یہاں تک کہ سارے جسم سے بھاپ نکلنے لگی۔ پھر ایک صندوق سے، جو کبھی اس کی ماں کا تھا، اس نے دُھلا دُھلایا نیلے رنگ کا سوتی لباس نکالا۔ کیا ہوا اگر صرف آج اونی کپڑوں کے بغیر اس نے تھوڑی سی سردی کھالی، آج وہ اپنے پاک وصاف جسم کے قریب انھیں نہ آنے دے گا۔ ان کا غلاف میلا اور پھٹا ہوا تھا اور درزوں میں سے سڑی سڑای بھرت دکھائی پڑنے لگی تھی۔ اسے ہرگز یہ گوارا نہ تھا کہ وہ عورت پہلی مرتبہ اُسے ایسی بدحالی میں دیکھے۔ بعد ازاں اُسے دُھلائی اور سلائی کرنی بھی ہوگی مگر آج نہیں۔ نیلے سوتی اچکن اور پائجامے پر اس نے ایک سوتی لبادہ اوڑھا۔ اس کے پاس بس یہی ایک لبادہ تھا جسے وہ چھٹے چھ ماہے صرف کسی تقریب میں زیب تن کرتا تھا۔ پھر اپنی لمبی لمبی زلفوں کو جلدی سے کھول کر اس نے ایک ٹوٹی ہوئی میز کی دراز سے لکڑی کا کنگھا نکالا اور بال سنوارنے لگا۔

اس کے باپ نے دوبارہ دراز سے منہ نکال کر آواز دی:

"کیا آج مجھے فاقہ کرنا ہوگا؟ اس عمر میں سویرے غذا نہ ملنے سے ہڈیاں پانی ہو جاتی ہیں"۔

"ابھی آیا" یہ کہتے ہوئے وانگ لنگ نے جلدی سے چوٹی

گوندھی اور اس میں سیاہ ریشم کا فیتہ لپیٹ لیا۔
لبادہ الگ رکھ کر اور لمبی چوٹی کو جوڑے میں باندھ کر وہ پانی کا کونڈا لیے ہوئے باہر چلا گیا۔ اسے ٹونا سُننے کی یاد ہی نہ رہی تھی۔ پانی میں باجرا اُبال کر وہ ابّا کو دے آئے گا۔ خود وہ کچھ نہ کھائے گا۔ کونڈا اس نے دروازے کے باہر زمین پر الٹ دیا، مگر اسی وقت اسے یاد آیا کہ دیگ میں گرم پانی کی بوند بھی نہیں اور دوبارہ آگ جلانی ہوگی۔ اپنے باپ پر اسے سخت غصّہ آیا۔ تندور کے دہانے کے پاس وہ بڑبڑانے لگا: "ان حضرت کو دانے پانی کے سوا کسی چیز کی فکر نہیں"۔ تاہم وہ دم سادھے رہا۔ آج آخری بار وہ کھانا پکا رہا تھا۔ پڑوس کے کنویں سے ڈول بھر پانی کھینچ کر اس نے آناً فاناً اسے گرم کیا اور باجرا اُبال کر بوڑھے کو دے آیا۔
"ابّا، رات کو چاول پکیں گے۔ ابھی کے لیے باجرا ہے"۔
پچھلے کمرے کی میز پر دلیے کو چمچیوں سے چلاتے ہوئے بوڑھے نے جواب دیا:
"ٹوکرے میں مٹھی بھر چاول ہوں تو ہوں"۔
"بلا سے بسنت کے تیوہار کی سی کھلائی روز نہیں ہو سکتی" لیکن بوڑھے نے وانگ لنگ کی بات نہ سنی، وہ زور شور سے دلیا سڑپ رہا تھا۔
اپنے کمرے میں جا کر وانگ لنگ نے از سرِ نو لبادہ اوڑھا اور جوڑا کھول کر اپنے منڈے ہوئے سر اور گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ حجامت ہو ہی جائے؟ ابھی دھوپ بھی نہ نکلی تھی۔ اس جگہ پہنچنے سے پہلے جہاں وہ عورت اس کا انتظار کر رہی ہوگی، وہ حجام ٹولے سے

گزرے گا۔ اور دام ہوئے تو ڈاڑھی گھٹا ہی لے گا۔

کمربند سے ایک چھوٹا سا بٹوا نکال کر وہ پیسے گننے لگا۔ چھ ریز اور دو مٹھی بھر پیسے تھے۔ باپ کو اس نے یہ نہ بتایا تھا کہ گھر میں رات کو دوستوں کی دعوت ہے۔ چچا اور چچا زاد بھائی کو ابا کی خاطر اور پڑوس کے تین کسانوں کو مدعو کیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ لوٹتے ہوئے شہر سے سور کا گوشت، نمکین مچھلی اور جوڑ خرید لائے گا۔ ممکن ہوا تو دکنی بانس کی پھلیاں اور تھوڑا سا گائے کا گوشت بھی لائے گا۔ تاکہ وہ اپنی کھیت کی گوبھی کے ساتھ پکایا جائے۔ بشرطیکہ سیم کے تیل اور سویا کی چٹنی خریدنے کے بعد دام بچ گئے۔ جو بھی ہو، اس نے سر گھٹانے کا فیصلہ کر لیا۔

بڑے میاں سے کچھ کہے بغیر وہ تڑکے ہی گھر سے نکل آیا۔ شفق کی سرخی کے باوجود سورج افق کے بادلوں سے منہ نکال کر گیہوں اور باجرے کے نوخیز پودوں کی اوس پر جگمگا رہا تھا۔ وانگ لنگ آخر کسان ہی ٹھہرا، رک کر ان کی بالیوں کو بغور دیکھنے لگا۔ ہوا کو سونگھ کر اس نے تفکر سے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ کالے کالے بادل اور بوجھل ہوا برسات کا پتا دے رہے تھے۔ وہ عود بتی خرید کر دھرتی ماتا کے مندر میں چلا آئے گا۔ آج یہ اس کا فرض منصبی ہے۔

اس کی ڈگر کھیتوں میں ہو کر جاتی تھی۔ تھوڑی دور پر شہر پناہ نظر آرہی تھی۔ اس کے اندر 'ہوانگ' گھرانے کی وہ حویلی ہے جس میں

وہ عورت بچپن سے باندی گری کرتی آئی ہے۔ کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ "کسی بڑے گھر کی باندی سے شادی کرنے کی بہ نسبت تاعمر کنوارا رہنا بہتر ہے"۔ مگر جب اس نے اپنے باپ سے سوال کیا کہ "کیا میں ساری زندگی اکیلا رہوں؟" تو اس گرگ باراں دیدہ نے جواب دیا: "اس کل جگ میں شادی مہنگی پڑتی ہے کیونکہ ہر عورت سونے کے زیور اور ریشم کے جوڑوں کی گھات میں ہے۔ اس لیے غریبوں کو صرف باندیوں سے بیاہ کرنا چاہیے۔

یہ کہہ کر یہ سیانا ہوانگ کی حویلی میں پہنچا اور پوچھا کہ کیا کوئی فاضل باندی ہے۔

لوٹ کر اس نے آکے کہا کہ "نوجوان یا حسین باندی ملنا محال ہے۔"

وانگ لنگ کو صدمہ ہوا کہ وہ حسین نہ ہوگی۔ کاش اسے ایسی خوبصورت عورت ملتی کہ دیکھنے والے عش عش کر اٹھتے۔ اس کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہی بڈھا چیخ پڑا۔

"اچھی صورت سے ہمیں کیا لینا ہے! ہمیں ایسی عورت کی ضرورت ہے جو گھر کی دیکھ بھال کرے کھیت میں کام کرے اور بچے پیدا کرکے دے۔ کیا کوئی حسین عورت یہ سب کر سکتی ہے؟ وہ تو ہمیشہ کنگھی چوٹی اور گوٹا کناری کی فکر میں رہے گی۔ نہیں، اس گھر میں کوئی حسینہ قدم رکھنے نہ پائے گی۔ ہم کسان ہیں۔ ہاں اور کسی بڑے گھر میں کوئی خوب صورت باندی کنواری رہ سکتی ہے؟ امیرزادے اسے اچھوتی چھوڑ دیں گے؟۔ گوری کالی کلوٹی باسی موہنی مورت سے ہزار گنا اچھی!۔ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ ایک خوب صورت عورت تیرے

روکھے ہاتھوں کو کسی رئیس زادے کی نازک کلائی پر اور تیرے دھوپ میں جھلسے ہوئے چہرے کو اپنے پُرانے یاروں کی سنہری رنگت پر ترجیح دے گی؟"

وانگ لنگ اپنے باپ کی دانائی کا قایل ہو گیا۔ تاہم، کسی فیصلے کو پہنچنے سے پہلے اسے اپنے نفس کو کچلنا پڑا اور پھر اس نے بگڑ کر کہا: اور سب کچھ سہی، لیکن کسی چیچک رو یا ہونٹ کٹی عورت کا میں ہرگز متحمل نہیں ہو سکتا۔

بوڑھے نے جواب دیا: "دیکھنا ہے کہ تیرے حصّے کیا پڑتا ہے"۔

خیر سے یہ عورت نہ چیچک روتھی نہ ہونٹ کٹی۔ اسے اس کے سوا اور کچھ معلوم نہ تھا۔ دونوں باپ بیٹے سونے کی ملمّع کی ہوئی چاندی کی دو انگوٹھیاں اور چاندی کے کرن پھول خرید لائے اور باپ منگنی کی نیگ کے طور پر انھیں باندی کے آقا کو دے آیا۔ وانگ لنگ اس عورت کے متعلق بس اتنا جانتا تھا کہ آج وہ اس کے گھر آنے والی ہے۔

شہر پناہ کے ٹھنڈے سایہ میں وہ چلا جا رہا تھا۔ اس کے باہر بہشتی مشکوں سے چھڑکاؤ کرتے دن بھر آتے جاتے رہتے تھے۔ مٹّی اور اینٹ کی موٹی موٹی دیواروں کے نیچے گرمیوں میں بھی سیلن اور خنکی رہتی تھی اور خربوزے والے اپنے پھلوں کو تر رکھنے کے لیے کاٹ کاٹ کر پتھر کی گچ پر بچھا دیتے تھے۔ ابھی خربوزوں کا موسم تو نہ تھا لیکن کچّے ہرے شفتالوؤں کے پٹارے دیوار سے چُنے ہوئے تھے اور ان کے بیوپاری آواز لگا رہے تھے:

"موسم کا پہلا آڑو ـــــ بہار کا پہلا شفتالو! جی بھر کر کھاؤ اور سردیوں کے پٹ کو زہر مار کرو!"

وانگ لنگ نے دل ہی دل میں سوچا کہ اگر اُسے آڑو پسند ہوئے تو لوٹتے وقت خریدوں گا۔ وہ اس کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ اس راہ سے وہ ایک عورت لیے ہوئے واپس لوٹے گا۔

شہر پناہ کے پھاٹک میں داخل ہو کر وہ داہنے طرف مڑا جدھر حجّام ٹولہ تھا۔ اتنے سویرے حجامت بنوانے کون آتا۔ بس چند کسان تھے جو رات کو اپنا مال شہر لے آئے تھے کہ صبح اسے بیچ کر گانوں لوٹ جائیں اور دن بھر کام کریں۔ اپنے گٹھروں پر سُکڑے اکڑے ہوئے انھوں نے رات کاٹ دی تھی اور اب یہ بورے خالی پڑے ہوئے تھے۔ وانگ لنگ ان سے کترا کر نکل گیا کیونکہ وہ ڈرا کہ کہیں کوئی پہچان والا ٹھٹھول نہ کرنے لگے۔ آج وہ اس سے بچنا چاہتا تھا۔ سڑک بھر میں قطار باندھے حجّام اپنی چھوٹی چھوٹی دکانوں کے آگے کھڑے تھے۔ وانگ لنگ سب سے پرے کی دوکان میں جاکر تپائی پر بیٹھ گیا اور نائی کو اشارہ کیا جو اپنے پڑوسی سے گپ لڑا رہا تھا۔ نائی لپکا اور جھٹ پٹ کیتلی کا گرم پانی پیتل کی کٹوری میں انڈیلتے ہوئے تاجرانہ انداز میں پوچھا: "سب کچھ صفاچٹ؟"

"سر اور ڈاڑھی"

"کان اور ناک کی صفائی؟"

اب وانگ لنگ نے رکتے رکتے پوچھا: "اُس کے لیے کیا دینا ہوگا؟"

نائی نے گرم پانی میں ایک کالا کپڑا نچوڑتے ہوئے جواب دیا:

"اجی کچھ نہیں ایک چونّی"

وانگ لنگ نے کہا: "دوانّی ملے گی"۔

مگر نائی بھی اپنے فن کا استاد تھا: "تو صرف ایک کان اور ایک نتھنے کی صفائی ہوگی۔ بولو داھنی طرف یا بائیں طرف؟" یہ کہتے ہوئے اُس نے پڑوس کے حجّام کو آنکھ ماری اور وہ کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ وانگ لنگ تاڑ گیا کہ کسی مسخرے سے پالا پڑا ہے، اور کسی نامعلوم سبب سے اپنی سبکی محسوس کر کے —— شہریوں کے آگے خواہ وہ نائی موچی ہی کیوں نہ ہو، ہمیشہ اس کی گھِگّی دبتی تھی —— وہ جلدی سے بولا:

"یہی سہی —— یہی سہی ——"

اب نائی نے دھلائی، ملائی اور منڈائی کا سلسلہ شروع کیا۔ اور کیونکہ وہ طبیعتاً فیض رساں واقع ہوا تھا، اس لیے رگ پٹھے کھولنے کے بہانے اس نے وانگ لنگ کی پیٹھ کو دل ڈالا۔ اس کے سر کے سامنے کے حصّے کو مونڈتے ہوئے وہ یوں نقد سرائی کرنے لگا: "سارا سر گھٹ جائے تو اس کسان کے چہرے پر رونق آجائے۔ اب چوٹیوں کا فیشن نہیں رہا"۔

اس کے بعد اس کا استرا وانگ لنگ کی کھوپڑی پر یوں حملہ آور ہوا کہ وہ بے اختیار چیخ پڑا: "ابا سے پوچھے بنا میں چوٹی نہیں کٹا سکتا!" یہ سن کر نائی ہنس پڑا اور پھرتی سے استرے کا رُخ موڑ دیا۔

جب یہ مرحلہ طے ہوگیا اور وہ نائی کے جھرّی دار گیلے ہاتھوں میں پیسے تھما چکا تو دم بھر کے لیے اس کا کلیجہ بیٹھنے لگا۔ اتنے پیسے!

لیکن سڑک پر آکر جب اس کی چندیا نسیم بہار سے دو چار ہوئی تو وہ اپنے آپ سے بولا: "بار بار یہ دن نہ آئے گا!"

اب بازار جاکر اس نے سیر بھر سور کا گوشت خریدا اور جب قصاب اسے کنول کے پتے میں لپیٹ چکا تو جھجکتے ہوئے پاؤ بھر گائے کا گوشت بھی لے لیا۔ سب کچھ لے دے کے وہ عود بتی کی دکان پر پہنچا اور دو بتیاں لیں۔ اس کے بعد وہ سہمتے ہوئے ہوانگ کی حویلی کی طرف چلا۔

پھاٹک کے سامنے پہنچتے ہی اس کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ میں اکیلا کیوں آیا؟ ابا، چچا یا کسی پڑوسی کو ہی ساتھ لے لیا ہوتا۔ اس سے پہلے اس نے کسی بڑے گھر میں قدم نہ رکھا تھا۔ ویسے کی رسد لادے ہوئے اندر جاکر وہ کس طرح کہے کہ "میں کسی عورت کی تلاش میں آیا ہوں!"

دیر تک وہ باہر کھڑا پھاٹک کو سراہتا رہا۔ کالے رنگ کے دو بڑے بڑے چوبی پٹ جن پر لوہے کی چادر چڑھی ہوئی تھی، اندر سے بند تھے۔ پتھر کے دو شیر دائیں بائیں پہرا دے رہے تھے۔ آس پاس کوئی اور نہ تھا۔ وانگ لنگ واپس لوٹ آیا۔ یہ اس کے بس کی بات نہیں۔

اسے چکر آنے لگا۔ پہلے وہ کھانے کے لیے کچھ خریدے گا۔ اسے کھانے تک کا ہوش نہ رہا تھا۔ ایک چھوٹے سے بھٹیارخانے میں جاکر وہ میز کے آگے بیٹھ گیا اور دو آنے نکال کر رکھ دی۔ ایک میلا کچیلا خدمت گار سیاہ ایپرن چڑھائے قریب آیا اور وانگ لنگ نے سوئیوں کے دو کٹورے لانے کا حکم دیا۔ بانس کی تیلیوں سے

وہ ندیدوں کی طرح سوئیاں منہ میں بھرنے لگا اور اس دوران میں خدمت گار تانبے کے سکّوں کو ہوا میں اچھالتا رہا۔ پھر اس نے لاپروائی سے پوچھا: "اور کچھ؟"

سر ہلا کر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس تنگ و تاریک کوٹھری میں کوئی جان پہچان صورت نظر نہ آئی۔ دو چار گاہک رہ گئے تھے۔ یہ غریبوں کی جگہ تھی اور یہاں وانگ لنگ خوش لباس اور خوش حال معلوم پڑ رہا تھا۔ چنانچہ ایک بھکاری رُک کر گڑگڑانے لگا:

"مہاراج میرے حال پر رحم کھاؤ اور روٹی کے لیے ایک پیسہ دے دو۔"

آج تک کسی بھکاری نے وانگ لنگ کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا تھا اور نہ کسی نے مہاراج کہہ کر اسے مخاطب کیا تھا۔ وہ پھولا نہ سمایا اور اس کے کاسے میں دو دھیلے پھینک دیے۔ بھکاری نے اپنے پنجوں سے فوراً یہ دھیلے اٹھائے اور انھیں جھولی میں چھپالیا۔

وانگ لنگ اتنی دیر بیٹھا رہا کہ سورج سر پر آنے لگا۔ خدمت گار بے صبری سے ٹہل رہا تھا۔ بالآخر اس نے درشت لہجے میں کہا: "یوں بے کار دھرنا جمائے گا تو تپائی کا کرایہ لگے گا!"

وانگ لنگ کو یہ گستاخی سخت ناگوار گزری اور وہ فوراً چل کھڑا ہوتا۔ مگر جب اسے یاد آیا کہ "ہوانگ" کی حویلی میں جا کر ایک عورت کا سوال کرنا ہے تو سارا جسم پسینے پسینے ہوگیا گویا وہ کھیت میں کام کر رہا ہے۔

لاچار اس نے لڑکے سے چائے کی فرمایش کی۔ کہنے کی دیر

تھی کہ چائے سامنے آگئی اور وہ لونڈا تیزی سے بولا: "اکنّی نکالیے!" اور بے چارے وانگ لنگ کو جبراً و قہراً دوبارا بٹوا کھولنا پڑا۔

وہ جھلا کر بڑبڑایا: یہ ڈکیتی نہیں تو کیا ہے! ۔ اتنے میں اس کی نظر اپنے پڑوسی پر پڑی جو رات کی دعوت میں آنے والا تھا اور بھٹیار خانے میں داخل ہو رہا تھا۔ اکنّی میز پر پھینک کر اور ایک گھونٹ میں پیالہ خالی کر کے وہ پچھلے دروازے سے سڑک پر نکل آیا۔

مایوسی سے یہ کہہ کر کہ: 'اور کوئی تدبیر نہیں!' کشاں کشاں وہ اس آہنی دروازے کی طرف روانہ ہوا۔

اب چونکہ دوپہر کا وقت تھا، پھاٹک کھلا ہوا تھا اور دربان کھانے کے بعد ایک تیلی سے دانت صاف کرتے ہوئے باہر چہل قدمی کر رہا تھا۔ دربان قد آور تھا اور اس کے بائیں گال پر ایک بڑا سا مسا تھا جس سے تین لمبے کالے بال، جو کبھی نہ کاٹے گئے تھے۔ لٹک رہے تھے۔ وانگ لنگ کے سر پر ٹوکرا دیکھ کر اُسے گمان ہوا کہ یہ کوئی بساطی ہے اور اس نے ڈپٹ کر کہا:

"کیوں میاں، کیا چاہتے ہو؟"

بڑی مشکل سے وانگ لنگ نے کہا: "میں وانگ لنگ نامی کسان ہوں"۔ دربان جو اپنے امیر آقا اور اس کی رکھیلیوں کے ملاقاتیوں کے سوا کسی سے سیدھے منہ بات کرنے کا عادی نہ تھا۔ بولا:

"وانگ لنگ کسان تو یہاں کیا کرنے آیا ہے؟"

وانگ لنگ کی گھگھی سی بندھ گئی — 'میں آیا ہوں — میں آیا ہوں" — مسے کے لمبے لمبے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے

دربان نے صبر ایوب کا نمونہ دکھایا: "جی آپ کی آمد سے میں بے خبر نہیں ہوں۔"

"یہاں ایک عورت ہے ـــــــ" یہ کہتے کہتے بڑی جدوجہد کے باوجود وانگ لنگ کی آواز بیٹھ گئی اور منہ پر پسینہ آگیا۔

دربان نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا: "اخاہ، آپ ہی وہ ذاتِ شریف ہیں۔ میں آج کسی دولھا کا انتظار کر رہا تھا، لیکن اس ٹوکرے کی وجہ سے شناخت میں غلطی ہوگئی۔"

ندامت کے انداز میں وانگ لنگ نے جواب دیا: "اس میں تھوڑا سا گوشت ہے۔" اور وہ انتظار کرنے لگا کہ دربان اس کی رہبری کرے لیکن یہ مردِ خدا ٹس سے مس نہ ہوا۔ وانگ لنگ نے متفکر ہوکر پوچھا:

"کیا میں اکیلے اندر جاؤں؟"

دربان جھوٹ موٹ چونک پڑا: "بڑے نواب تجھے زندہ نہ چھوڑیں گے!"

جب اس نے دیکھا کہ وانگ لنگ نپٹ انیلا ہے تو کہا:

"یہ دروازہ چاندی کی چابی سے کھلتا ہے۔"

اب وانگ لنگ کی سمجھ میں آیا کہ دربان کی نظر اس کی گرہ پر ہے۔ وہ گڑگڑاکر بولا: "میں تو بالکل کنگال ہوں۔"

یہ سن کر دربان نے کہا: "اچھا، ذرا اپنی کمر تو ڈھیلی کرو۔"

وانگ لنگ کے بھولے پن پر وہ مسکرا پڑا جب اس نے ٹوکرا نیچے رکھ کر کمر بند کے اندر سے بٹوا نکالا اور خرید و فروخت کے بعد جو تھوڑے بہت پیسے بچ گئے تھے وہ نکال کر دکھا دئے۔ اس میں کُلّھم ایک روپیہ

اور چودہ پیسے بچ رہے تھے۔
دربان نے سنجیدگی سے کہا: یہ روپیہ میرے حصّے کا ہے۔ اور قبل اس کے کہ وانگ لنگ اگر مگر کرے، اس نے روپیہ اپنی جیب کے سپرد کیا اور پھاٹک کے اندر "دولھا — دولھا" چلّاتے ہوئے گھس پڑا۔
گو وانگ لنگ کو اس چوری پر غصّہ اور اپنی آمد کے اعلان پر سخت شرم آئی، لیکن ٹوکرا دبائے اور سر جھکائے اس کے پیچھے جاتے ہی بنی۔
اور حالانکہ کسی بڑے گھر کو دیکھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا لیکن اسے بعد میں اس دن کی کوئی بات یاد نہ رہی۔ اپنے نام کی پکار کے بعد وہ ہر کونے سے ہنسی کی آواز سنتا اور ایک دالان کے بعد دوسرا، جھکی ہوئی گردن اور شرم آگیں چہرے کے ساتھ پار کرتا چلا گیا۔ معلوم نہیں وہ پچاس یا سو دالان پار کر چکا ہوگا کہ دربان یک بیک چپ ہو گیا اور اسے ایک چھوٹے سے کمرے میں ڈھکیل دیا۔ پل بھر کے لیے اندر جاکر دربان لوٹ آیا اور کہا۔
"بڑی بیگم نے تجھے اندر بلایا ہے!"
وانگ لنگ آگے بڑھا ہی تھا کہ دربان نے بگڑ کر اس کا راستہ روک دیا:
"کیا تو سور اور گائے کے گوشت کی ٹوکری لیے ہوئے اتنی بڑی بیگم کے آگے جائے گا! ٹوکری لیے ہوئے سلام کیسے کرے گا!"
وانگ لنگ نے گھبرا کر جواب میں کہا: ارے میں بھول ہی گیا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ٹوکری اپنے سے الگ نہ کرنا چاہتا تھا کہ

کہیں کوئی کچھ چرا نہ لے۔ وہ یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ دنیا سیر دو سیر گوشت اور ایک آدھ مچھلی کے پیچھے اس کی طرح دیوانی نہیں۔ دربان اس حیص بیص کی وجہ سمجھ کر اور بھی نفرت سے چلایا:

"ہماری حویلی میں یہ گوشت کتّے کھایا کرتے ہیں!" اور ٹوکری چھین کر دروازے کے پیچھے ڈال دی اور وانگ لنگ کو آگے دھکّا دیا۔

وہ دونوں ایک تنگ و دراز برآمدے سے ہو کر جس کے دونوں سرے منقش ستونوں کا سلسلہ تھا، ایک ایسے دیوان خانے میں پہنچے جس کا مثل وانگ لنگ کی نظر سے نہ گزرا تھا۔ وہ اتنا وسیع تھا کہ اس کے گھر کے سے دس بیس گھر اس میں سما جاتے۔ نقشین شہتیروں کو وہ سر اٹھا کر اس حیرت سے دیکھنے لگا کہ چوکھٹ سے ٹکرا گیا اور اگر دربان اسے تھام نہ لے تو وہ یقیناً منہ کے بل گر پڑتا۔ دربان نے ڈانٹ بتائی: "میاں بیگم صاحبہ کی سلامی کا یہی طریقہ ہے!"

وانگ لنگ شرم کے مارے پانی پانی ہو گیا۔ جب اس کے حواس ٹھکانے آئے تو کیا دیکھتا ہے کہ دیوان خانے کے بیچوں بیچ مسند پر ایک بڑھیا ڈھڈّو، جسم کے نام مٹھی بھر ہڈیوں کا ڈھانچہ، زرق برق آب رواں کے لباس میں جلوہ گر ہے اور اس کے پاس تپائی پر حقّہ رکھا ہے جس کی چلم پر افیون سلگ رہی ہے۔ اس کے جھرّی دار چہرے پر بندر کی سی دھنسی ہوئی تیز آنکھیں چمک رہی تھیں جن سے اس نے وانگ لنگ کو گھورا۔ جس ہاتھ میں حقّے کی نال تھی اس کی کھال ہڈیوں سے الگ لٹکی ہوئی تھی اور کسی مورت کے ملمع کی طرح پیلی اور چکنی تھی۔ وانگ لنگ فرش پر سجدے میں گر پڑا۔

بیگم نے دربان سے تحکمانہ انداز میں کہا: "اسے اٹھنے کو کہو۔ تعظیم و تکریم کی ضرورت نہیں۔ کیا یہ اس باندی کے لیے آیا ہی؟"

دربان نے جواب دیا: "جی ہاں، بڑی بیگم صاحب۔"

بیگم نے پوچھا: "لیکن یہ اپنی زبان سے خود کچھ کیوں نہیں کہتا؟"
دربان نے مسے کے بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا: "بیگم صاحب، یہ نرا احمق ہی۔"

اب تو وانگ لنگ نے بپھر کر کہا:

"بیگم صاحب۔ میں دیہات کا رہنے والا ہوں۔ آپ کے دربار میں زبان کھولنے کی جرأت کس طرح کروں۔"

بڑی بی نے نہایت سنجیدگی اور غور سے اسے دیکھ کر یوں منہ کھولا گویا کچھ کہنا چاہتی ہیں مگر اسی وقت ان کا ہاتھ حقّے کی نال پر گیا جس کی چلم کو ایک لونڈی پنکھا کر رہی تھی اور اس کے بعد وہ پینک میں آگئیں۔ حقّے پر جھک کر بڑھیا نے دم بھر میں تابڑ توڑ کئی کش لیے جس کے بعد آنکھوں کی وہ چمک غایب ہوگئی اور ان پر تغافل کی نقاب سی پڑ گئی۔ وانگ لنگ بت بنا اس کے آگے کھڑا رہا تا وقتیکہ اتفاقاً اس کی نگاہ اس پر آ گڑی اور اس نے گرج کر پوچھا: "یہ مردوا یہاں کیا کر رہا ہی؟" گویا وہ سب کچھ بھول گئی ہو۔ دربان نے زبان نہ ہلائی اور اس کے ماتھے پر بل تک نہ آیا۔

وانگ لنگ نے اچنبھے میں آکر جواب دیا:

"حضور میں اس باندی کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"باندی ؟ — کون سی باندی —" بیگم نے پنپنانا شروع کیا۔ مگر حقّہ بردار لونڈی نے جھک کر کان میں کچھ کہا۔ جسے سن کر بڑی بی کو ہوش آیا۔ "اخاہ میں گھڑی بھر کے لیے بھول ہی گئی تھی — اتنی زرا سی بات — تم اولان نامی باندی کے لیے آئے ہو۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ کسی کسان سے اس کی شادی ٹھیری ہے کیا تم وہی کسان ہو؟"

"جی ہاں سرکار۔"

بیگم نے اولان کو فوراً پیش کرنے کا حکم دیا۔ وہ اس جنجال کو جلد از جلد ختم کر کے اپنی افیون کے ساتھ اس کمرے میں تنہا چھوڑ دیے جانے کے لیے اتاولی سی ہو گئی۔

چشم زدن میں غلام ایک عورت کے ساتھ داخل ہوا جس کا قد قدرے دراز، جسم گدگدا اور نیلے پایجامے اور شلوکے میں ملبوس تھا۔ وانگ لنگ نے دھڑکتے ہوئے دل سے اسے دیکھ کر نگاہ پھیرلی۔ یہی اس کی بیوی تھی۔

بیگم نے لاپروائی سے کہا: "لونڈی آگے آ۔ یہ مرد تجھے لینے آیا ہے۔" عورت بڑھیا کے آگے سر جھکائے اور ہاتھ باندھے کھڑی ہو گئی۔

بیگم نے پوچھا! "کیا تو تیّار ہے؟"

عورت کی زبان سے صدائے بازگشت کی سی دھیمی آواز نکلی: "تیّار"۔ پہلی مرتبہ اس کی آواز سن کر وانگ لنگ نے پھر آنکھ اٹھا کر دیکھا کہ وہ اس کی طرف پیٹھ موڑے کھڑی ہے۔ آواز نہ زوردار تھی نہ کمزور۔ اس میں سادگی بول رہی تھی اور بددماغی کا نام نہ تھا۔ اس کے بال چکنے اور صاف اور کوٹ دھلا دُھلایا تھا۔ مگر جب

وانگ لنگ نے دیکھا کہ اس کے پیر بندھے ہوئے نہیں ہیں وہ لمحہ بھر کے لیے کبیدہ خاطر ہوا۔ اسے اس مسئلے پر غور کرنے کی مہلت نہ ملی۔ کیونکہ بیگم دربان سے کہہ رہی تھی: "اس کا بقچہ باہر پہنچا دو اور ان دونوں کو رخصت کرو۔" پھر وانگ لنگ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا: "اس کے پاس کھڑے ہو کر میری بات سنو۔" اور جب وانگ لنگ ہمہ تن گوش ہو گیا تو وہ کہنے لگی: "یہ باندی ہمارے محل میں دس سال کی عمر میں آئی اور یہاں رہتے اسے دس برس بیت گئے۔ قحط سالی میں اس کے ماں باپ دکن لائے اور اسے میرے ہاتھ بیچ گئے۔ وہ شمال کے شانتنگ نامی صوبے کے رہنے والے تھے اور وہیں واپس لوٹ گئے۔ بعد میں مجھے ان کی خبر نہ ملی۔ تم دیکھو کہ یہ لڑکی مضبوط ہے اور اس کے گال چوڑے چکلے ہیں۔ وہ جی لگا کر تمھارے کھیت میں کام کرے گی۔ پانی بھرے گی اور تمھاری مرضی کے خلاف نہ جائے گی۔ وہ حسین نہیں ہے اور نہ تمھیں اس کی ضرورت ہے۔ جنھیں آرام میسّر ہے وہ دل بہلانے کے لیے حسین عورتوں کی جستجو میں رہتے ہیں۔ یہ ذہین بھی نہیں ہے لیکن جو کہو وہ کرتی ہے اور اس نے مزاج بھی اچھا پایا ہے جہاں تک مجھے علم ہے یہ اب تک کنواری ہے۔ اس نے وہ صورت بھی نہ پائی جو باورچی خانے میں ہونے کے باوجود میرے بیٹوں یا پوتوں کو لبھا سکے۔ اگر کبھی کچھ گڑبڑ ہوئی ہو گی تو وہ خدمت گار سے۔ لیکن حویلی میں خوب صورت باندیوں کا کال نہیں اور مجھے تو یقین نہیں آتا کہ اس کا لگاّ کسی اور سے لگا ہو۔ اس کا ہاتھ پکڑو اور

ہمیشہ اس سے اچھا برتاؤ کرو۔ کچھ کوڑ مغز ہونے کے باوجود یہ باندی بُری نہیں۔ اور اگر مجھے عاقبت کے لیے بچّے پیدا کرا کے ثواب حاصل کرنے کا خیال نہ ہوتا تو ہرگز اسے الگ نہ کرتی کیونکہ یہ باورچی خانے کے کام کی ہے۔ جب مجھے کسی باندی کی ضرورت نہیں رہتی اور صاحبزادے بھی اس سے سیر ہو جاتے ہیں تو میں اس کی شادی کر دیتی ہوں۔"

اور باندی سے اس نے کہا: "اپنے شوہر کی فرماں برداری کرنا اور اس کے لیے جتنے ہو سکیں اتنے بچّے پیدا کرنا۔ پہلا بچہ مجھے دکھلانا۔"

اولان نے جواب دیا: "بجا ارشاد سرکار۔"

دونوں ششں و پنج کے عالم میں کھڑے رہے اور وانگ لنگ کی سمجھ میں نہ آیا کہ کچھ کہے یا نہ کہے اور اگر کہے تو کیا کہے۔

اب بڑھیا نے ڈانٹ کر کہا: "تم لوگ جاتے کیوں نہیں!" یہ سنتے ہی وانگ لنگ سلام کر کے فوراً روانہ ہو گیا۔ اس کے پیچھے وہ عورت اور عورت کے پیچھے بقچہ دبائے دربان۔ بقچہ اس نے اس کوٹھری میں پٹک دیا جہاں وانگ لنگ کا ٹوکرا تھا اور بے کچھ کہے سنے چمپت ہو گیا۔

وانگ لنگ نے مڑ کر پہلی بار اپنی بیوی کو جی بھر کر دیکھا۔ اس کے پھیلے ہوئے چہرے سے ایمانداری ہویدا تھی۔ پکوڑی سی ناک کے نتھنے کالے اور بڑے بڑے تھے۔ دہانہ چوڑا تھا گویا چہرے میں سوراخ نکل آیا ہو۔ چھوٹی چھوٹی سی آنکھیں رنگت میں

کالی تھیں اور ان میں کچھ ایسی مایوسی تیر رہی تھی جو بیان نہیں کی جاسکتی۔ اس کے چہرے سے خاموشی اور بے زبانی عیاں تھی۔ ــــ اس حد تک کہ اگر ممکن ہو تو وہ کبھی منہ سے ایک لفظ نہ نکالے۔ بنا کسی الجھن یا ہچکچاہٹ کے وہ وانگ لنگ کے معاینے کے خاتمے کا انتظار کرتی رہی۔ اور اس نے دیکھا کہ یہ چہرا بے نمک ہے ــ سانولا سیدھا اور صابر۔ لیکن اس پر نہ چیچک کے داغ تھے نہ ہونٹ کٹا ہوا تھا۔ اس کے کانوں میں وہ کرن پھول جھول رہے تھے اور انگلیوں میں وہ انگوٹھیاں چمک رہی تھیں جو وانگ لنگ نے اس کے لیے خریدی تھیں۔ وہ جی ہی جی میں باغ باغ ہوکر آگے بڑھا۔ وہ ایسی ہی عورت چاہتا تھا!

اس نے روکھے پن سے کہا: "اٹھاؤ اپنا بقچہ اور ٹوکرا۔"

چپ چاپ نیچے جھک کر عورت نے صندوق کو پیٹھ پر لادا اور بمشکل اس بوجھ کے ساتھ کھڑی ہوسکی۔ یہ دیکھ کر وانگ لنگ بولا: "میں صندوق لے چلوں گا تم ٹوکرا تھامو۔"

اور اپنے شاندار لباس کی پروا نہ کرکے اس نے یہ بار پیٹھ پر لاد لیا جسے دیکھ کر وہ محو حیرت ہوگئی اور ٹوکرا ہاتھ میں لے لیا۔ وانگ لنگ کو ان بے شمار دالانوں اور اپنی اس مضحکہ خیز ہیئت کا خیال آیا اور وہ زیر لب بولا "کاش کوئی چور دروازہ ہوتا ــ" کچھ سمجھ کر اولان نے یوں سر ہلایا گویا اپنے شوہر کی بات وہ فوراً نہ سمجھ سکی ہو۔ وہ راہ دکھاتی ہوئی ایک چھوٹے سے غیر استعمال شدہ دالان میں پہنچی جس میں گھاس پھوس اُگ آئی تھی،

باؤلی سڑرہی تھی اور وہیں صنوبر کے پیڑ کے نیچے ایک پرانا پھاٹک تھا جس کی زنجیر کھول کر وہ دونوں سڑک میں آگئے۔

ایک دو مرتبہ وانگ لنگ نے لوٹ کر اولان کی طرف دیکھا۔ وہ اس باقاعدگی سے راستہ ناپ رہی تھی اور اس کا چہرا ایسا گمھم تھا گویا ساری زندگی اس نے رہ نوردی کے سوا کوی کام نہ کیا ہو۔ شہر پناہ کے پھاٹک پر مرد جز بز کے عالم میں رُک گیا اور کاندھے پر صندوق تھامے دوسرے ہاتھ سے بٹوے میں پیسے ٹٹولنے لگا۔ دو ائی نکال اس نے چھ ہرے آڑو خریدے۔ "لو یہ تمھارے لیے ہیں" اس نے خشک لہجے میں کہا۔ اور اولان نے کسی لالچی بچّے کی طرح بے کچھ کہے انھیں ہاتھوں میں لے لیا۔ اور جب گیہوں کے کھیتوں کی باڑھ پر چلتے ہوئے اس نے مڑکر دیکھا، تو وہ احتیاط سے ایک آڑو کھا رہی تھی۔ لیکن جیسے ہی شوہر سے اس کی نگاہ دوچار ہوی اس نے پھل ہتیلی میں چھپا لیا اور منہ بند کر لیا۔

چلتے چلتے وہ پچھم کے اس میدان میں پہنچے جہاں دھرتی ماتا کا مندر تھا۔ یہ مندر چھوٹا سا تھا — اونچائی میں مرد کے کاندھے کے برابر اینٹ کی دیواریں اور کھپروں کی چھت۔ وانگ لنگ کا دادا گاڑی میں شہر سے اینٹیں لاد لاد کر لایا تھا اور یہ مندر کھڑا کیا تھا۔ دیوار کے باہری حصّے پر قلعی کی ہوئی تھی اور خوشحالی کے زمانے میں ایک دیہاتی آرٹسٹ نے سفیدی پر پہاڑیوں اور بانس کے پیڑوں کے نظارے اُتارے تھے مگر سالہا سال کی بارش نے ان تصویروں کو دھو دیا تھا۔ پہاڑیاں تو تقریباً مٹ گئی تھیں

اور بانس کے پیڑوں کی پرچھائیں باقی رہ گئی تھی۔
مندر کے اندر، چھت کے نیچے، مٹی کے دو چھوٹے چھوٹے پُتلے بڑے رعب سے آسن مارے بیٹھے تھے۔ مندر کے ٹرد س کی مٹی سے اُن کی تعمیر ہوئی تھی، ایک تھا دیوتا، دوسری تھی دیوی۔ وہ لال کپڑے اور گلٹ کے کاغذ کے لباس میں ملبوس تھے۔ دیوتا کے چہرے پر سچّے بالوں کی زرا زرا سی موچھیں جھول رہی تھیں۔ ہر نوروز کے موقع پر وانگ لنگ کا باپ کاغذ کے دستے لاتا اور انھیں احتیاط سے کاٹ کر ان پُتلوں کو نیا جوڑا پہناتا۔ اور ہر سال برف و باراں اور تابستان کا آفتاب ان کی وردیوں کو جھلسا دیتا۔
لیکن اس وقت اُن کے لباس صاف ستھرے تھے کیونکہ نیا سال حال ہی میں شروع ہوا تھا۔ وانگ لنگ ان کی سج دھج دیکھ کر خوشی سے پھول گیا۔ اپنی بیوی کے ہاتھ سے ٹوکری لے کر اس نے گوشت کی پوٹلی کے نیچے سے وہ عود بتیاں نکالیں جو اُس نے خریدی تھیں۔ وہ جی ہی جی میں ڈر رہا تھا کہ وہ ٹوٹ نہ گئی ہوں اور شگون بد نہ ہو جائے۔ مگر بارے وہ صحیح سلامت تھیں۔ انھیں اس نے دیوار میں دوسری بتیوں کے پاس کھونس دیا، کیونکہ سارا علاقہ ان بتوں کا پرستار تھا۔ چقماق نکال کر اس نے ایک سوکھی پتّی جلائی اور ان بتّیوں کو لو دکھائی۔
دونوں میاں بیوی اپنے کھیتوں کے خداؤں کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے ہو گئے۔ عورت دیکھنے لگی کہ عود بتیوں کے سرے سرخ ہو کر پھر کیسے مٹیا جاتے ہیں۔ جیسے ہی کہ راکھ بوجھل ہو جاتی۔ وہ

جھک کر اپنی انگلی سے جھاڑ دیتی - پھر سہمی ہوئی آنکھوں سے وہ وانگ لنگ کی طرف دیکھتی کہ مبادا اُس سے کوئی غلطی تو سرزد نہیں ہوئی - لیکن وانگ لنگ کو اس کی یہ ادا بھلی معلوم ہوئی - عورت کو محسوس ہوا کہ یہ عود بتی ان دونوں کے لیے سلگ رہی ہی اور یہ گویا ان کے لگن کی گھڑی ہی - وہ پاس پاس خاموش کھڑے رہے اور بتی جل جل کر راکھ ہوتی گئی - اور جب سورج ڈھلنے لگا تو وانگ لنگ نے بقچہ دبایا اور دونوں گھر کی طرف چلے -

گھر کے دروازے پر بڑے میاں دھوپ کی آخری تپش کھا رہے تھے - دونوں کے قریب پہنچ جانے پر بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوا - اپنی بہو کو نظر اٹھا کر دیکھنا اس کی شان کے خلاف تھا - وہ جھوٹ موٹ بادلوں پر نگاہ گڑائے بولنے لگا: " بادل کا یہ ٹکڑا جو چاند کی بائیں کلغی پر اٹکا ہوا ہی بارش کا پیامی ہی - کل رات تک چھینٹا پڑ کر ہی رہے گا " اور جب اس نے وانگ لنگ کو عورت کے ہاتھ سے ٹوکری لیتے ہوئے دیکھا تو چیخ پڑا: " کیا تو پیسے لٹاتا آرہا ہی ؟ "

وانگ لنگ نے میز پر ٹوکری رکھ کر لاپروائی سے کہا: -
" رات کو مہمان کھانے پر آئیں گے " بقچہ اپنے کمرے میں لے جاکر اس نے اس صندوق کے پاس رکھ دیا جس میں اس کے کپڑے رہتے تھے - اس پر اس نے حیرت کی نظر ڈالی - اتنے میں بڈھا دہلیز پر آکر چلانے لگا:

" اس گھر میں فضول خرچی کی حد نہیں ہی ! "

دل ہی دل میں وہ خوش تھا کہ گھر مہمان آئیں گے۔ لیکن وہ اس کا
ظہار نہ کرنا چاہتا تھا کہ کہیں پہلے ہی دن بہو کو پیسے اڑانے کی
ادت نہ پڑ جائے۔ وانگ لنگ بے کچھ کہے سنے ٹوکری لیے
اورچی خانے میں گھس گیا اور عورت بھی اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔
مام پلندے اس نے یکے بعد دیگر تندور پر رکھ دیے۔

"یہ ہے مچھلی، یہ ہے سبزی، یہ رہا گوشت۔ سب ملا کر سات
دمی ہوں گے۔ تمھیں پکانا تو آتا ہوگا؟"

اس نے آنکھ اٹھا کر اپنی بیوی کو نہ دیکھا کیونکہ یہ بری بات تھی۔
ولان نے سادگی سے جواب دیا: "حویلی میں میں باورچی خانے کی
ندی تھی۔ وہاں صبح شام گوشت پکتا ہے۔"

وانگ لنگ سر ہلا کر باہر چلا گیا اور شام تک اس کے پاس نہ آیا۔
ب مہمانوں کی آمد شروع ہوئی ——— چالاک پیٹو، مسخرہ چچا اور
ن کا بدتمیز نوعمر بیٹا، اور شرمیلے، میلے کچیلے کسان۔ ان میں سے
دگانو سے آئے تھے اور فصل کٹائی کے زمانے میں وانگ لنگ
ن سے ساجھے میں کام کرتا تھا۔ تیسرا اس کا پڑوسی 'چنگ' کم سخن
دمی تھا اور سخت مجبوری کی حالت میں زبان کھولتا تھا۔ بخلے کمرے
ں "تشریف رکھنے" کے سلسلے کے صد تکلفات کے بعد وانگ لنگ
نی بیوی کو کھانا لگانے کا حکم دینے کے لیے گیا وہ بہت خوش ہوا
ب اولان نے کہا:

"مہربانی کر کے تم ہی دسترخوان لگا دو۔ میں غیر مردوں کے
گے جانا پسند نہیں کرتی۔"

وانگ لنگ گھمنڈ سے پھول گیا کہ یہ 'میری' بیوی ہے اور میرے سوا کسی دوسرے کے آگے نہیں آنا چاہتی۔ میز پر کٹورے رکھ کر اس نے زور سے کہا: "چچا جان اور دوستو، کھانا تیار ہے۔" اور جب ٹھٹھول باز چچا نے پوچھا: "کیا ہم دلھن کی چھب نہ دیکھیں گے؟" تو وانگ لنگ نے سختی سے جواب دیا: "ابھی ہم دونوں ایک جان نہیں ہوئے۔ جب تک سہاگ رات نہ بیت جائے غیر مرد دلھن کو نہیں دیکھ سکتے۔"

وہ ان سے زیادہ کھانے کا اصرار کرتا گیا اور وہ سب بلاتکلف رکابیاں صاف کرتے گئے۔ کوئی مچھلی کے قورمے کی تعریف کرتا تو کوئی سور کے دم پخت کی۔ لیکن وانگ لنگ برابر یہی دہراتا رہا:

"آپ کیا کہتے ہیں — یہ بھی کوئی کھانے میں کھانا ہے۔"

مگر جی ہی جی میں وہ باغ باغ تھا۔ کیونکہ اولان نے سرکہ، شراب اور سوہے کی وہ بیٹ دی تھی اور ایسی ہوشیاری سے گوشت میں خستگی پیدا کی تھی کہ اس نے آج تک کسی دعوت میں ایسا لذیذ کھانا نہ کھایا تھا۔

رات بیتے تک مہمان چائے پی پی کر ہنستے ہنساتے رہے۔ اولان دیر تک تندور کے پیچھے دبکی رہی اور تھک کر بیل کے قریب پُرال کی ڈھیری پر سوگئی۔ جب وانگ لنگ آخری مہمان کو رخصت کرکے اسے جگانے آیا تو وہ گھاس پھوس میں سر دیے پڑی تھی۔ اس کی آواز سن کر اس نے نیند میں یوں ہاتھ اُٹھایا گویا کسی وار سے اپنے کو بچانا چاہتی ہے۔ بالآخر جب اس نے آنکھ کھولی اور ایک عجیب

بے زبان انداز سے اسے دیکھا تو وانگ لنگ کو محسوس ہوا کہ یہ کوئی ننھی سی بچی ہے۔ ہاتھ پکڑ کر وہ اسے اس کمرے میں لایا جہاں اس نے صبح اس عورت کی خاطر اپنے جسم کی پاکی کی تھی۔ سرخ موم بتی جلا کر اس نے میز پر رکھ دی۔ اس کی مدھم جوت میں یک بیک اسے اس خیال سے شرم آئی کہ وہ اولان کے ساتھ اکیلا ہے۔ اور اسے یہ سوچنا ہی پڑا کہ:

"یہ میری بیوی ہے اور مجھے وہ حرکت کرنی ہی ہے"

یہ سوچ کر وہ ڈھٹائی سے کپڑے اتارنے لگا۔ عورت بیچاری مچھر دانی کے پیچھے جا کر چپ چاپ بستر تیار کرنے لگی۔ وانگ لنگ نے روکھے پن سے کہا: "سونے سے پہلے بتی بجھا دیا کرو۔"

لیٹ کر اس نے موٹی رزائی اوڑھ لی اور جھوٹ موٹ آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے جسم میں لرزہ سا آگیا تھا اور اس کا ایک ایک رُواں پھڑک رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد جب کمرے میں اندھیرا ہو گیا اور اس کے آغوش میں ایک عورت ہولے ہولے تھرتھرانے لگی تو خوشی کے مارے وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ زور سے ہنس کر وانگ لنگ نے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔



باب ۔ ۲

اب وانگ لنگ چین کی بنسی بجانے لگا۔ دوسرے دن صبح بستر پر پڑے پڑے وہ اس عورت کو دیکھنے لگا جواب سرتاپا اس کی تھی۔ وہ اٹھی اور اپنے بے بند لباس کو جھٹکتے اینٹھتے ہوئے جسم پر بٹھاکر اسے اپنے گلے اور سینے پر ڈھانکنے لگی۔ پھر اپنے پیر چپل میں ڈال کر اس کے تسمے باندھ لیے۔ چھوٹے سے جھروکے سے دھوپ چھن چھن کر اس کے مکھڑے کو اجال رہی تھی۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر وانگ لنگ کو تعجب ہوا۔ وہ تو یہ سوچے بیٹھا تھا کہ یہ رات اسے بدل دے گی۔ لیکن وہ عورت اس کے پلنگ سے یوں اٹھ رہی تھی گویا زندگی کی ساری راتیں اس نے یہیں گزاری ہوں پو پھٹنے سے بوڑھے کی کھانسی کی آواز نعرۂ جنگ کی طرح بلند ہوئی۔ اسے سن کر وانگ لنگ بولا:

"پہلے ابّا کو غرارہ کے لیے گرم پانی دے آؤ۔"

اولان کی آواز آج بھی وہی تھی جو کل تھی، جب اس نے پوچھا:

"کیا اس میں چائے کی پتیاں بھی بھگودوں ؟"

اس سیدھے سادے سوال نے وانگ لنگ کو چکّر میں ڈال دیا۔ یہ جواب اس کی زبان پر آکر رہ گیا: "اور نہیں تو کیا ؟۔ کیا ہمیں کوئی بھک منگا جانا ہے ؟" وہ اولان پر ثابت کرنا چاہتا تھا۔ کہ یہاں چائے کی پتّی اور گھاس پھوس میں کوئی فرق نہیں۔

ہوانگ کی حویلی میں تو پانی کا ہر پیالہ چائے کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہوتا تھا۔ وہاں شاید غلام بھی سادہ پانی نہ پیتا ہو۔ لیکن پھر وانگ لنگ کو یاد آیا کہ اگر پہلے ہی دن اس کی بیوی پانی کے بجائے چائے لے گئی تو بڑے میاں آگ ببولا ہو جائیں گے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ وہ ایسے کہاں کے دھنا سیٹھ تھے۔ چنانچہ اس نے لاپروائی سے کہا:

"چائے؟ نہیں نہیں —— اس سے ان کی کھانسی بڑھ جاتی ہے۔"

بستر پر وہ آرام و اطمینان سے لیٹا رہا اور اُدھر عورت آگ سُلگانے اور پانی گرم کرنے لگی۔ وہ چاہتا تو دوبارہ سو سکتا تھا۔ لیکن اس کے جسم کو مدتوں سے تڑکے اٹھنے کی بیہودہ عادت پڑ چکی تھی۔ وہ سونے سے انکار کر رہا تھا۔ اس لیے وانگ لنگ اینڈتا پڑا رہا اور اپنے دماغ و دل کو نشاط کاہلی سے نہال کرنے لگا۔

اب بھی اپنی بیوی کے تصور سے اسے جھینپ سی آجاتی تھی۔ وہ اپنے کھیت، گیہوں کے پودوں اور بارش ہونے کی صورت میں اپنی فصل کی پیداوار پر غور کرنے لگا۔ وہ سفید شلجم کے بیجوں کے مسئلے کو بھی نہ بھولا۔ جنھیں مول طے ہو جانے پر پڑوسی 'چنگ' سے خریدنا تھا۔ روزمرہ کی ان باتوں کے بیچ میں اس کے خیال کا یہ تانا بانا جاری رہا —— کہ زندگی میں کتنی بڑی تبدیلی ہو گئی ہے۔ اور رات کی بات کا سوچ کرتے کرتے یک بیک اس کے دل میں یہ سوال اٹھا کہ اولاد مجھے پسند کرتی ہے یا نہیں۔ یہ ایک نئی پہیلی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ وہ اسے چاہے گی یا نہیں اور اس مکان اور پلنگ میں اسے راحت ملے گی یا نہیں۔ گو اولاد کا چہرہ بے نمک تھا اور

اس کے ہاتھ سخت تھے لیکن اس کا بدن اچھوتا اور گداز تھا۔ جب وانگ لنگ کو اس کا خیال آیا تو وہ ہنس پڑا ـــــ جس طرح پچھلی رات کے اندھیرے میں وہ کھلکھلا پڑا تھا۔ یہ امر یقینی تھا کہ حویلی میں کسی نے اس باندی کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔ اس کا جسم سڈول اور گدگدا تھا۔ اچانک وانگ لنگ کو یہ خواہش ہوئی کہ اولان اسے شوہر کی طرح چاہے، مگر پھر وہ شرما کر رہ گیا۔

دروازہ کھلا اور اولان خاموشی سے اندر داخل ہوئی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ایک پیالہ تھا جس سے بھاپ نکل رہی تھی۔ وہ پلنگ پر اٹھ بیٹھا اور پیالہ لے لیا۔ پانی کی سطح پر چائے کی پتیاں تیر رہی تھیں۔ وانگ لنگ نے تیکھی چتونوں سے اسے دیکھا۔ اولان سہم گئی اور بولی:

"تمھارے کہے مطابق میں بڑے میاں کے لیے چائے نہیں لے گئی ـــــ مگر تمھارے لیے ـــــ"

وانگ لنگ کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ اس کا خوف کھاتی ہے۔ اور اس نے مزا لے لے کر چائے سڑپتے ہوئے فوراً کہا: "اچھا کیا، مجھے یہ پسند ہے۔"

وہ اس نئی مسرت کا اظہار اپنے آپ سے بھی نہیں کرنا چاہتا تھا: "میری بیوی مجھ سے محبت کرتی ہے!"

وانگ لنگ کو محسوس ہوا کہ مہینوں اس نے اولان کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھنے کے علاوہ اور کچھ نہ کیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے اس دوران میں وہ ہمیشہ کی طرح اپنے کام میں مشغول رہا۔ کاندھے پر

گھر بار کھ کر وہ اپنے کھیت میں جاتا، فصل بوتا اور بیل کو ہل میں جوت کر پچھم کی بٹی میں پیاز اور لہسن کی باڑھ لگاتا۔ لیکن یہ محنت اُسے کھلتی نہ تھی۔ کیونکہ جب سورج سر پر آتا تو وہ گھر جاتا جہاں صاف ستھری میز پر کھانا چنا ہوتا اور پیالوں کے ساتھ تیلیاں رکھی ہوتیں۔ اب تک تھکاوٹ کے باوجود گھر لوٹ کر اسے خود کھانا پکانا پڑتا تھا۔ یہاں اگر بڑے میاں کے پیٹ میں پہلے سے چوہے کودنے لگے اور انھوں نے کچھ کچا پکا پکا کر لہن کے ساتھ حلق کے نیچے اتار لیا تو دوسری بات تھی۔

لیکن اب گھر میں جو کچھ ہوا اس کے لیے حاضر ہوتا اور وہ آرام سے اسے کھا سکتا تھا۔ گھر لپا پُتا ہوا تھا اور ایندھن کی کوٹھری بھری پڑی تھی۔ صبح جب وانگ لنگ کھیت کی راہ لیتا تو او لان رسی اور بانس لیے ہوئے میدان کی طرف نکل جاتی۔ یہاں سے کچھ پتیاں، وہاں سے کچھ کھپچیاں بٹور کر وہ پہر بھر میں دن بھر کے لیے ایندھن جمع کر لاتی۔ وانگ لنگ خوش ہوتا کہ ایندھن خریدنا نہ ہوگا۔

تیسرے پہر ٹوکرا اور کھرپی لیے وہ بڑی سڑک کی جانب جاتی جہاں شہر آنے جانے والے گھوڑوں گدھوں کی قطار لگی ہوتی تھی۔ ان کی لید لا کر وہ کھیت کے لیے کھاد بناتی۔ یہ سب کام کسی کے کہے بغیر وہ اپنی مرضی سے کرتی تھی۔ شام ہو جانے پر بھی وہ اس وقت تک چپ نہ بیٹھتی جب تک بیل اپنے کھونٹے پر نہ چلا جاتا اور وہ اس کے لیے ناند میں پانی بھر کر نہ رکھ دیتی۔

کپاس کی پونی سے بانس کی تکلی میں دھاگا بن کر اس نے گرم کپڑوں کے سوراخوں کی بھرت کی ۔ توشک اور لحاف کے غلاف نکال کر اس نے دھوئے اور سوکھنے کے لیے دھوپ میں ڈال دیے ۔ دقیانوسی روئی کو دُھن کر اس نے پسوؤں اور کھٹملوں کو مارا جو لونے کھدروں میں چھپے رہتے تھے ۔ ہر روز وہ کوی نیا انتظام کرتی ۔ حتیٰ کہ تینوں کمروں میں رونق سی آگئی ۔ بڈھے کی کھانسی بھی کم ہوگئی اور وہ دیوار سے لگ کر دھوپ کھاتا، ملہار گاتا پڑا رہنے لگا ۔

لیکن زندگی کی چند ضروریات کے علاوہ یہ عورت اور کسی معاملے پر زبان نہ کھولتی تھی ۔ وانگ لنگ چور نظروں سے کبھی اس کے چوڑے چکلے چہرے کو اور اس کے بڑے بڑے پیروں کو اور کبھی اس کی سہمی ہوی گُمسم چتونوں کو دیکھتا —— اور اپنے کو اس عورت کو سمجھنے سے قاصر پاتا ۔ رات کو وہ اس کے بدن کے نرم گُٹھیلے پن کو محسوس کیا کرتا ۔ لیکن صبح یہ جسم سادے سوتی کپڑوں میں چھپ جاتا اور وہ ایک بے زبان ایماندار باندی کے روپ میں بدل جاتی ۔ یہ پوچھنا وانگ لنگ کی شان کے خلاف تھا کہ "تم بولتیں کیوں نہیں ؟" یہ کافی تھا کہ وہ اپنی خدمت انجام دیتی تھی ۔

کبھی کبھی کھیت کی مٹی الٹ پلٹ کرتے ہوئے وہ اولان کے دھیان میں گم ہوجاتا ۔ حویلی کے درد دالان میں اُس پر کیا گزری ہوگی ؟ ۔ اس کی پچھلی زندگی کیسی تھی —— وہ زندگی جس کے متعلق اُس نے اپنے شوہر سے کبھی کچھ نہ کہا تھا ؟ وانگ لنگ کے لیے

یہ ایک ابوجھ پہیلی تھی۔ پھر اسے اپنے تجسّس اور دلچسپی پر ندامت ہوتی۔ وہ محض ایک عورت ہی تو تھی۔ . . .

لیکن تین کمروں کی صفائی اور دو مرتبہ چولھے کی جلائی بھلا اُس باندی کی مصروفیت کے لیے کب کافی ہوتی جو ایک حویلی میں صبح سے آدھی رات تک کام کرنے کی عادی رہی ہو۔ ایک روز جب وانگ لنگ گیہوں کے کھیت میں نلائی کرتے کرتے تھک کر چور چور ہوگیا تھا، اولان کا سایہ اس کی کھرپی پر پڑا۔ اور اس نے دیکھا کہ وہ کندھے پر بیلچہ لیے ہوئے کھڑی ہے۔ اس نے صرف اتنا کہا: "شام تک گھر میں کچھ کرنے کو نہیں ہے"۔ بے کچھ کہے سنے اولان نے اپنے شوہر کے بائیں بازو پر آکر ہل تھاما اور نلائی میں مصروف ہوگئی۔

سورج ان پر تمتما رہا تھا کیونکہ یہ گرمی کا آغاز تھا۔ اولان کا چہرہ پسینے سے شرابور ہوگیا۔ وانگ لنگ شلوکہ اتار کر ننگے بدن کام کرنے لگا لیکن اولان کی مہین کرتی دیکھتے دیکھتے تربتر ہوکر اس کے جسم سے چپک گئی۔ گھنٹوں وہ دونوں چپ چاپ ایک گت سے کام کرتے گئے، یہاں تک کہ ان میں ایک قسم کی ہم آہنگی سی پیدا ہوگئی اور وانگ لنگ تازہ دم ہوگیا۔ وہ سب کچھ بھول گیا۔ مشقت کی اس ہم آہنگی کے سوا اسے کسی چیز کا دھیان نہ رہا۔ اسے اتنا یاد رہا کہ یہ مٹّی جسے وہ تہ بہ تہ الٹ کر سورج کا منہ دکھا رہا ہے، اس کی پالن ہار ہے۔ اسی مٹّی سے اس کے دیوتا گھڑے جاتے ہیں اور اس کے مکانوں کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس کی رنگت

سیاہ تھی اور وہ زرخیز معلوم ہوتی تھی ۔کھرپے کی نوک سے
اُچھل کر وہ اِدھر اُدھر بکھر جاتی تھی ۔کبھی اینٹ یا لکڑی کا ایک آدھ
ٹکڑا نکل آتا ۔کسی زمانے میں یہاں شہر آباد ہوں گے ۔اسی جگہ
سربلند حویلیاں مسمار ہوکر مٹّی میں مل گئی ہوں گی اور اسی طرح کبھی
ان کا گھر اور ان کے جسم بھی خاک کے سپرد ہو جائیں گے ۔سب کو
اسی مٹّی سے پالا پڑنا ہے . . . اور وہ دونوں بے آواز ایک لَے
اور ایک گت سے کام کرتے گئے ــــــ دونوں زمین کی
کوکھ سے پھل پیدا کرنے لگے ۔

جب سورج ڈوب گیا تو مرد نے آہستہ آہستہ پیٹھ سیدھی
کر کے عورت کی طرف دیکھا ۔اس کا چہرا بھیگ کر مٹّی سے لتھڑ
گیا تھا ۔ اور مٹّی کی ہی طرح اس کا رنگ خاکی تھا ۔ اس کا بھیگا ہوا
سیاہ لباس چوکور بدن سے چپک گیا تھا ۔ ہولے ہولے آخری
باہ کا نشان بنا کر اس نے حسب معمول اپنے سادہ انداز میں ــــ
جو شام کی خاموشی میں زیادہ بے رنگ معلوم ہوتا تھا ــــ کہا :
"میں حمل سے ہوں ۔"

وانگ لنگ سناٹے میں آگیا ۔اور وہ اس معاملے میں کہہ بھی
کیا سکتا تھا !۔ اولان جھک کر ہل میں پھنسا ہوا اینٹ کا ٹکڑا نکالنے
لگی ۔ اس نے یہ اعلان بالکل اسی طرح کیا تھا جس طرح "چائے تیار ہے"
یا "کھانا کھالو" کہا کرتی تھی ۔ اس کے لیے یہ ایسی ہی معمولی سی بات تھی!
مگر وانگ لنگ کے لیے ؟۔ اسے خود معلوم نہ تھا کہ یہ کیسی اہمیت
رکھتی ہے ۔اس کا دل اُچھل کر یوں رُک گیا جیسے کسی دیوار سے

ٹکرا گیا ہو۔ اچھا، زمین اب اُنھیں نہال کر دے گی۔
اولان کے ہاتھ سے کھُرپی چھین کر اس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا: "اب رہنے بھی دو۔ شام ہو چلی۔ آؤ بڑے میاں کو خوش خبری سنائیں"۔
دونوں نے گھر کی راہ لی۔ عورت کے مرتبے کے مطابق اولان اپنے شوہر کے پانچ قدم پیچھے رہی۔ بڈّھا دروازے پر کھانے کی آس میں کھڑا ہوا تھا۔ اب جو گھر میں ایک عورت آگئی تھی اس نے چولھے کو ہاتھ لگانے کی قسم کھا رکھی تھی۔ بھوک سے بے قرار ہو کر وہ چلّایا:
"بڑھاپے میں مجھ سے آنتوں کی یہ ہائے پکار نہیں سنی جاتی"۔
مگر وانگ لنگ نے اسے اندر لے جا کر کہا: "اُس کے پیر تو ابھی سے بھاری ہوگئے"۔
اُس نے یہ جملہ اُسی لاپروائی سے کہنا چاہا جیسے کوئی کہے کہ "آج میں نے فلاں کھیت میں نرائی کر دی"۔ لیکن وانگ لنگ سے یہ نہ ہو سکا۔ حالانکہ اس نے دھیرے سے یہ خبر سنائی تھی لیکن اسے ایسا معلوم ہوا گویا وہ گلا پھاڑ کر چلّا اٹھا ہو۔
آن بھر کے لیے بڑے میاں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جب اصل رمز سمجھ میں آئی تو وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔
بہو کو پکار کر بولے: "اوہو ہو ہو! فصل کٹنے کے دن قریب آگئے"۔
جھٹپٹے میں اولان کا چہرا نظر نہ آیا۔ لیکن اس نے سیدھے پن سے جواب دیا: "میں فوراً کھانا تیّار کرتی ہوں"۔

بڈّھے نے للچا کر کہا: "ہاں — ہاں۔ کھانا۔" اور بچّوں کی طرح وہ اس کے پیچھے پیچھے باورچی خانے کی طرف چلا جس طرح پوتے کے تصور نے اس کے ذہن سے کھانے کی یاد بھلا دی تھی۔ اب کھانے کے دھیان نے پوتے کا خیال محو کر دیا۔

لیکن وانگ لنگ اندھیرے میں سر چھپائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے جسم سے، اس کے بیج سے زندگی نمودار ہونے والی تھی۔



باب ۔۳

جب ولادت کی ساعت قریب آئی تو مرد نے عورت سے کہا:
"اس موقع پر تمھاری دیکھ بھال کے لیے کسی عورت کی ضرورت ہے۔"
مگر اولان نے سر ہلایا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ برتن دھو رہی تھی۔ بڑے میاں اپنی سکھ سیج پر آرام فرما تھے۔ یہ دونوں اکیلے تھے اور کمرے کو روشن کرنے کے لیے تلی کے تیل کا ایک ٹمٹماتا ہوا دیا تھا جس میں روئی کی پونی بتّی کا کام دے رہی تھی۔
اس نے اچنبھے میں آکر پوچھا: "کوئی عورت نہیں؟"۔ اب وانگ لنگ کو اس یک طرفہ گفتگو کی عادت سی پڑ چلی تھی۔ جس میں اولان ہاتھ یا سر کی جنبش، یا اپنے چوڑے دھانے سے ایک آدھ لفظ ٹپکا دینے کے سوا اور کوئی حصّہ نہ لیتی تھی۔ وانگ لنگ کو اس قسم کی بات چیت میں مزہ سا ملنے لگا تھا۔ وہ کہنے لگا: "لیکن گھر میں مرد ہی مرد ہوئے تو کیسی عجیب بات ہوگی۔ میری ماں نے گانوں سے ایک عورت بلائی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں ان مرحلوں سے ناواقف ہوں۔ کیا اس حویلی میں کوئی بوڑھی باندیوں میں تمھاری کوئی سکھی سہیلی نہیں جو ہاتھ بٹانے آجائے؟"
آج پہلی بار اس نے اس حویلی کا ذکر کیا جہاں سے اولان آئی تھی۔ اس کا نام سنتے ہی اولان اپنے شوہر کی طرف پلٹی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی سی آنکھیں چمک اٹھیں، اور اس کا چہرہ غصّہ سے

تمتما پڑا اور وہ چیخ کر بولی: "اس گھر میں میرا کوئی نہیں ہی!"
وانگ لنگ کی چلم اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی اور وہ اسے دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا لیکن اولان یکا یک مسکینوں کا سا منہ بنائے یوں برتن دھونے میں مصروف تھی گویا کبھی منہ کھولا ہی نہ تھا۔
"یہ کیا ماجرا ہی" وانگ لنگ نے حیرت سے کہا۔ مگر کوئی جواب نہ پاکر اس نے اپنی دلیلوں کا سلسلہ جاری رکھا: ہم باپ بیٹوں نے کبھی دایہ گری نہیں کی ہی! ابا تمھارے کمرے میں آنے سے رہے اور مجھ سے پوچھو تو میں نے آج تک کسی گائے کے بچّے کے جنم کا بھی نظارہ نہیں کیا۔ میرے بھونڈے ہاتھ بچّے کا جسم چھیل دیں گے۔ آخر جب باندیاں بچّے پیدا کرتی ہی ہیں تو بڑی حویلی سے کسی کو ——"
اولان نے احتیاط سے برتن ایک کنارے لگائے اور مرد کو غور سے دیکھ کر جواب دیا: "اس حویلی میں میں اپنے بچّے کے بغیر پانو نہ رکھوں گی۔ میں سرخ شلوکہ پہناؤں گی اور اس کے جانگھیے پر لال پھول ٹنکے ہوں گے۔ اس کی ٹوپی کے سامنے بُدھ کی مورت جگمگاتی ہوگی اور اس کے پیروں میں شیر چہرہ جوتے ہوں گے۔ میں نئی جوتیاں پہنوں گی اور سیاہ ساٹن کا نیا کوٹ میرے جسم پر ہوگا۔ اس سج دھج سے میں اس باورچی خانے میں جاؤں گی جہاں میں نے غلامی کی ہی اور اس دیوان خانے میں جہاں بڑی بیگم افیون کا سُلفہ لیے بیٹھی رہتی ہیں۔ اور میں ان سب کو اپنا بچہ اور اپنی صورت دکھاؤں گی۔"
وانگ لنگ نے کبھی اس کی زبان سے اتنی لمبی تقریر نہیں سنی تھی۔ الفاظ اس کی زبان سے آہستہ آہستہ مگر مسلسل نکلتے گئے۔

—— اور تب کہیں ان حضرت کی سمجھ میں آیا کہ وہ عرصے سے من ہی من میں یہ منصوبے باندھ رہی ہے۔ کھیت میں اس کے ساتھ کام کرتے کرتے اس نے یہ ساری اسکیم تیار کی تھی! عورت کیا یہ تو ایک عجائب گھر ہے! - وانگ لنگ نے تو سوچا تھا کہ یہ عورت دن رات گھر بار کے کام میں ایسی مشغول رہتی ہے کہ بچّے کی فکر کرنے کی مہلت اسے ملتی ہی نہیں۔ مگر اب دیکھو کہ وہ بچّے کو سرتاپا ملبوس اور اپنے آپ کو نیا کوٹ ڈٹائے ٹہلتے ہوئے دیکھ رہی ہے! - پہلی مرتبہ میاں وانگ لنگ سٹّی بھولے اور وہ چلم میں تمباکو بھرتے رہ گئے۔

پھر اس نے کچھ تنک کر پوچھا: "ان اللّے تللوں کے لیے تمھیں کچھ دام بھی تو چاہئیں؟"

اولان نے ڈرتے ڈرتے کہا: "اگر تم مجھے تین روپیہ دے سکو۔ یہ بڑی رقم ہے لیکن میں نے سب حساب لگا لیا ہے اور ایک پیسہ بھی ضایع نہ ہونے پائے گا۔ کپڑے والے سے میں ایک ایک تار وصول کرلوں گی۔"

وانگ لنگ نے بٹوے میں ہاتھ ڈالا۔ کل ہی اس نے پچھم کے کھیت کی باؤلی کے ڈیڑھ گٹھر سرکنڈے شہر کے بازار میں بیچے تھے اور بٹوے میں تین سے زیادہ رُپے کھنک رہے تھے۔ اس نے چاندی کے تین ڈالر میز پر رکھ دیے۔ کچھ جھجھک کے بعد اس نے ایک چوتھائی سکہ بھی نکال کر رکھ دیا جسے وہ عرصے سے چھپائے ہوئے تھا کہ کبھی جی چاہا تو چائے خانے میں بازی لگائے گا۔ لیکن

وہاں وہ میزوں کی گردش اور کھڑکھڑاتے ہوئے بانسوں کے تماشے کے سوا اور کچھ نہ کر سکتا، سہم کر رہ جاتا کہ کہیں ہار نہ بیٹھے۔ فرصت کی گھڑیاں وہ داستاں گو کی دکان میں کاٹتا جہاں اس کی جھولی میں اِکنّی ڈال کر کوئی بھی ایک پرانی کہانی سن سکتا تھا۔

"تم یہ روپیہ بھی رکھ لو"۔ کاغذ کی بتّی سے پھرتی سے چلم سلگاتے ہوئے اس نے کہا۔ "ریشم کی کترن مل جائے تو اس کا کوٹ بنا دینا۔ آخر یہ پہلا بچّہ ہے!"

اولان نے فوراً یہ رُپے نہ اُٹھائے۔ انھیں دیر تک دیکھ کر اس نے منہ ہی منہ میں کہا۔

"زندگی میں پہلی مرتبہ میں چاندی چھو رہی ہوں!"

یہ کہ کر اس نے جھٹ پٹ وہ رُپے مٹھی میں چھپالیے اور خوابگاہ میں چلی گئی۔

وانگ لنگ دھنوئیں کے بادل اڑاتے ہوئے چاندی کے ان سکّوں کا تصور کرنے لگا۔ یہ چاندی زمین سے نکلی تھی — اسی زمین سے جسے وہ بوتا اور کھودتا تھا۔ اس کی زندگی اسی مٹّی سے عبارت ہے۔ خون اور پسینہ ایک کر کے وہ اس سے غذا حاصل کرتا ہے اور یہ غذا چاندی میں بدلتی ہے۔ اس سے پہلے کسی کو چاندی دیتے ہوئے اسے یہ محسوس ہوتا کہ جسم کی بوٹی کاٹ کر دے رہا ہے۔ لیکن آج اسے چاندی لُٹا کر کوئی افسوس نہ ہوا۔ یہ چاندی شہر کے کسی بیوپاری کے ہاتھ میں نہیں جا رہی تھی۔ بلکہ وانگ لنگ نے دیکھا کہ وہ پگھل کر اس کے بیٹے کے لباس کی صورت میں مبدّل

ہوگئی ہے۔ اور اس کی اس عجیب وغریب بیوی نے ، جو بے کہے سنے کام کیے جاتی ہے اور گویا ہمیشہ آنکھیں بند رکھتی ہے —— ہاں اسی کے تخیّل نے اس کے بیٹے کو جامہ زیب کیا ہے۔

جب تنت کا موقع آیا تو اولان نے کسی کو اپنے پاس نہ رہنے دیا۔ ابھی سورج غروب ہو ہی رہا تھا کہ یہ واقعہ پیش آیا۔ وہ شوہر کے ساتھ کھیت میں کام کرنے گئی تھی۔ گیہوں کی فصل کٹ چکی تھی ، اور اس کی جگہ دھان کے پودے لہلہا رہے تھے۔ ان کی کونپلیں بھری پوری تھیں اور گرما کی برسات وآغاز خزاں کی شاداب انگیز دھوپ نے ان کی پور پور کو نہال کر دیا تھا۔ دن بھر وہ دونوں جُھکے جُھکے ہنسیوں سے کٹائی کیا کرتے۔ بچّے کے بوجھ کے سبب سے وہ بمشکل جھک سکتی تھی اور اس کا ہاتھ بھی تیزی سے نہ چل سکتا تھا۔ اس لیے وانگ لنگ آگے نکل گیا تھا اور وہ پیچھے تھی۔ جیسے جیسے دھوپ ڈھلتی گئی اس کی رفتار سست پڑتی گئی۔ وانگ لنگ بے صبری سے اسے دیکھ دیکھ کر رہ جاتا تھا۔ شام کے لگ بھگ کام روک کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ہنسیا اس کے ہاتھوں سے گر پڑا۔ اس کے چہرے سے پسینہ چھوٹ رہا تھا —— ایک نئے کرب کا پسینہ۔

اولان نے کہا : ” وہ مہورت آگئی۔ میں گھر جا رہی ہوں۔ جب تک میں نہ بلاؤں تم نہ آنا۔ البتّہ ایک نیا سرکنڈا چھیل کر مجھے دے جانا تاکہ اس سے میں بچّے کی نال کاٹ دوں۔ “

وہ کھیتوں سے ہو کر اس طرح گھر کی طرف چلی گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ جب وہ نظر سے غایب ہوگئی تو وانگ لنگ اوپری کھیت کی

باؤلی کے کنارے گیا اور ایک پتلا سا ہرا سرکنڈا چن کر احتیاط سے اسے چھیلا اور ہنسیے کی دھار سے اسے چیر دیا۔ خزاں میں شام کی سیاہی فوراً گہری ہو جاتی ہے۔ سو وہ ہنسیا اٹھا کر گھر چل دیا۔

وہاں پہنچ کر کیا دیکھتا ہے کہ میز پر گرما گرم کھانا چنا ہوا ہے اور بڑے میاں بھکر بھکر کھا رہے ہیں۔ اس مرحلے کے دوران میں بھی وہ کھانا پکانا نہ بھولی تھی! دل ہی دل میں وہ بولا کہ ایسی عورتیں دنیا میں بہت کم ہوں گی۔ خواب گاہ کی چوکھٹ پر جا کر وہ پکارا: "یہ رہا سرکنڈا!"۔

وہ اس انتظار میں کھڑا رہا کہ اولان اسے اندر بلائے گی۔ لیکن نہیں۔ وہ اٹھ کر دروازے تک آئی اور دراز سے ہاتھ نکال کر سرکنڈا لے لیا۔ اس نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا لیکن وہ کسی ایسے جانور کی مانند ہانپ رہی تھی جو دور سے دوڑ کر آیا ہو۔

بڈھے نے رکابی سے سر اٹھا کر کہا: "کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے"۔ اور پھر وہ یوں مخاطب ہوا: "گھبرانے کی بات نہیں —— اس میں ابھی دیر لگے گی۔ جب میرے گھر پہلا بچہ ہوا تو ساری رات بیت گئی تھی۔ سوچنے کی بات ہے کہ میں نے اور تیری ماں نے جتنے بچے پیدا کیے —— پندرہ یا بیس، ٹھیک سے اب یاد بھی نہیں —— ان میں سے لے دے کر ایک تو رہ گیا ہے! ۔ اب تیری سمجھ میں آیا کہ عورت کو کیوں لگاتار بچے پیدا کرنا چاہئیں؟"۔ لیکن ٹیپ کا یہ بند اس نے یوں دہرایا گویا ابھی اس کے خیال میں آیا ہے:

کل اس وقت تک میں ایک پوتے کا دادا ہوں گا یہ کہ کر وہ بے تحاشا

ہنسنے لگا اور کھانا چھوڑ کر اس اندھیری کوٹھری میں دیر تک بیٹھا کھکھلاتا رہا۔
لیکن وانگ لنگ دروازے سے کان لگائے ہانپنے اور کانکھنے کی آوازیں سنتا رہا۔ درار سے گرم خون کا بھپارا سا آیا، اور اس کی بو ایسی کریہہ تھی کہ وہ سراسیمہ ہو گیا۔ عورت اب جلدی جلدی اور زور زور سے ہانپ رہی تھی۔ گویا کوئی زیر لب کراہ رہا ہو — تاہم وہ آواز سے نہ چلاّئی۔ اب اس کے لیے یہ ناقابل برداشت ہو گیا اور وہ کمرے میں گھسنا ہی چاہتا تھا کہ تیر کی طرح ایک چیخ باہر نکلی اور وہ سب شدھ بدھ بھول گیا۔
عورت کی بات نہ پوچھ کر وہ بے صبری سے پکار اٹھا: "کیا وہ لڑکا ہے؟" جواب میں مسلسل چیخوں کا ایک سیلاب سا باہر نکلا۔ لیکن وانگ لنگ وہی رٹ لگائے گیا: "کیا لڑکا ہے؟ مجھے بس یہی بتا دو۔"
اور عورت کا جواب بھٹکی ہوئی صدائے بازگشت کی طرح آیا:
"ہاں لڑکا!"
یہ سن کر وانگ لنگ کرسی سے جا لگا۔ یہ سب کتنی جلدی ختم ہو گیا! کھانا کبھی کا ٹھنڈا ہو چکا تھا اور بڑے میاں کی پیٹھ تخت سے لگ چکی تھی! مگر یہ تو جادو کا کھیل ہو گیا۔ وانگ لنگ نے باپ کا کاندھا جھنجھوڑا۔ اور گویا فتح کا ترانہ گاتے ہوئے چلاّیا: "لڑکا ہے لڑکا! میں اس کا باپ ہوں اور تم اس کے دادا!"
بڈھا ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور اسی انداز سے ہنسنے لگا جس طرح ہنستے ہنستے اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا ـــــ مرد ہی مرد ـــــ نر ہی نر۔ اور میں ہوں اس کا دادا۔" اور اسی طرح ہنستے ہنستے وہ دوبارہ سو گیا۔

باسی چاولوں کی رکابی اٹھا کر وانگ لنگ کھانے لگا۔ یک بیک اسے شدّت کی بھوک محسوس ہوئی اور نوالے اس کے گلے میں اٹکنے لگے۔ کمرے کے اندر سے عورت کے اِدھر اُدھر پھرنے کی آواز آرہی تھی اور بچّہ گلا پھاڑ کر لگاتار رو رہا تھا۔

وانگ لنگ خود بخود فخریہ بول اٹھا: "اب اس گھر سے سنسان پن اور سکون اُٹھ گیا!"

پیٹ بھر کھا کر جب وہ چوکھٹ پر گیا تو اولان نے اسے اندر آنے کو کہا۔ ہوا اب بھی گرم خون کی بو سے لبی ہوئی تھی، لیکن لکڑی کے تسلے کے علاوہ اور کہیں اس کا نشان نہ تھا۔ اسے بھی پانی سے کھنگال اس نے پلنگ کے نیچے سرکا دیا تھا۔ تاکہ کسی کی نظر نہ پڑے۔ سرخ موم بتّی روشن کر دی گئی تھی اور زچہ سفید چادروں میں لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے بغل میں بچّہ پڑا ہوا تھا اور اس علاقے کے رواج کے مطابق وہ باپ کے پرانے پاجامے سے ڈھکا ہوا تھا۔

وانگ لنگ ان کے قریب گیا اور کچھ دیر کے لیے دم بخود رہا۔ اس کا دل بلّیوں اچھلنے لگا، اور وہ جُھک کر بچّے کو دیکھنے لگا۔ اس کے گول چہرے پر جُھرّیاں تھیں اور ماتھے پر لمبے اور گیلے کالے بال پھیلے ہوئے تھے۔ وہ رونا بند کر کے آنکھیں میچے سو رہا تھا۔

میاں بیوی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس کے بال،

اب بھی دردِزہ کے پسینے سے نم تھے اور آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ اس کے سوا اس میں تغیّر نہ ہؤا تھا۔ لیکن اسے اس حال میں دیکھ کر وانگ لنگ کا دل بھر آیا۔ اس کا سینہ ان دونوں کی محبّت سے لبریز تھا اور جب اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ ایسے موقع پر کیا کہے تو وہ بولا:

"کل میں شہر سے آدھ سیر لال شکر خرید لاؤں گا اور گنگنے پانی میں اسے گھول تمھیں پلاؤں گا۔"

جب بچّے کو اس نے دوبارہ دیکھا تو یہ اعلان یک بیک اس کی زبان سے نکلا: "ہمیں ٹوکری بھر انڈے خریدنا اور گانو بھر کے لیے انھیں لال رنگ میں رنگنا ہی۔ ورنہ گانو والوں کو کیسے معلوم ہوگا کہ میرے گھر بیٹا ہؤا ہی!"



باب ۔۴

دوسرے دن زچّہ بستر سے اٹھ بیٹھی اور چولھے چکّی کی فکر میں لگ گئی ۔ لیکن وہ وانگ لنگ کے ساتھ کھیت نہ گئی ۔ دوپہر تک وہ اکیلے کام کرتا رہا اور پھر نیلا لبادہ پہن کر شہر روانہ ہوا ۔ بازار سے اس نے پچاس انڈے اکنّی انڈے کے حساب سے خریدے اور لال کاغذ بھی مول لیا جسے پانی میں ابال کر انڈوں کو رنگنا تھا ۔ انڈوں کی ٹوکری اٹھائے وہ حلوای کی دوکان پر گیا ۔ اور آدھ سیر سے کچھ زیادہ لال شکر خریدی ۔ احتیاط سے اسے کاغذ میں لپیٹ کر حلوای اس میں ایک سرخ پرچہ رکھنا اور مسکرانا نہ بھولا ۔

"شاید یہ کسی زچّہ کا سامان ہے ؟"

وانگ لنگ نے فخر سے جواب دیا : "پہلے بیٹے کی ماں کے لیے ۔"

"خدا سلامت رکھے" ۔ حلوائی نے لاپروائی سے کہا کیونکہ اس کی آنکھ ایک فوق البھڑک گاہک پر لگی ہوئی تھی ۔

حلوائی یہ جملہ تقریباً ہر روز کسی نہ کسی گاہک سے دوہرایا کرتا تھا ۔ لیکن وانگ لنگ اسے التفات خاص سمجھ کر خوش ہو گیا اور اسے جھک جھک کر سلام کرتے ہوئے دکان سے باہر نکلا ۔ اس گرد آلود سڑک اور جھلستی ہوئی دھوپ میں چلتے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ دنیا میں ایک میں ہی نصیبے ور ہوں ۔

پہلے تو اس خیال سے وہ مسرور ہوا لیکن یک بیک اس کا

کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ زندگی خوشیوں کا بار نہیں اٹھا سکتی۔ زمین و آسمان بد خو بھوت پریتوں سے بھرے ہوئے ہیں اور انھیں انسانوں — خصوصاً غریبوں کی راحت سے کدہے۔ وہ فوراً موم بتّی والے کی دکان میں گیا اور اپنے گھر کے چار آدمیوں کے لیے چار عود بتیاں خریدیں۔ انھیں وہ دھرتی ماتا، کے مندر میں لے گیا اور اُن سوراخوں میں جہاں اپنی بیوی کے ساتھ وہ اگربتّی کھونس گیا تھا، انھیں سلگا آیا۔ جب وہ مہک اٹھیں تو وہ اطمینان کی سانس لے کر گھر کی طرف روانہ ہوا۔ یہ دو چھوٹے چھوٹے بت بھی کیسے قادر مطلق تھے!۔

چند روز بعد ہی 'اولان' اپنے شوہر کے ساتھ کھیتوں میں کام کر رہی تھی۔ فصل کٹ چکی تھی اور اسے وہ آنگن میں گاہ رہے تھے دھان کی گہائی کے بعد وہ اسے بانس کے ٹوکروں میں بھر کر پھوڑتے اناج کے دانے الگ فرش پر جمع ہوتے جاتے اور بھُس ہوا میں اُڑ جاتا۔ اس کے ساتھ سرما کی فصل کے لیے کھیت میں گیہوں بونا تھا۔ جب بیل کو ہل میں جوت کر کھیت کی گردش کرتا تو عورت کھرپا لیے پیچھے پیچھے چلتی اور باہوں کے ڈھیلے توڑتی جاتی۔

وہ دن بھر کام کرتی اور بچہ وہیں ایک پھٹی ہوئی دُلائی پر سوتا رہتا۔ جب وہ روتا تو ماں کام روک کر قریب جاتی اور اپنا پستان اس کے منہ میں دے کر زمین پر بیٹھ جاتی۔ سورج دونوں پر چمکتا ہوتا — اختتام خزاں کا من مارا سورج جو سردیوں کی آمد سے پہلے اپنی گرمی سے دست بردار نہ ہونا چاہتا تھا — ماں بیٹے مٹی کی طرح

بھورے تھے اور معلوم ہوتا کہ دونوں مٹّی کے پتلے ہیں۔ کھیتوں کی دھول عورت کے بالوں اور بچّے کی نرم نرم لٹوں میں اٹی ہوتی تھی۔

ماں کے بھرے بھرے پستانوں سے بچّے کے لیے برف کے سے سفید دودھ کی دھار پھوٹ نکلتی۔ جب بچّہ ایک طرف کا دودھ پیتا تو دوسری طرف کا دودھ فوّارے کی طرح بہنے لگتا۔ حالانکہ بچّہ پیٹو تھا مگر اولان کے سینے میں دودھ کی افراط تھی اور اسے اس بہتات کا ایسا احساس تھا کہ لاپروائی سے اسے بہنے دیتی تھی۔ ہمیشہ یہاں دودھ کا کنڈ بھرا ہوتا تھا۔ کبھی تو وہ اپنے کپڑوں کی حفاظت کے لیے سینہ کھول کر دودھ زمین پر گرا دیتی اور کھیت کے اتنے حصّے میں ایک نرم و نم نشان بن جاتا۔ بچّہ موٹا تازہ اور ہنس مکھ تھا اور اپنی ماں کی دی ہوئی نعمت سے جی کھول کر سیراب ہوتا تھا۔

جب سردی آئی تو یہ اس کے مقابلے کو تیّار تھے۔ کبھی ایسی اچّھی فصل نہ ہوئی تھی اور ان کا چھوٹا سا گھر مالا مال تھا۔ چھت کی شہتیروں سے پیاز اور لہسن کی گٹیاں قطار در قطار لٹک رہی تھیں اور تینوں کمروں میں تلے اوپر ٹوکرے گیہوں چاول سے بھرے پڑے تھے۔ اس میں سے بہت کچھ فروخت کیا جا سکتا تھا لیکن وانگ لنگ آدمی جُزرس تھا۔ دوسرے کسانوں کی طرح نہ تو وہ جوا کھیلتا نہ نا و نوش پر دولت اڑاتا۔ اسی لیے مندے زمانے میں اسے غلّہ بیچنے کو مجبور نہ ہونا پڑتا تھا۔ وہ منتظر رہتا کہ برف باری یا نوروز کا دن آئے تو شہر میں غلّے کے اچھے دام کھڑے ہو سکیں۔

اس کا چچا تو اکثر کھڑی فصل بیچ دیا کرتا تھا۔ کٹائی اور گہائی کی زحمت سے بچنے اور مُٹھی گرم کرنے کے لیے وہ ایسا کرتا۔ بات یہ تھی کہ اس کی چچی جو مُٹاپے میں زیادہ اور عقل میں کم اور کاہل محض تھی، ایک ہی چٹوری تھی۔ وہ ہمیشہ بھانت بھانت کے پکوان اڑاتی اور بازار سے گھر بھر کے لیے نئے نئے سامان لاتی۔ وانگ لنگ کی بیوی گھر بھر کے لیے اپنے ہاتھ سے جوتے بنا لیتی۔ اگر وہ جوتے کے لیے پیسے مانگتی تو وانگ لنگ یقیناً بھوچکّا ہو جاتا!۔

چچا کے بے مرمّت مکان کے شہتیر سے کوئی چیز لٹکتی نہ نظر آتی۔ لیکن وانگ لنگ کی چھت سے سور کی ایک ٹانگ لٹک رہی تھی۔ یہ اس نے اپنے پڑوسی چِنگ سے خریدی تھی چِنگ نے جب دیکھا کہ اس کے سور کو شاید کوئی بیماری لگ گئی ہے تو فوراً اسے چھری کے گھاٹ اتار دیا۔ خیر سے سور کو سوکھا نہ لگا تھا اور ران خاصی بھری بھری تھی۔ اولان نے اچھی طرح نمک لگا کر اسے رکھ چھوڑا تھا۔ دو مرغیاں بھی اسی طرح نمک بھر کر پر سمیت رکھ دی گئی تھیں۔

اس سازوسامان سے وہ سر جوڑے گھر میں بیٹھے تھے کہ کہ شمال و مشرق کے ریگستان کی جان لیوا سرد ہوائیں چلنے لگیں۔ اب تو بچہ بیٹھنے کے قابل ہو جائے گا۔ اس کی ماہ گرہ کے موقع پر وانگ لنگ نے سویّوں کی دعوت کی کیونکہ یہ عمر درازی کا شگون ہے۔ ان سب کو اس نے مدعو کیا جو اس کی شادی میں

آئے تھے اور ہر ایک کو دس دس رنگین انڈے دیے ۔ گانوں سے جو لوگ اسے مبارکباد دینے آئے تھے انھیں اس نے دو دو انڈے دیے ۔ سب نے بچّے کو جی بھر کر سراہا کیونکہ وہ موٹا تازہ تھا اور اس کے گول مٹول منہ پر ماں کی طرح گال کی ہڈّیاں ابھری ہوئی تھیں ۔ اب جو سردیوں کا زمانہ تھا تو اسے باہر کھیت میں ڈالنے کے بدلے انھوں نے دُلائی فرش پر بچھا دی تھی اور بچّہ اس پر پڑا رہتا تھا ۔ جنوب کا دروازہ دھوپ کے لیے کھلا رہتا اور شمال کی ہَوا گھر کی موٹی موٹی دیواروں سے ٹکرا کر باہر ہی رہ جاتی ۔

کھیت کے کھجور کے پیڑ اور کھیت کے بید مجنون اور سیب کے درختوں کی سب پتیاں گر گئی تھیں ۔ صرف بانس کی پتیاں وفادار ثابت ہوئیں اور گو ہَوا کے جھونکے بانس کی ٹہنیوں کو مروڑ دیتے مگر پتیوں کو نہ نوچ سکتے تھے ۔

یہ سوکھی ہَوا گیہوں کے انکروں کو کیونکر پنپنے دیتی ۔ وانگ لنگ بے صبری سے بارش کا انتظار کرنے لگا ۔ اور ایک دن جب ہَوا تھم گئی تھی تو چھینٹا پڑا وہ سب ممنون و مسرور گھر کے اندر بیٹھے بارش کا نظارہ کر رہے تھے ، موسلا دھار بارش کھیتوں کو نہال کر رہی تھی اور پھاٹک کے باہر ٹپک رہی تھی ۔ بچّہ حیرانی کے عالم میں پانی کی رُپہلی دھار کو اپنے ننھے ہاتھوں میں پکڑنے کی کوشش کرتا اور کھکھلا پڑتا تھا ۔ اس کے ساتھ سب لوگ ہنستے جاتے تھے ۔ اور بڑے میاں بچّے کے ساتھ فرش پر بیٹھے بیٹھے کہنے لگے : پانچ پانچ کوس تک چراغ لے کر ڈھونڈو ایسا بچّہ نہ ملے گا ۔

میرے بھائی کے دہ بیٹے تو بالکل سانڈ ہیں۔"

کھیتوں میں گیہوں کی کیاریاں سرسبز و شاداب ہو کر زمین کے اندر سے سر نکال کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔

اب سیر سپاٹے اور گپ بازی کا دور شروع ہوا۔ کیونکہ ہر کسان کو اس امر کا احساس تھا کہ قدرت اس کے کھیت کو پانی دے رہی ہے اور اس کی سنچائی کے لیے ڈول اور کانور کے بارے اس مرتبہ کمر دہری نہیں کرنی پڑے گی۔ لہٰذا ہر صبح وہ ننگے پانو موم جامے کی بڑی بڑی چھتری تانے پگڈنڈیوں سے ہوتا ہوا کبھی یہاں کبھی وہاں جائے پیتا مٹرگشت کرنے لگا۔ عورتیں گھر سے باہر نہ نکلیں اور اگر وہ کفایت شعار ہوتیں تو جوتے بناتے پا پھٹے کپڑوں کی بخیہ گری کرتے ہوئے نوروز کے جشن کی تیاری دل ہی دل میں کرتیں۔

مگر وانگ لنگ اور اس کی بیوی کو زیادہ آمد و رفت ناپسند تھی۔ گانو بھر میں شاید ہی دو چار گھر ایسے ہوں جن میں ان کے گھر کی سی رونق اور برکت ہو۔ اور وانگ لنگ کو یہ کھٹکا لگا رہتا کہ اگر اس نے زیادہ میل جول بڑھایا تو کوئی قرض نہ مانگ بیٹھے۔ نئے سال کی آمد آمد تھی اور کس مائی کے پوت کے پاس جوڑے توڑے اور جشن کا سامان تھا؟ چنانچہ وہ گھر میں اپنا وقت گزارتا۔ اولان سینا پرونا کرتی اور وہ بانس کی جھانپیوں کی مرمت میں لگا رہتا۔ جن کی رسی ٹوٹی ہوتی۔ ان میں اپنے کھیت کے اُگے ہوئے پٹ سن کی رسی پروتا، اور جہاں ضرورت ہوتی وہاں ایک نیا دوشاخہ اٹکاتا۔

اگر مرد کھیت کے اوزاروں کی فکر میں رہتا تو اولان گھر گرہستی کے سامان کا جتن کرتی۔ اگر کسی ہانڈی میں سوراخ ہو جاتا تو دوسری

عورتوں کی طرح اسے پھینک کر وہ نئی ہانڈی کی تلاش نہ کرتی بجائے اس کے وہ مٹی سے سوراخ بند کر کے اسے ہولے ہولے آگ دکھاتی اور وہ پھر کام دینے لگتی۔

وہ دونوں گھر میں بیٹھے بیٹھے ایک دوسرے کی سنگت کا لطف اٹھاتے، حالانکہ ان کی تقریر کا سلسلہ بہت مختصر ہوتا، مثلاً "تم اگلی فصل کے لیے بیج جمع کرنا تو نہیں بھول گئے؟" یا ہم پرال بیچ کیوں نہ دیں؟ تلی کے ڈنٹھل ایندھن کے لیے کافی ہیں"۔ گاہے گاہے وانگ لنگ اگر اس قسم کی بات کرتا: سوئیاں مزے کی ہیں"۔ تو اولان جواب دیتی: "تعریف اپنے کھیت کے گیہوں کی کرو"۔

فصل ایسی اچھی ہوئی تھی کہ بکری کے بعد سب دے دلا کر بھی، وانگ لنگ نے کچھ رُپے بچا لیے۔ انھیں نہ تو وہ بٹوے میں رکھنا چاہتا تھا اور نہ اپنی بیوی کے سوا کسی کو اس کی خبر ہونے دینا چاہتا تھا۔ دونوں نے یہ رقم چھپانے کی ترکیب سوچی۔ اولان نے خواب گاہ کی دیوار میں پلنگ کے پیچھے سوراخ کیا، اور وانگ لنگ نے اس میں یہ سکے چھپا کر پھر اس طرح دیوار چن دی کہ کوئی تمیز نہ کر سکتا تھا۔ اس کے بعد دونوں ایک قسم کا مخفی سرور محسوس کرنے لگے۔ وانگ لنگ ہمیشہ اس خیال میں مگن رہتا کہ اس نے کچھ رُپے پس انداز کر لیے ہیں۔ اور جب وہ یار دوستوں میں ہوتا تو سینہ تان کر چلتا۔



باب ۔ ۵

نوروز قریب تھا اور گانوں کے ہر گھر میں اس کی چہل پہل تھی۔ شہر جاکر چراغ والے کی دکان سے وانگ لنگ نے سرخ کاغذ کے تاؤ خریدے جن پر پہلی روشنائی سے مسرت اور امارت کی دعائیں لکھی ہوئی تھیں۔ انھیں اس نے کھیت کے ہل بکھر پر چسپاں کیا تاکہ نیا سال اس کے لیے مبارک ثابت ہو۔ پھر اس نے گھر کے دروازوں پر لال کاغذ کی لمبی پٹّیاں چپکائیں۔ جس پر برکت کی دعائیں تحریر تھیں۔ پھاٹک پر اس نے کاغذ کے پھول بڑی نفاست سے کاٹ کر لگائے۔ یہی نہیں، بلکہ وہ دیوتاؤں کے لیے بھی لال کاغذ لانا نہ بھولا۔ بڑے میاں نے ہاتھوں کی کپکپی کے باوجود احتیاط سے ان کا جوڑا تراشا اور وانگ لنگ دھرتی ماتا کے مندر کے دیوتاؤں کے تن پر انھیں چڑھا آیا اور نئے سال کی تقریب میں انھیں لوبان کی دھونی بھی دے آیا۔ گھر کے لیے وہ دو لال موم بتیاں لایا جو نئے سال کے موقع پر ایک دیوتا کی تصویر کے سامنے جلائی جائیں گی، جو نچلے کمرے کی دیوار پر لٹکی ہوئی تھی۔

دوبارہ شہر جاکر وانگ لنگ نے سور کی چربی اور سفید شکر خریدی۔ اولان نے چربی صاف کر کے، چاول اپنے خراس میں پیسے جسے بیل چلاتا تھا، اور اس میں شکر اور چربی ملا کر نئے سال کے

وہ کلیچے بنائے جو "مہتابی کلیچے" کہلاتے اور ہوانگ کی حویلی میں کھائے جاتے تھے ۔

جب یہ کلیچے تیار ہو کر تندور میں گرم ہونے کے لیے میز پر چُنے گئے ، تو وانگ لنگ کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا ۔ گانوں کی کوئی عورت ایسے کلیچے نہ بنا سکتی تھی کیونکہ یہ نعمت صرف امیروں کے دستر خوانوں پر چُنی جاتی تھی ۔ بعض کلیچوں میں پستے اور بادام کی ہوائی دی گئی تھی ۔

وانگ لنگ نے کہا: "یہ ایسے خوب صورت ہیں کہ انھیں کھانے کی بجائے دیکھا ہی کریں ۔"

بڈھا میز کے اردگرد اچکتا ہوا ، چمکتے ہوئے رنگوں کو دیکھ دیکھ کر بچّوں کی طرح اچھل رہا تھا ۔ اس نے کہا :

"میرے بھائی اور اس کے بیٹوں کو بلا لاؤ ۔ ذرا وہ بھی تو دیکھیں" ۔

مگر خوشحالی نے وانگ لنگ کو محتاط بنا دیا تھا ۔ روٹی کے بھوکوں کو کلیچا کون دکھائے ۔

اس نے فوراً جواب دیا کہ : " نوروز کے پہلے کلیچوں کو دیکھنا بُرا شگون ہے ۔"

اور اولان نے جس کے ہاتھ آٹے اور چربی میں سنے ہوئے تھے کہا:

" ان ایک دو سادہ کلیچوں کو چھوڑ کر جو مہمانوں کے لیے ہیں ، باقی ہمارے کھانے کے لیے نہیں ہیں ۔ ہمارا ہیاؤ کہاں کہ چربی اور سفید شکر کھا سکیں ۔ وہ میں نے اُس حویلی کی بڑی بیگم کے لیے تیار کیے ہیں ۔ نوروز کے دوسرے دن بچّہ اور کلیچے لے کر میں

اُن کی خدمت میں جاؤں گی۔"

اب تو ان کلچوں کی قیمت بہت بڑھ گئی۔ وانگ لنگ بہت خوش ہوا کہ اُس دیوان خانے میں جہاں وہ مسکینوں اور محتاجوں کی طرح داخل ہوا تھا، اب اس کی بیوی ملاقات کے لیے جائے گی۔ اس کی گود میں سجا بنا بچہ اور ہاتھ میں کلچوں کی ڈالی ہوگی جنھیں اس نے بہترین آٹے، شکر اور چربی سے بنایا ہے۔

اس ملاقات کے مقابلے میں نوروز کا جشن پھیکا معلوم ہونے لگا۔ اولان نے اس کے لیے روئی کا جو نیا کالا کوٹ بنایا تھا، اسے پہن کر وہ سوچنے لگا:

"انھیں حویلی کے پھاٹک تک چھوڑنے کے لیے جب جاؤں گا تو اسے پہنوں گا۔"

نئے سال کا پہلا دن اس نے اُن سنے پن سے گزارا۔ چچا اور پڑوسی کھا پی کر مست، ہا ہو کرتے اسے اور اس کے باپ کو مبارکباد دینے آئے۔ وانگ لنگ نے رنگین کلچے چھپا دیے کہ کہیں یہ ایرے غیرے ان پر ہاتھ صاف نہ کر بیٹھیں۔ لیکن جب سادہ کلچوں کو چکھ کر وہ سب ان کی خستگی اور عمدگی کی تعریف کرنے لگے تو وانگ لنگ بڑی مشکل سے یہ کہنے سے اپنے کو روک سکا کہ: "کاش تم نے رنگین کلچے چکھے ہوتے؟"

لیکن اس نے اپنے کو ضبط کیا کیونکہ اس حویلی میں آن بان سے داخل ہونے کی خواہش اور بھی زبردست تھی۔

نئے سال کا دوسرا دن عورتوں کی ملاقاتوں کے لیے مخصوص تھا۔

کیونکہ پہلے دن مردخوب کھلائی پلائی کر چکے تھے۔ چنانچہ صبح ہوتے ہی عورت نے بچّے کو سرخ کوٹ، شیر چہرہ جوتے اور بدھ کے تاج والی ٹوپی پہنائی۔ وانگ لنگ نے جھٹ پٹ اپنا چولا بدلا۔ اِدھر اس کی بیوی نے اپنے لمبے بالوں میں دوبارہ کنگھی کی اور ان میں وہ رپہلی ہیرپن کھونسی جو وانگ لنگ اس کے لیے خرید لایا تھا۔ پھر اس نے نیا کالا کوٹ پہنا، جو اُسی تھان سے بنایا گیا تھا جس سے اس کے شوہر کا کوٹ۔ سب ملا کر جو بیس گز کا تھان تھا جس کے ساتھ دستور کے مطابق سوداگر نے دو گز پُروتی کا ٹکڑا بھی کاٹ دیا تھا۔ وانگ لنگ نے بچّے کو گود میں اُٹھایا اور اولان نے کلیچوں کی ٹوکری سنبھالی۔ اس طرح ان کی سواری کھیتوں کی ڈگروں سے ہو کر چلی جو سردی کے کارن اب اُجاڑ پڑی تھیں۔

'ہوانگ' کی حویلی کے صدر پھاٹک پر وانگ لنگ کو پہلا انعام ملا۔ کیونکہ عورت کی آواز سن کر جب دربان باہر آیا تو انھیں وہ آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ اپنے مسے کے تین لمبے بالوں کو سہلا کر وہ بولا:

"اوخوہ وانگ کسان ــــ میاں، ایک سے تم تو تین ہو گئے!"

پھر ان کے نئے لباسوں اور ننھے بیٹے کو غور سے دیکھ کر اس نے کہا:

"پچھلا سال تمھارے لیے ایسا مبارک تھا کہ اس سال مبارکبادی کی ضرورت نہیں رہی۔"

وانگ لنگ نے اس لاپروائی سے جو کوئی اپنے سے ادنیٰ کے لیے برتتا ہے جواب دیا: "اچھی فصل ــــ خوشحالی ــــ" اور وہ

خود اعتمادی کے ساتھ پھاٹک کے اندر داخل ہوگیا۔

دربان خاصا مرعوب ہُوا اور وانگ لنگ سے کہا:

"تم میرے غریب خانے میں بیٹھو۔ تمھاری بیوی اور بیٹے کو میں محل میں لے جاتا ہوں۔"

وانگ لنگ ٹکٹکی لگائے انھیں دیکھتا رہا کہ ایسے بڑے گھر کی مالکن کے لیے تحفہ لیے جا رہے ہیں - یہ اس کی عزت افزائی نہیں تو کیا ہے۔ جب وہ سب دالانوں کی بھول بھلیوں میں غایب ہو گئے تو وہ دربان کے گھر گیا اور اس کی چیچک رو بیوی کی پیش کی ہوئی جائے احترام پر بیٹھ گیا جو بچلے کمرے کی میز کی بائیں جانب رکھی ہوتی ہے۔ سر کی ایک خفیف سی جنبش کے ساتھ اس نے چائے کی پیالی قبول کی اور اسے چکھا تک نہیں گویا وہ اتنی ردی تھی کہ اس کے گلے کے نیچے اتر نہیں سکتی۔

بڑی دیر کے بعد دربان ماں بیٹے کو لیے ہوئے لوٹا۔ وانگ لنگ نے غور سے عورت کے چہرے کی طرف دیکھا، کیونکہ اب اسے ان اتار چڑھاؤں کو سمجھنے کی عادت ہوگئی تھی، جنھیں وہ پہلے محسوس بھی نہ کرسکتا تھا۔ اولان کے چہرے سے اطمینان صاف نمایاں تھا۔ وانگ لنگ یہ جاننے کے لیے بے تاب ہوگیا کہ حرم میں اِن سے کیا سلوک ہوُا، کیونکہ اب کوئی غرض نہ ہونے کی وجہ سے اس میں قدم نہ رکھ سکتا تھا۔

اس لیے دربان اور اس کی بیوی کو سر کے اشارے سے سلام کرکے اس نے اولان کو آگے کیا اور سوتے ہوئے بچّہ کو

اپنی گود میں لے لیا جو اپنے نئے کوٹ میں سکڑا ہوا پڑا تھا۔

"کیا ہوا؟" اس نے سر پھیر کر اس سے پوچھا کیونکہ وہ پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ اولان کے غبی پن پر وہ ذرا چڑی اور اس نے ذرا پاس آ کر آہستہ سے کہا:

"اگر کوئی مجھ سے پوچھے تو میں قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ اس سال حویلی والوں کا حال ذرا پتلا ہے۔"

یہ جملہ اس نے اس دہشت انگیز انداز میں کہا گویا وہ دیوتاؤں کے بھوکے ہونے کی خبر سنا رہی ہو۔

وانگ لنگ نے کرید کر پوچھا: "اس سے تمھارا کیا مطلب ہے؟" لیکن تیزی اولان کی فطرت کے خلاف تھی۔ وہ الفاظ کو ایک ایک کر کے پکڑتی اور بمشکل باہر نکال سکتی تھی۔

"بڑی بیگم پچھلے سال کا پرانا کوٹ پہنے ہوئے تھیں۔ پہلے کبھی میں نے یہ بات نہیں دیکھی۔ باندیاں بھی نئے لباس میں نہ تھیں" پھر کچھ ٹھہر کر وہ بیان کرنے لگی: "ایک بھی باندی مجھ جیسا نیا کوٹ پہنے ہوئے نہ تھی۔" اور پھر ذرا اٹک کر بولی: "اور اگر ہمارے نونہال کی پوچھو، تو بوڑھے نواب کی خواصوں کے بچوں میں سے ایک بھی رنگ روپ یا نک سک میں اس کے پاسنگ برابر نہیں۔"

ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی اور وانگ لنگ نے زور سے ہنس کر بچے کو اپنے کلیجے سے چمٹا لیا۔ واہ رے میرا کمال — واہ میری سوجھ بوجھ! ابھی وہ خوش خوش ہی تھا کہ یک بیک اس کا دل خوف سے بیٹھ گیا۔ وہ بھی کیسا

احمق ہی کہ کھلے آسمان کے نیچے اپنے پھول سے بیٹے کو لیے جا رہا ہی اور یہ نہیں سوچتا کہ ہوا میں چلنا پھرنا کوئی بھوت اسے نظر لگا دیگا! فوراً اپنے کوٹ کے اندر اس کا سر چھپا کر وہ زور سے باتیں بنانے لگا:

"افسوس کہ ہماری بیٹی کو چیچک لگ گئی اور کوئی اسے نہیں چاہتا۔ ہم تو اس کی موت کی دعا مانگ رہے ہیں۔"

اولان بھی اپنی غلطی کو کچھ کچھ محسوس کر کے جلدی سے بولی:

"آمین، ثم آمین!"

اس احتیاط سے مطمئن ہو کر وانگ لنگ نے اپنی بیوی سے پوچھا:

"تم نے ان کی غربت کا سبب بھی تو معلوم کیا ہوتا۔"

مجھے اس باورچی سے جس کے ہاتھ تلے میں کام کرتی تھی گھڑی بھر باتیں کرنے کا موقع ملا۔ وہ بولا کہ جب پانچ پانچ نواب زادے پردیس میں پانی کی طرح پیسہ بہا رہے ہوں اور اپنی پرانی خواصوں کے جھمکڑے ہر سال گھر بھیج رہے ہوں تو بھلا یہ حویلی کب تک کھڑی رہ سکتی ہی۔ ادھر بڑے نواب ہر سال حرم میں ایک دو نئے اضافے کرتے جاتے ہیں اور بڑی بیگم دن بھر میں اتنی افیم پی جاتی ہیں کہ ان کے مول سے سونے کے دو جوتے بھر جائیں۔"

وانگ لنگ سناٹے میں آ کر بولا: "کیا یہ سب سچ ہی؟"

اولان نے اپنی داستان کا سلسلہ جاری رکھا: "بسنت میں تیسری صاحب زادی کا بیاہ ہی اس کے جہیز سے سارے قید خانے کے قیدی رہا کیے جا سکتے ہیں یا کسی بڑے شہر میں افسری مل سکتی ہی۔

اُن دلاری کو عمدہ سے عمدہ ساٹن کے سوا اور کوئی کپڑا پسند نہیں اور اس پر 'سوچو' اور 'ہانگچو' کی خاص گوٹا کناری ہو۔ ان کی فرمایش ہے کہ شنگھائی کا درزی اپنے کاریگروں کے ساتھ بنفس نفیس یہاں آئے تاکہ ان کے جوڑے بڑے شہروں کی بیگموں سے کم درجے کے نہ ہوں۔"

خرچ کی اس ریل پیل کے خیال سے بیک وقت مسحور اور خائف ہو کر وانگ لنگ نے پوچھا:

"لیکن اس دھوم دھام سے وہ کس سے شادی کرے گی؟"

"شنگھائی کے ایک منصف کے چھوٹے بیٹے کے ساتھ۔"

دیر تک چُپ رہ کر اولان نے کہا: "انھیں روپوں کی ضرورت ہے۔ کیونکہ بڑی بیگم نے بذات خود مجھ سے کہا کہ ہم شہر پناہ کے باہر حویلی کے دکن کی جانب کچھ کھیت بیچنا چاہتے ہیں۔ اس میں ہر سال چاول کی کھیتی ہوتی ہے کیونکہ اس کی زمین بہت اچھی ہے اور خندق سے بآسانی سنچائی کے لیے پانی لیا جا سکتا ہے۔"

اب تو وانگ لنگ کو کوئی شبہہ نہ رہا: "تو یہ کہو کہ وہ زمین بیچنے پر آمادہ ہیں۔ ان کی غربت میں کوئی شک نہیں۔ زمین تو انسان کا گوشت و پوست ہے۔"

پل بھر کچھ سوچ کر یکایک اس نے اپنی کنپٹی کو تھپ تھپایا۔

"مجھے بھی کیا دور کی سوجھی۔" اس نے اولان سے کہا: "ہم یہ زمین خرید لیں!" وہ دونوں ایک دوسرے کی صورت دیکھتے رہ گئے، مرد مسرور اور عورت حیرت زدہ!

اولان نے رُکتے رُکتے کہا: مگر یہ زمین — زمین —"
مرد نے بآواز بلند کہا: "میں اسے خرید کر رہوں گا۔ ہوانگ گھرانے کی جایداد!"
عورت نے حیران ہو کر اعتراض کیا: "وہ بہت دور ہے۔ آنے جانے میں ایک پہر لگ جائے گا۔"
"مگر میں تو یہ کھیت خریدوں گا۔" اس نے اٹھلا کر گویا کوئی بچہ اپنی ماں سے کوئی کھلونا طلب کر رہا ہو۔
اولان نے سمجھا کر کہا: "زمین کے خریدنے سے بہتر کیا بات ہو سکتی ہے۔ دیواروں میں رُپے چننے سے تو یہ ہزار درجہ بہتر ہے لیکن تم اپنے چچا کا کوئی کھیت کیوں نہیں لے لیتے؟ وہ تو اپنے پچھم کے کھیت سے لگی ہوئی پٹی نکالنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔"
وانگ لنگ نے زور سے کہا: "میں تو مرتے دم تک چچا کی زمین مول نہ لوں۔ بیس سال سے وہ کھاد ڈالے بغیر اپنی زمین کا رس چوس رہے ہیں اور اب وہ نری بنجر ہو کر رہ گئی ہے۔ نہیں میں تو ہوانگ کی زمین لینے کا تہیہ کر چکا ہوں۔"
اس نے اس لاپروائی سے ہوانگ کا نام لیا گویا، اس میں اور اس کے پڑوسی چینگ میں کوئی فرق ہی نہ ہو۔ اس انحطاط پذیر، فضول خرچ خاندان سے میں اپنے کو برتر ثابت کروں گا۔ میں ہاتھ میں رُپے کھنکاتے نکلوں گا اور ببانگ دہل للکاروں گا۔
"میں چاندی لے کر آیا ہوں۔ تمھارے کھیت کی قیمت کیا ہے؟"۔
وانگ لنگ بڈّھے ہوانگ سے اپنے مکالمے کا تصور کرنے لگا اور

دل ہی دل میں وہ 'ہوانگ' کے منیم سے بولا : مجھ سے بھی وہی دام لو جو دوسروں کے لیے مقرر کیا ہے۔ میں گرہ میں چاندی باندھ کر نکلا ہوں ۔"

اور اس کی بیوی جو اس اونچے مکان میں باندی گری کرتی آئی تھی، ایک ایسے نامور کی منکوحہ کہلائے گی جو زمین کے ایک ایسے خطّے کا مالک ہوگا جس کے برتے ہوانگ گھرانے کا صدیوں سے نام تھا۔ اب گویا اولان کی سمجھ میں اپنے شوہر کی مصلحت آگئی کیونکہ اپنے اعتراض سے دست بردار ہو کر اس نے کہا:

"تم کہتے ہو تو مجھے بھی کوئی عذر نہیں۔ آخر دھان کا کھیت ہے اور پھر کھائی کے قریب ہے۔ پانی ملنے میں کوئی قباحت نہ ہوگی۔"

اور دوبارہ وہی ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی، جو کبھی چھٹے چھمائے اس کی چھوٹی چھوٹی کالی آنکھوں کی بے حسی کو اُجالتی تھی۔ اور دیر کے بعد اس نے کہا:

"پچھلے سال ان دنوں میں حویلی کی باندی تھی۔"

ان دنوں کی یاد کرتے ہوئے وہ دونوں چپ چاپ گھر کی طرف چلنے لگے ۔



باب-۶

اس قطعۂ زمین کی ملکیت نے وانگ لنگ کی زندگی میں کایا پلٹ کردی۔جب وہ اپنی دیوار سے چاندی کے سکّے نکال کر بڑی حویلی میں بڈّھے نواب سے دو بدو گفتگو کرنے کی عزت حاصل کرنے گیا تو پہلے تو اس کا جی اس طرح کسمایا گویا اپنے کیے پر پچھتا رہا ہی۔جب اسے دیوار کی اس سیندھ کا خیال آیا جو چاندی سے بھری رہتی تھی تو وہ اسے واپس لینے کے لیے بیتاب سا ہوگیا۔اس کھیت کو جوتنے کے لیے ہر روز گھنٹوں پسینہ پانی کرنا ہوگا، اور اولان کا یہ قول بھی غلط نہ تھا کہ وہ گھر سے آدھ میل دور ہی۔یہی نہیں بلکہ اس کا حصول بھی اتنا عزت افزا نہیں جتنا اس نے تصور کیا تھا۔نور کے تڑکے اس نے حویلی کا رخ کیا اور وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ نواب صاحب ابھی خواب گاہ میں ہیں۔یہ سب سچ کہ اب سورج سر پر آنے والا تھا لیکن جب اس نے زور سے کہا کہ:

"نواب صاحب سے کہو کہ میں ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔ ـــ یہ لین دین کا معاملہ ہی"۔ تو دربان نے فوراً جواب دیا کہ

"دنیا کی ساری دولت مجھے سوئے ہوئے شیر کے جگانے کی ترغیب نہیں دلاسکتی۔ وہ اپنی نئی طوائف "چمیلی بائی" کے ساتھ آرام فرما رہے ہیں اور اسے آئے ابھی صرف تین دن ہوئے ہیں۔" اور پھر اس نے اپنے مسّے کے بالوں کو سلجھاتے ہوئے معاندانہ انداز

میں کہا: "اس پھیر میں نہ رہنا کہ چاندی کی کھنکھناہٹ سے وہ جاگ جائیں گے ــــــ وہ تو چاندی کے ہنڈولے میں پروان چڑھے ہیں"!

بالآخر، معاملہ نواب کے منیم سے پٹانا پڑا، جو ایک ہی مُسرتا تھا اور جس کے ہاتھوں سے رُپے گنتے وقت چپکتے تھے۔ اب وانگ لنگ کی سمجھ میں آیا کہ روپیہ زمین سے زیادہ قیمتی ہے۔ چاندی کی چمک کو ہر ایک دیکھ سکتا ہے۔

بہر حال، اب وہ اس اراضی کا مالک تھا۔ فروری کی ایک کہر آلود صبح کو وہ اس کے معائنے کے لیے نکلا۔ یہ کسی کو کانوں کان خبر نہ تھی کہ یہ کھیت اُس کا ہے ــــــ کالی مٹّی کا یہ چوکون کھیت جو شہر پناہ کی کھائی کے متصل پھیلا ہوا تھا۔ وانگ لنگ نے احتیاط سے کھیت کو ناپا ــــــ تین سو ڈگ لمبا اور ایک سو بیس ڈگ چوڑا۔ اب تک اس کی سرحد پر چار پتھر لگے ہوئے تھے جن پر "ہوانگ" خاندان کی مہر کندہ تھی۔ یہ سب آسانی سے بدلا جا سکتا ہے۔ کچھ عرصے بعد ان پتھروں کو اکھاڑ کر میں اپنے نام کا جھنڈا لہراؤں گا ــــــ نہیں ابھی نہیں، کیونکہ وانگ لنگ دنیا پر یہ راز افشا نہ کرنا چاہتا تھا کہ وہ ایسا مالدار ہے کہ ہوانگ گھرانے کی زمین خرید رہا ہے۔ وہ یہ اس وقت کرے گا جب واقعی دولتمند ہو جائے گا اور پھر کسی کا کھٹکا نہ رہے گا۔ اس لمبے چوڑے کھیت کو دیکھ کر اس نے جی ہی جی میں کہا:

"حویلی والوں کے لیے اس کی بساط ہی کیا، لیکن میرے لیے یہ سونے کی کان ہے۔"

مگراس کے خیال نے پلٹا کھایا اور اسے اپنے آپ پر غصّہ آیا کہ ڈگ بھر زمین پر یوں اترا رہا ہے۔ جب اس نے اکڑ کر منیم کے آگے رُپے گنے تو اس نے لاپروائی سے انھیں اٹھا کر کہا:

"نواب صاحب کی افیون کے لیے چند روز فکر نہ کرنا ہوگا!"

وانگ لنگ اور بڑی حویلی میں جو امتیاز تھا وہ اتنا ہی دشوار گزار تھا جتنی یہ کھائی یا یہ آسمان بوس دیوار جو سدِّ سکندر کی طرح سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ بوکھلا کر اس نے وہیں قسم کھائی کہ میں ہزار مرتبہ اس سوراخ کو چاندی سے بھروں گا اور ہوانگ گھرانے کی اتنی زمین خریدوں گا کہ میری اراضی اس کے مقابلے میں تل سے زیادہ حقیقت نہ رکھے گی۔

چنانچہ، یہ کھیت اب وانگ کے لیے ایک قسم کا اشارہ یا نشان سا ہوگیا۔

تیز ہواؤں اور ڈگمگاتے ہوئے بادلوں کو لیے ہوئے بہار گزر گئی۔ سرما کے مختصر دن وانگ لنگ کے لیے مشقت کی لامتناہی ساعتوں میں مبدّل ہوگئے۔ اب بڑے میاں بچّے کی دیکھ بھال کرتے اور میاں بیوی دونوں صبح سے شام تک کھیتوں میں کام کیا کرتے۔ اور اس دوران میں ایک روز جب وانگ لنگ نے دیکھا کہ عورت کا پنڈا پھر بھاری ہے تو پہلے پہل وہ جھنجھلایا کہ کٹائی کے وقت وہ کام نہ کرسکے گی۔ تکان سے چور اس نے چیخ کر کہا:

"تمھیں پلا جننے کے لیے یہی گھڑی رہ گئی تھی۔ کیوں؟"

مگر اولان نے بے دھڑک جواب دیا:

"اس مرتبہ کوئی کھٹکا نہیں۔ پہلوٹا ہی کٹھن ہوتا ہے"۔

دوسرے بچّے کے متعلّق اس سے زیادہ گفتگو نہ ہوئی، پت جھڑ کے اس دن تک جب اپنی کھُرپی پھینک کر وہ گھر میں نہ جا چھپی۔ وانگ لنگ دوپہر کو کھانے کے لیے گھر نہ گیا کیونکہ آسمان پر کالی گھٹائیں چھا رہی تھیں اور کھیت میں دھان پک رہا تھا جھٹپٹے سے پہلے اولان اس کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ اس کا جسم ڈھل گیا تھا۔ لیکن چہرے پر وہی سکون اور سنجیدگی نمایاں تھی۔ وانگ لنگ کی زبان پر بے ساختہ یہ جملہ آیا: "آج کا روز تم پر سخت گزرا۔ جاؤ، آرام کرو"۔ لیکن اس کی رگ رگ دکھ رہی تھی اور وہ بے حس ہو گیا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں کہا کہ اولان کو بچّہ جننے میں جتنا دکھ اٹھانا پڑا، اتنا ہی دُکھ مجھے دن بھر کی انتھک محنت سے ہوا ہے۔ لہٰذا ہنسیا چلاتے ہوئے اس نے صرف اتنا پوچھا۔

"لڑکا ہے یا لڑکی؟"

اس نے آہستگی سے کہا: "یہ بھی لڑکا ہے"۔

ان میں زیادہ بات چیت نہ ہوئی مگر وانگ لنگ خوش ہوا، اور اب تک وہ دوکی کوفت کم ہو گئی۔ وہ تب تک فصل کاٹتے رہے جب تک چاند گلابی بادلوں سے باہر نہ نکل آیا۔ اب فصل کٹ چکی تھی اور دونوں گھر کی طرف جا رہے تھے۔

کھانا کھا کر اور دھوپ میں تپے ہوئے بدن کو پانی سے دھو کر اور چائے کا غرارہ لے کر وانگ لنگ اطمینان سے اپنے دوسرے بیٹے کو دیکھنے گیا۔ کھانا پکا کر اولان بچے کے پاس جا لیٹی تھی۔ بچّہ

موٹا تازہ تھا، خاصا تندرست مگر پہلے کی طرح دراز قد نہیں۔ اسے دیکھ کر وانگ لنگ باغ باغ ہو گیا اور بچلے کمرے میں چلا گیا۔ ہر سال ایک نیا لڑکا —— رنگین انڈوں کی اب کوی ضرورت نہیں، پہلی مرتبہ جو بنٹ چکے سو بنٹ چکے۔ ہر سال ایک بیٹا۔ اس گھر میں برکت ہی برکت ہے —— یہ عورت کیا ہے لچھمی کا اوتار ہے۔ وانگ لنگ نے اپنے باپ کو مژدہ سنایا:

"بڑے میاں دوسرا پوتا مبارک ہو۔ پہلا اب تمھارے پلنگ پر سوئے گا۔"

بڑے میاں کی باچھیں کھل گئیں۔ عرصۂ دراز سے ان کی خواہش تھی کہ وہ اُن کے ساتھ سوئے اور اپنے گرم خون سے ان کی ٹھنڈی ہڈّیوں کو گرمائے۔ مگر بچّہ اپنی ماں سے الگ نہ ہوتا تھا۔ لیکن اب وہ لڑکھڑاتے ہوئے اُٹھا اور یہ سمجھ کر کہ اس کی جگہ اب کسی اور نے لے لی۔ وہ بے روئے دھوئے دادا کے پلنگ پر جا سویا۔

فصل اچّھی ہوئی تھی، اسے بیچ کر وانگ لنگ نے از سرِ نو چاندی دیوار میں چھپانی شروع کی۔ ہوانگ کے کھیت کا اناج اس کے اپنے کھیت کے اناج سے دوگنا تھا۔ اس کی زمین اچّھی تھی اور دھان جنگلی پودوں کی طرح خود بخود اُگ آتا تھا۔ اب سب کو پتہ چل گیا کہ یہ وانگ لنگ کی ملکیت ہے اور لوگ سوچنے لگے کہ اسے اپنا سرپنچ بنادیں۔



باب ۔ ۷

وانگ لنگ کو جس بات کا کھٹکا تھا وہ سامنے آئی ۔ یعنی اس کا چچا اسے طرح طرح دق کرنے لگا۔ وہ بڑے میاں کا چھوٹا بھائی تھا اور دیس کی ریت یہ کہتی تھی کہ اگر وہ کنگال ہو جائے تو وانگ لنگ اس کے گھر بار کے لیے دانے پانی کا انتظام کرے۔ جب تک وانگ لنگ اور اس کے باپ کے پاس کچھ نہ تھا، چچا جان جھک مار کر کام کرتے اور اپنے سات عدد بچوں اور مسماۃ کے لیے روٹی مہیا کرتے۔ چچی کو یہ منظور نہ تھا کہ فرش پر جھاڑو دیں اور نہ بچوں کو اس کی پروا کہ ناک کا رینٹ صاف کریں۔ کیسے شرم کی بات تھی کہ کنواری لڑکیاں جواب بیاہ کے جوگ ہو چلی تھیں۔ گھوڑیوں کی طرح سڑک پر ترارے بھرتیں اور میلے بالوں میں کنگھی تک نہ کرتیں۔ یہی نہیں بلکہ گاہے گاہے وہ مردوں سے باتیں بھی کر لیتی تھیں۔ ایک دن اپنی سب سے بڑی چچیری بہن کو اس ہیئت میں دیکھ کر وانگ لنگ کو خاندان کی ناک کٹنے کے خیال سے ایسا غصہ آیا کہ وہ اپنی چچی کے پاس پہنچا اور بولا:

"جس لڑکی پر ہر ایرے غیرے کی نظر پڑتی ہو اسے کون بیاہے گا؟ تین برس سے وہ بالغ ہے، تاہم وہ بے دھڑک سڑکوں پر مٹکتی پھرتی ہے۔ آج میں نے سر بازار ایک اچکے کو اس کی بغل میں ہاتھ ڈالتے دیکھا اور جواب میں یہ بے حیائی سے قہقہہ لگانے لگی۔"

چچی کے جسم کا کوئی حصہ اگر سست نہ تھا تو یہ اس کی زبان تھی۔ چنانچہ اس نے وانگ لنگ کو بری طرح آڑے ہاتھوں لیا:

"بہت خوب، لیکن یہ تو کہیے کہ جہیز، اور جوڑے اور نائی کا محنتانہ کہاں سے آئے گا؟ جو اتنی زمین دبائے بیٹھے ہیں کہ اسے جوت نہیں سکتے اور جو بڑے بڑے نوابوں سے کھری چاندی دے کر ہر سال نئی اراضی خریدتے جاتے ہیں، ان کے لیے باتیں بنانا بہت آسان ہے لیکن تمھارے چچا کے نصیب کھوٹے ہیں اور یہ کوئی آج کی بات نہیں۔ ان کی قسمت خراب ہے تو اس میں کسی کا کیا قصور۔ یہ سب خدا کی مشیت ہے۔ دوسرے جس زمین سے چاندی اگاتے ہیں اسے اگر یہ چھوئیں تو گھاس پھوس کے سوا اور کچھ نہ نکلے، چاہے وہ اپنی کمر کو دوہرا ئی کیوں نہ کر ڈالیں!"

چچی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور موٹے موٹے آنسو بہانے لگی۔ غصے کے مارے بالوں کو نوچ کر وہ زور زور سے چلانے لگی:۔

"تمھیں کیا معلوم کہ بدنصیبی کیا بلا ہے! دوسروں کے کھیت میں جب گیہوں اور دھان کی بالیں لہلہاتی ہیں تو ہماری زمین میں گھُرمتّے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ دوسروں کے گھر سو سو برس اچل اور اٹل کھڑے رہتے ہیں لیکن ہماری جھونپڑی کی نیو جب دیکھو ہلتی رہتی ہے اور دیواریں چٹختی رہتی ہیں۔ دوسروں کے گھر بیٹے ہوتے ہیں اور میں نصیب جلی چاہے جتنی مراد مانگوں، جنتی ہوں بیٹیاں ——— ہائے ری قسمت!"

وہ یوں گلا پھاڑ کر رونے لگی کہ پڑوسنیں باہر نکل آئیں۔ تاہم

وانگ لنگ ہمّت باندھے ڈٹا رہا اور بولا:

"گو اپنے باپ کے بھائی کو مشورہ دینے کا مرتبہ میرا نہیں پھر بھی میں یہ کہہ کر رہوں گا کہ کنواری لڑکی کی شادی جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی اچھا۔ کسی نے نہ سنا ہوگا کہ کتیا سڑک پر گئی اور پلّے جنے بغیر گھر آئی!"

یوں دو ٹوک بات کہہ کر اور اپنی چچی کو ماتم کناں چھوڑ کر وہ اپنے گھر لوٹ آیا۔ وہ یہ منصوبے باندھ چکا تھا کہ ہر سال ہوانگ گھرانے سے نئے نئے کھیت خریدتا جائے گا۔ وہ تو اپنے مکان کو بڑھانے کا بچار بھی کر رہا تھا۔ لیکن یہ امر کتنا شرمناک تھا کہ وہ اور اس کے بیٹے زمیندار بننے والے تھے، اور اس کے چچا کا خاندان جو اسی نام کا حامل تھا۔ اپنے خون کو یوں سفید کر رہا تھا۔

دوسرے دن اپنے کھیت میں کام کرتے کرتے وہ کیا دیکھتا ہے کہ چچا جان رینگتے رینگتے اس کی طرف آرہے ہیں۔ اولان وہاں نہ تھی کیونکہ دوسرے بچّے کی پیدائش کو دس ماہ گزر چکے تھے اور وہ پھر حمل سے تھی لیکن اب کے وہ ویسی بھلی چنگی نہ تھی اور کئی روز سے کھیت نہ آئی تھی۔ اس وجہ سے وانگ لنگ تنہا کام کر رہا تھا۔ اس کا چچا ایک پگڈنڈی پر لڑکھڑاتا اِدھر آرہا تھا۔ وہ اپنے لباس کے بٹن تک نہ لگاتا تھا، بس اسے گھڑس کر کمر بند سے کس لیتا تھا۔ اور ان کی قطع ایسی تھی کہ ہمیشہ یہ محسوس ہوتا کہ ایک زور کا جھونکا آیا تو وہ ننگا ہو جائے گا۔ وہ وانگ لنگ کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ سیم کی کیاریاں لگا کر ان کے برابر نالیاں کھود

رہا تھا۔ آخر کار وانگ لنگ نے سر اٹھائے بغیر طنز آمیز انداز میں کہا:
"چچا، معاف کرنا کہ آپ کی موجودگی میں بھی میں برابر کام کیے جا رہا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ سیم کی پرورش دقت طلب ہے۔ آپ تو یہ سب ختم کر چکے ہوں گے۔ میں ٹھہرا ایک غریب اور کاہل کسان مجھے یہ کب میسر کہ وقت پر کام ختم کر کے تھوڑا سا آرام کر لوں۔"
چچا اپنے بھتیجے کی پھبتی سمجھ گیا، تاہم چکنے چپڑے لہجے میں کہنے لگا:
"میری قسمت ہی پھوٹ گئی ہے۔ اس سال سیم کی بیس کیاریاں لگائیں جن میں صرف ایک پنپی۔ جب بیج کا یہ حال ہو تو بھاوڑا چلانے سے کیا حاصل۔ اس سال ہمیں بازار سے سیم خریدنی ہوگی۔" اس نے لمبی سانس لے کر کہا۔
وانگ لنگ نے جی کڑا کیا وہ سمجھ گیا کہ چچا کچھ مانگنے آیا ہے۔ اس نے جانچ تول کر کدالی زمین پر ماری اور بڑے احتیاط سے چھوٹے موٹے ڈھیلوں کو ہموار کرنے لگا۔ گو وہ ایک بار کھیت کی گڑائی کر چکا تھا۔ سیم کے پودے سلسلہ وار تنے ہوئے کھڑے تھے اور دھوپ میں ان کی ننھی ننھی پرچھائیں جھلملا رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد چچا نے کہنا شروع کیا:
گھر والی نے مجھے بتایا کہ پھوہڑ غلام زادی کے حال زار پر تمھاری نظر پڑی ہے۔ تم نے جو کچھ کہا اس کا لفظ لفظ سچ ہے۔ ماشاءاللہ تم اس عمر میں کتنے سیانے ہو۔ اس کی شادی جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ اب وہ پندرہ برس کی ہے اور تین چار سال سے بالغ ہو چکی ہے۔ مجھے ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں کوئی کتا اسے

گابھن نہ کردے اور ہمارے تمھارے نام کو کلنگ نہ لگ جائے۔ سوچو تو سہی کہ کسی شریف گھرانے کے لیے یہ کیسی مصیبت ہے۔ اور میں تو تمھارے باپ کا سگا بھائی ہوں!"

وانگ لنگ نے کدالی زمین پر پھینک دی۔ اس کا جی چاہا کہ بے لاگ کچھ کھری کھری باتیں کہہ ڈالے:۔

"آخر آپ اس کی تربیت کیوں نہیں کرتے؟ آپ اسے گھر میں بند کیوں نہیں رکھتے اور گھر کے لیے سینے پرونے اور پکانے رینڈنے کی تاکید کیوں نہیں کرتے؟"

لیکن بڑے بوڑھوں کو کوئی نصیحت نہیں دے سکتا۔ اس لیے وہ خاموشی سے ایک پودے کی گڑائی کرتے ہوئے اپنے چچا کی باتیں سنتا گیا اور ان حضرت نے غمناک لہجے میں کہنا شروع کیا:۔

اگر میری قسمت اچھی ہوتی تو میں بھی کسی ویسی ہی عورت سے شادی کرتا جس سے تمھارے باپ نے بیاہ کیا، جو بیک وقت کام بھی کر سکے اور بچے بھی پیدا کر سکے؛ مثلاً خود تمھاری منکوحہ۔ ایسی عورت کے چکر میں نہ آتا جیسی میری ہے جو توند بڑھانے اور لڑکیاں پیدا کرنے کے سوا کچھ نہیں کرتی اور ایک لڑکا جن کر دیا بھی تو وہ نرا اپاہج اور نکھٹو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں بھی تمھاری طرح مالدار ہوتا۔ اور میں خوشی خوشی اپنے دھن مال میں تمھیں شریک کر لیتا۔ تمھاری بیٹیوں کا بیاہ میں شریفوں سے رچاتا اور تمھارے بیٹے کو کسی سوداگر کا کارآموز بناتا اور اپنی گرہ سے اس کی ضمانت جمع کرتا۔ تمھارے مکان کی مرمّت کراتا اور تمھیں تمھارے باپ اور بیٹے کو

دسترخوان کا پہلا نوالہ کھلاتا کیونکہ ہماری رگوں میں ایک ہی خون بہتا ہے۔"

اس تقریر کے جواب میں وانگ لنگ جھٹ سے بولا: "آپ جانتے ہیں کہ میں کوئی دھنا سیٹھ نہیں۔ میری گردن پر چار جانوں کا بوجھ ہے، ابّا بوڑھے ہیں اور کام کرنے سے معذور۔ پھر بھی انھیں کھلانا پڑتا ہے۔ میرے گھر میں پھر ایک نئی پیدائش ہونے والی ہے۔"

چچا نے چلّا کر کہا: "باتیں نہ بناؤ، تم امیر ہو۔ تم نے بڑی حویلی کی زمین خریدی ہے —— خدا جانے کتنے مہنگے داموں پر — کیا ہمارے گاؤں میں اور کسی کی یہ بساط ہے؟"

یہ سن کر وانگ لنگ کو طیش آگیا۔ کدالی پھینک کر اپنے چچا کو گھور کر بولا: "اگر میری گرہ میں دام ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اپنی بیوی کے ساتھ دن رات کام کرتا ہوں۔ دوسروں کی طرح گھر میں غپ بازی نہیں کرتا، نہ اپنے کھیت کو بنجر رہنے دیتا ہوں، نہ میرے بچے روٹیوں کے محتاج رہتے ہیں!"

چچا کا پیلا چہرا غصّے سے سرخ پڑ گیا اور اپنے بھتیجے کی طرف لپک کر اس نے اس کے گالوں پر زور سے چٹاچٹ دو طمانچے لگائے: "بڑوں سے گستاخی کرنے کی یہ سزا ہے! ۔ کیا تو بدعقیدہ اور بداخلاق ہے جو ایسی نافرض شناسی برت رہا ہے؟ کیا تو نے احکام الٰہی کا یہ قول نہیں سنا کہ کوئی آدمی اپنے بڑوں سے سرکشی نہیں کر سکتا؟"

وانگ لنگ بوکھلاہٹ کے باوجود سنّاٹے میں آگیا۔ گو اس کے

دل میں چچا کی طرف سے سخت نفرت تھی لیکن اسے اپنی غلطی کا احساس تھا۔

چچا نے غضبناک آواز میں کہا: میں گاؤں بھر کو تیری باتیں سناؤں گا۔ کل تو میرے گھر چڑھ آیا اور کہنے لگا کہ میری بیٹی کنواری نہ رہی۔ اور آج تو مجھے گالیاں دینے لگا ــــــ مجھے، جو تیرا باپ نہ ہو، تو اس کا قایم مقام سمجھا جاؤں گا۔ اگر میری بیٹیاں کنواری نہ بھی ہوں میں تیرے ہاتھوں رسوائی کا متحمل نہیں ہو سکتا!" اور وہ بار بار یہی رٹ لگائے گیا: "میں گاؤں کو یہ سب سنا کر رہوں گا ــــــ میں گاؤں سے یہ کہہ کر رہوں گا۔" اس حد تک کہ وانگ لنگ کو بادلِ ناخواستہ یہ پوچھتے ہی بن پڑا:

"یہ بھی تو کہیے کہ آپ چاہتے کیا ہیں؟"

یہ سنتے ہی چچا جان کا چہرا کھِل گیا۔ غصہ چشم زدن میں کافور ہو گیا۔ مسکرا کر اس نے وانگ لنگ کی بانہ میں بانہ ڈال دی۔ اور ملایمت سے کہا: میں جانتا ہی تھا کہ تم طبیعتاً شریف واقع ہوئے ہو۔ ارے کیا مجھ بڈّھے کو نہیں معلوم کہ تو میرے بیٹے کا درجہ رکھتا ہے۔ بیٹے، دس نہیں تو نو رُپے ہی مجھے دے دے تاکہ اس غلام زادی کی شادی کے لیے کسی نائی کو ادھر اُدھر دوڑادوں۔ تم ٹھیک کہتے ہو! ــــ اسے فوراً بیاہ دینا چاہیے ــــــ فوراً!"۔ ٹھنڈی سانس بھر کر اور سر ہلا کر وہ پرہیزگارانہ انداز میں آسمان کو تکنے لگا۔

وانگ لنگ نے کدال اٹھائی اور پھر نیچے ڈال دی۔

"میرے ساتھ گھر تک آئیے۔ میں راجاؤں کی طرح چاندی لیے نہیں پھرتا۔"

غصّے سے آگ بھبوکا وہ آگے آگے چلا کیونکہ جن روپوں کو زمین خریدنے کے لیے اس نے سینت کر رکھا تھا وہ اس چچا کے ہاتھوں میں جا رہے تھے، اور وہاں سے شام ہوتے ہوتے ان کا جوے گھر میں ضایع ہو جانا یقینی تھا۔

مکان کی دہلیز پر اس کے دونوں بیٹے ننگے بدن دھوپ میں کھیل رہے تھے۔ انھیں سامنے سے ڈھکیل کر وہ گھر میں گھس گیا۔ اس کے خوش طبع چچا نے محبّت سے بچّوں کو پاس بلایا اور اپنے بے بند کپڑوں کی کسی تہہ سے دو پیسے نکال کر ان کی ہتیلی پر رکھ دیے۔ پھر ان کی نرم نرم گردنوں پر اپنی ناک رکھ کر ان کے تپتے ہوئے جسم کو سونگھنے لگا۔ ان دونوں کو گود میں لے کر وہ بولا: "ارے تم دونوں مرد ہو ـــــ مرد!"

وانگ لنگ پل بھر کے لیے نہ رُکا۔ سیدھے اس کمرے میں گیا جس میں وہ اپنی بیوی اور چھوٹے بیٹے کے ساتھ سوتا تھا۔ کیونکہ وہ تیز دھوپ سے اندر آیا اس لیے دراز سے آتی ہوئی کرن کے سوا اور کچھ نہ دیکھ سکا۔ اندھیرا گھپ تھا۔ تازے خون کی بدبو جو اس کی ناک میں بسی ہوئی تھی، اب پھر اسے محسوس ہوئی اور اس نے تیکھی آواز میں پوچھا:

"کیوں، کیا پھر بچہ دیا؟"

اس کی بیوی نے پلنگ پر لیٹے لیٹے نہایت ہی نحیف آواز میں

جواب دیا :

"شکر کہ یہ بپتا ٹل گئی۔ کہنے کی بات نہیں ، اس بار ایک باندی ہے۔"

وانگ لنگ دنگ رہ گیا۔ اس کے دل میں بُرے بُرے خیال آنے لگے۔ لڑکی ! ۔

ایک لڑکی کے ہی کارن اس کے چچا کے گھر ساری مصیبت آئی ہے۔ اب اس کے گھر بھی ایک لڑکی کا نزول ہوا ہے۔

بے کچھ کہے سنے وہ دیوار کے پاس گیا اور اس کھردری جگہ کو ٹٹولنے لگا جس کے پیچھے رُپے چھپائے گئے تھے۔ مٹی کا ڈھیلا ہٹا کر وہ رپوں کی ڈھیری میں نو سکّے گننے لگا۔

یک بیک اندھیرے میں عورت کی آواز گونج اٹھی: "رُپے کیوں نکال رہے ہو؟"

اس نے جلدی سے کہا: "لاچاری ہے، چچا اُدھار مانگ رہے ہیں۔"

پہلے تو اولان چپ رہی ، اور پھر اپنے سیدھے سادے انداز میں بولی :

"قرض کا نام کیوں لیتے ہو۔ اس گھر کو لین دین سے کیا واسطہ۔ وہ لے کر دینا کب جانتے ہیں۔"

وانگ لنگ نے جل کر کہا: "یہ مجھے بھی معلوم ہے اپنی بوٹی نوچ کر انھیں دینا پڑ رہا ہے، صرف اس وجہ سے کہ وہ رشتے دار ہیں۔"

باہر آ کر اس نے رُپے چچا کے ہاتھ میں پھینکے اور فوراً کھیت میں جا کر اس بگڑے دل سے کدال چلانے لگا گویا زمین کی نیو کھود کر رکھ دے گا۔

اسے بس ان ر پوں کی ہی دھن تھی۔ اپنے تصور میں وہ دیکھنے لگا کہ کس لاپروائی سے رُپے جو ے کی میز پر بکھیر دیے گئے اور پھر کسی اُچکّے نے انھیں بٹور لیا —— وہ رُپے جو اس نے بڑی جانفشانی سے کمائے تھے، اس لیے کہ نئی زمین خریدے گا۔

کہیں شام کو جا کر اس کا غصّہ ٹھنڈا پڑا۔ کمر سیدھی کر کے وہ گھر اور رپوں کا دھیان کرنے لگا اور جب اسے اپنی بچّی کا خیال آیا تو اس سوچ سے دل بھاری ہو گیا کہ اب میرے گھر بھی لڑکیوں کی آمد شروع ہو گئی کیونکہ وہ دوسروں کی ملکیت ہیں پال پوس کر انھیں دوسروں کے سپرد کر دینا ہے۔ اپنے چچا سے وہ اتنا خفا تھا کہ اس ننّھی مُنّی کو ایک نظر دیکھنے کا بھی دھیان نہ رہا تھا۔

کدال کا ٹیکا لگائے وہ کھڑا رہا اور اس پر اُداسی سی چھا گئی۔ اب کہیں دوسری فصل کٹ جائے تو وہ کھیت خریدا جا سکے گا۔ جس کا ڈانڈا اس کی اراضی سے ملتا تھا۔ ادھر گھر کی آبادی میں ایک نیا اضافہ ہو گیا تھا۔ جھٹپٹے کا سماں تھا، اور پیلے مٹیالے آسمان پر کوّوں کی ایک ٹولی اس کے سر کے اوپر کائوں کائوں کرتی گزر رہی تھی۔ کوّے اس کے گھر کے پاس کے پیڑوں میں بادل کے ٹکڑوں کی طرح غایب ہو گئے اور وانگ لنگ شور مچاتا کدال ہلاتا انھیں بھگانے کے لیے دوڑا۔ کوّے اس کے سر پر منڈلانے اور اپنی بولی میں اسے چڑھانے لگے۔ اور کچھ دیر کے بعد اندھیرے میں ڈوبے ہوئے آسمان کی طرف اڑ گئے۔

وانگ لنگ نے ایک لمبی آہ بھری۔ یہ شگون اچّھا نہ تھا۔

باب ۸

سچ ہے کہ اگر دیوتا ایک بار کسی آدمی کے دشمن ہو جائیں تو پھر کبھی اس کی بات نہیں پوچھتے۔ اوایل گرما میں بارش شروع ہو جاتی تھی۔ لیکن اس کا کہیں نام نہ تھا اور روز بروز دھوپ تیز تر ہوتی جاتی تھی۔ پیاس کے مارے زمین کی زبان میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ ایک کے بعد دوسری صبح آتی اور چلی جاتی لیکن بادلوں کا کوئی پتہ نہ تھا۔ رات کو ستارے جگمگاتے اور اُن کے حسن میں بے دردی کا پہلو ہوتا۔

کھیتوں کو جوتنے میں وانگ لنگ نے کسر نہ رکھی، لیکن سوکھے کا یہ حال کہ ان میں دراڑیں پڑنے لگیں۔ اور گیہوں کی وہ بالیں جو بہار کی آمد کے ساتھ ابھری تھیں کہ اناج کا زرین تاج پہنیں، زمین و آسمان سے کوئی رزق نہ پاکر، دھوپ میں چپ چاپ کھڑی رہیں اور آخر کار جُھلس کر رہ گئیں۔ بھوری زمین پر اس کے دھان کے کھیت سنگ مرمر کے فرش کے سے بھلے لگتے تھے۔ وانگ لنگ نے گیہوں کا خیال چھوڑا اور ہر روز کانور میں پانی کی مشکیں لادے ان کی سنچائی کرنے لگا۔ اس کے کندھے پر گٹے پڑ گئے اور جلد پر ایک گہرا نشان بن گیا لیکن بارش نہ ہونی تھی، نہ ہوئی۔

پھر وہ بھی دن آیا کہ باولی سوکھ گئی اور کنویں کا پانی تلی کو جا لگا۔ اولان نے یاد دلایا:

اگر بچوں کو پانی پینا ہے اور بڑے میاں کو گرم پانی کا غرارہ

کرنا ہی، تو کھیت کی سنچائی نہیں ہو سکتی۔"
وانگ لنگ جھنجھلا کر رونے لگا:
"اگر اس کھیت میں فصل نہ آئی تو ہم سب کو فاقہ کرنا ہوگا۔" یہ سچ تھا کیونکہ ان کی زندگی کا انحصار زمین پر تھا۔
صرف کھائی کے پاس کی زمین میں فصل آئی۔ وہ بھی اس وجہ سے کہ جب پوری گرمی بے پانی گزر گئی تو وانگ لنگ نے لاچار اور سب کھیتوں کو چھوڑا اور دن بھر یہاں رہ کر کھائی سے بوند بوند پانی لے کر کھیت کو پلانے لگا۔ کٹائی کے بعد زندگی میں سب سے پہلی بار اس نے فوراً فصل بیچ دی۔ اور جب دام اس کے ہاتھ میں آئے تو اس کی مٹھی سخت ہو گئی اور اس نے غضبناک تیوریوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ خواہ قسمت خلاف ہو خواہ قحط پڑے لیکن میں وہی کروں گا جس کا تہیّہ کیا ہے۔ ان مٹّھی بھر روپلیوں کے لیے میں نے پسینہ پانی کر دیا اور ہڈّیاں چور چور کر دیں۔ انھیں میں اپنی مرضی کے مطابق برتوں گا۔ وہ ہوانگ کی حویلی کی طرف جھپٹا اور منیم کو دیکھتے ہی بغیر کسی تمہید کے بولا: "کھائی کے پاس میرے کھیت سے ملی ہوئی جو بٹّی ہے، میں اس کی قیمت لے کر آیا ہوں۔"
وانگ لنگ نے یہ افواہ سنی تھی کہ بڑی حویلی کے لیے بھی یہ سوکھا برس ہے۔ کئی روز سے بڑی بیگم کو پوری مقدار میں افیوں میسّر نہ ہوئی اور وہ بھوکی شیرنی کی طرح ہر روز منیم کو طلب کرتی، کھری کھوٹی سناتی اور کبھی پنکھے سے اسے مار کر گرج اٹھتی ہے:
"کیا بیچنے کے لیے اب کوئی کھیت باقی نہیں رہا؟" یہاں تک کہ

نسیم کے صبر کا پیالہ لبریز ہو چکا تھا۔
اس کی بیزاری کا یہ عالم تھا کہ مالکوں سے چھپا کر دستوری کی جو رقمیں وصول کیا کرتا تھا، اب ان کے جہنّم میں جھونکنے لگا۔ مصیبت یہیں نہ تھمی۔ بڑے نواب نے ایک نئی رنڈی گھر ڈال لی ۔ یہ ایک باندی کی لڑکی تھی۔ جوانی میں بڑے نواب کے حصّے یہ باندی پڑی تھی لیکن ملاقات سے پہلے ہی ان کا جی اس سے اچیٹ گیا اور شہر کے کسی خدمت گار سے اس کی شادی کردی گئی۔ اس غلام زادی کی عمر سولہ سال کی ہوگی۔ اسے دیکھتے ہی بڑے نواب کی شہوت نئے جوش سے بھڑک اٹھی۔ کیونکہ جوں جوں وہ بڈّھا توندل اور نکھٹّو ہوتا جاتا جوان اور سرو قد عورتوں یا لڑکیوں کے تئیں اس کی خواہش بے باک ہوتی جاتی۔ اس حد تک کہ اسے ٹھنڈا کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ بڑی بیگم کو جیسا عشق اپنی افیون سے تھا، ویسا اسے اپنی شہوت سے تھا۔ اسے یہ سمجھانا ناممکن تھا کہ اس کی آشناؤں کے جڑاؤ کرن پھول یا طلائی دست بندوں کے لیے تجوری میں روپے نہ تھے۔ جو آدمی بچپن سے اللّے تللّے میں پلا ہو وہ روپیہ نہ ہونے کا مطلب کیا سمجھے۔

اور جب ان کے بیٹوں نے اپنے والدین کو یوں عیش اڑاتے دیکھا تو وہ لاپروائی سے بولے کہ ہماری زندگی بھی مزے میں کٹ جائے گی۔ وہ سب مل کر مختار کی جان کے لاگو ہوگئے۔ کہ وہ غیر منتظم ہی۔ چنانچہ یہ نسیم جو کبھی خوش زبان، آرام طلب اور بے فکر تھا، اب اس قدر فکرمند اور بیزار ہوگیا تھا کہ جسم کی چربی

پگھل گئی اور چمڑا پرانے لباس کی طرح لٹکنے لگا۔
بادلوں نے ہوانگ گھرانے کے کھیتوں کو بھی پانی نہ دیا تھا اور وہ سوکھے پڑے تھے۔ اس لیے جب وانگ لنگ یہ کہتے ہوئے آیا کہ "میں چاندی لایا ہوں" تو یہ محسوس ہوا کہ کسی بھوکے سے کہہ رہا ہو کہ "میں کھانا لایا ہوں۔"
یہ سنتے ہی نیم اچھل پڑا۔ پہلے مول بھاؤ اور توتو میں میں گھنٹوں گزر جاتے تھے۔ لیکن اب دونوں نے گھڑی بھر کانا پھوسی کی۔ اور قبل اس کے کہ ان کی بات چیت ختم ہو، ادھر روپیہ نکلا اور اُدھر کاغذات پر دستخط ہو گئے۔ مہر بھی لگ گئی اور وانگ لنگ ایک نئے کھیت کا مالک ہو گیا۔
وانگ لنگ کو چاندی جانے کا کوئی غم نہ تھا گو یہ بڑی مشقت سے کمائی گئی تھی۔ اسے اس نے اپنی سب سے بڑی تمنّا کی تکمیل میں صرف کیا۔ یہ کھیت پہلے کھیت کا دوگنا اور بڑا زرخیز تھا۔ لیکن وانگ لنگ کے لیے یہ امر زیادہ اہم تھا کہ کبھی اس کا تعلق ایک راج گھرانے سے تھا۔ اور اس مرتبہ اس نے اولان تک کو اس واقعہ کی اطلاع نہ ہونے دی۔
کئی مہینے گزر گئے اور بارش کا نام نہ تھا۔ اور جب پت جھڑ کے دن آئے تو جن املتے بادلوں نے آسمان پر ڈیرا ڈالا وہ پریشان اور خشک تھے۔ گانوں کی گلیوں میں دیہاتیوں کے جھنڈ حیرانی اور تفکر کے عالم میں اوپر سر اٹھائے کبھی اس بادل کا اور کبھی اُس بادل کا جائزہ لیتے اور مشورہ کرتے کہ آیا ان میں پانی ہے یا نہیں۔

لیکن ابھی یہ بادل انتشار کی حالت ہی میں تھے کہ شمال و مغرب کی جانب سے ایک آندھی اٹھی ۔ یہ ریگستان کی باد سموم تھی جو آسمان سے ابر کو یوں اڑا لے گئی گویا کسی نے جھاڑو سے فرش کی گرد صاف کر دی ہو۔ آکاش میں پھر سنّاٹا چھا گیا اور ہر صبح سورج دیوتا کی سواری دھوم دھام سے نکلتی اور شام کو غروب ہو جاتی ۔ اور پھر چاند ایک ننھّے سے آفتاب کی طرح چہار سو اُجالا پھیلا دیتا ۔

اپنی ساری اراضی سے لے دے کر وانگ لنگ کے پلّے کچھ سوکھی ہوئی سیم کی پھلیوں اور کچھ دھان کے پودوں کے سوا کچھ نہ رہا ۔ گہائی میں ایک دانا بھی ضائع نہ ہونے پایا ۔ جب میاں بیوی پھلیوں سے بیج نکال رہے تھے تو دونوں بچّے فرش کی مٹّی پچھوڑنے لگے کہ مبادا ان میں ایک آدھ بیج نہ رہ گیا ہو۔ اور بیچلے کمرے میں دھان کے دانے نکالتے ہوئے وہ غور سے اِدھر اُدھر دیکھتا گیا کہ کہیں کوئی دانا نہ بکھر گیا ۔ جب وہ چھلکوں کو ایندھن کے لیے علیحدہ کرنے لگا تو اس کی بیوی نے یاد دہانی کی۔

”نہیں ، انھیں ضائع نہ کرنا چاہیئے ۔ مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن میں صوبۂ شانتنگ میں اگر قحط پڑتا تو انھیں پیس کر کھایا جاتا تھا۔ گھاس پھوس سے یہ بہتر ہے ۔“

یہ سنتے ہی بچے بڈھے سب پر سنّاٹا چھا گیا ۔ یہ کڑکڑاتی دھوپ اور تشنہ کام زمین نحوست کا پیغام دے رہی تھی ۔ صرف دُودھ پیتی بچّی کو کسی قسم کا کھٹکا نہ تھا۔ ماں کی چھاتیاں اب تک اس کے لیے کافی تھیں۔ اولان نے اسے دُودھ پلاتے ہوئے کہا ۔

"اری منحوس، جب تک کھانے کو ہی کھالے۔ پھر یہ بھی نہ رہے گا۔"
ان سب مصیبتوں پر تازیانہ یہ کہ اولان کو پھر حمل ٹھہرا۔ اس کی چھاتی میں دودھ کی بوند نہ رہی اور وہ وحشت زدہ مکان ایک بچی کے شور و غوغا سے گونج اٹھا جو ہر وقت رزق کی طلب کرتی رہتی تھی۔
اگر کسی نے وانگ لنگ سے پوچھا ہوتا کہ:
"ان دنوں کیوں کر پیٹ پالتے ہو؟" تو وہ یقیناً یہ جواب دیتا:
"خبر نہیں، یہاں وہاں سے جو مل جائے اسی پر گزارہ ہے۔"
لیکن یہ سوال کرنے کی تاب کس میں تھی۔ اس علاقے میں کوئی کسی کی خیریت نہ پوچھتا تھا۔ اپنے سوا کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔
وانگ لنگ اب تک اپنے بیل کی پرورش کرتا آیا تھا۔ گھر میں جب تک پرال اور بھوسی رہی اسے دیتا رہا اور اس کے ختم ہو جانے پر پیڑ کی ٹہنیاں کھلاتا رہا۔ حتّٰی کہ سرما کا زمانہ آیا کہیں ایک پتّی باقی نہ رہی۔ اب کھیتوں کی جتائی فضول تھی اور بیجوں کی بربادی کے سوا اس سے کچھ ملتا نہ تھا۔ اور پھر سارے بیج تو ان لوگوں نے پکا کر کھا لیے تھے۔ لہٰذا وانگ لنگ نے بیل کو چرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ اس کا بڑا بیٹا بیل کے نتھنے میں رسّی ڈالے دن بھر اس کی پیٹھ پر لدا رہتا کہ کہیں کوئی اسے چرا نہ لے جائے۔ لیکن اب وانگ لنگ کو اس کی بھی ہمّت نہ ہوتی تھی کیونکہ یہ خطرہ تھا کہ کہیں گاؤں والے لڑکے کو بھگا کر بیل کو مار کر کھا نہ جائیں۔ مجبوراً اس نے بیل کو چوکھٹ سے باندھ رکھا اور رفتہ رفتہ اس کا پوست ہڈیوں سے جا لگا۔

لیکن ایک دن وہ بھی آیا کہ گھر میں چاول گیہوں کا نام نہ رہا سیم کے بیجوں اور زرا سی دال کے سوا کچھ نہ تھا ۔ چنانچہ بڑے میاں نے رائے دی:۔

"اب ہمیں یہ بیل کھانا پڑے گا ۔"

یہ سنتے ہی وانگ لنگ کراہ اٹھا کیونکہ اس کے لیے ایسی ہی بات تھی گویا کوئی کہے کہ "اب ہمیں فلاں آدمی کو کھانا چاہیے"۔ یہ بیل کھیتوں میں اس کے پہلو بہ پہلو کام کرتا رہا تھا۔ وانگ لنگ اس کے قدم بہ قدم چلتا آیا تھا اور دل کی جو کیفیت ہوتی اس کے مطابق اسے سراہتا یا ڈانٹا کرتا تھا۔ لڑکپن سے وہ اس بیل سے اس وقت سے مانوس تھا جب یہ چھوٹا سا بچھڑا تھا اور خرید کر گھر لایا گیا تھا۔ باپ کی بات سن کر اس نے جواب دیا:

اگر ہم بیل کو مار ڈالیں تو کھیتی کیونکر ہوگی ؟"

بڈھے نے سادگی سے کہا:

"تمھیں کس کی زندگی زیادہ عزیز ہے ——— اپنی اور اپنے بچوں کی یا اس حیوان کی ؟ ۔ ہم بیل تو ایک نہیں دس بازار میں خرید سکتے ہیں لیکن اپنی جان ایک بار جا کر پھر واپس نہیں آتی"۔

اس روز بیل کی جان مارنے کا ہیاؤ وانگ لنگ کو نہ ہوا۔ یوں کئی صبح و شام گزر گئے اور بچے مچل مچل کر روٹی کی پکار مچانے لگے ۔ اور اب جو اولان پُر درد انداز سے وانگ لنگ کو دیکھا تو وہ سمجھ گیا کہ ۔ یہ خون سر لینا ہی ہوگا ۔ اس لیے اس نے درشتی سے کہا:

"مارنا ہی تو اسے مار ہی ڈالو۔ مگر مجھ سے یہ کام نہ ہو گا۔"
خواب گاہ میں جا کر وہ پلنگ پر لیٹ گیا اور اس نے اپنے سر کو توشک سے ڈھک لیا تاکہ مرنے والے جانور کی آخری فریاد کانوں تک نہ آئے۔

اولان نے باورچی خانے سے ایک تیز چھرا نکالا اور باہر آ کر بیل کی گردن میں پوری طاقت سے اسے پیوست کر دیا۔ ایک بڑے کٹورے میں اس نے اس کا خون جمع کیا تاکہ پڈنگ کے کام آئے اور پھر اس لمبی چوڑی لاش کی کھال اتار کر بوٹی بوٹی کاٹ ڈالی۔ مگر وانگ لنگ تب تک باہر نہ آیا جب تک کام ختم نہ ہو گیا اور گوشت پک کر دستر خوان پر نہ چن دیا گیا۔ اس کے باوجود اپنے بیل کا گوشت اس کے گلے سے نیچے نہ اترا۔ اور بمشکل وہ شوربے کے دو چار چمچے پی سکا۔ اولان نے تسلی دینے کو کہا:

"آخر بیل ہی تو تھا اور وہ بھی بڈھا۔ سیر ہو کر کھاؤ کیونکہ کبھی نہ کبھی کوئی بیل میسّر ہو گا ہی، اور اس سے کہیں بہتر۔"

یہ سن کر وانگ لنگ کو ذرا سہارا ملا اور اس نے یکے بعد دیگرے بوٹیوں پر ہاتھ مارنا شروع کیا، دوسروں نے بھی خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ آخر بیل بھی ختم ہوا اور ہڈیوں میں گودے کی تلاش کی جانے لگی۔ اس کے بعد مردہ جانور کے اس چمڑے کے سوا کچھ نہ رہا جو بانس کے کٹ گھرے پر اولان نے سوکھنے کے لیے لٹکا دیا تھا۔

اول اول تو گانوں میں وانگ لنگ کی مخالفت ہوتی رہی

کیونکہ عام خیال یہ تھا کہ اس نے چاندی چھپا رکھی ہی اور اناج سے گودام بھر لیا ہی۔ اس کا چچا تو یونہی دائمی قحط زدہ تھا۔ اب قحط سالی کا بہانہ ملتے ہی وہ طالب امداد ہوا۔ سچ تو یہ ہی کہ اس کے بال بچّوں کے کھانے کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ جبراً و قہراً وانگ لنگ نے چچا کی جھولی میں تھوڑا سا اناج اور سیم کے بیج جھونکے اور سختی سے کہا:

"میرے پاس لے دے کر یہ رہ گیا ہی۔ اپنے بچوں سے زیادہ مجھے بوڑھے باپ کی فکر ہی۔"

جب دوسری مرتبہ چچا کا نزول ہوا تو وانگ لنگ نے بگڑ کر کہا:

"سعادت مندی سے میرے بال بچّوں کا پیٹ نہ بھرے گا۔"

اور اس کورے جواب کے ساتھ اس نے چچا کو دھتا بتائی۔

اب تو چچا ٹھکرائے ہوئے کتّے کی طرح اس کی جان کا بیری ہو گیا اور دیہاتیوں کو یوں ورغلانے لگا:

"میرے بھتیجے کے پاس روپیہ بھی ہی اور غلّہ بھی، لیکن وہ مجھے یا میرے بچوں کو پاس بھی نہیں پھٹکنے دیتا، گو ہم میں خون کا رشتہ ہی۔ اب فاقہ کشی کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

رفتہ رفتہ گانوں کے تمام گھروں کی جمع پونجی ختم ہو گئی اور ان کی ایک ایک دمڑی شہر کے اُجاڑ بازاروں کی نذر ہو گئی۔ اس حالت میں جو سرما کی آمد ہوئی اور ریگستانی بادِ زہریر جو بلا کی تند و تیز اور سرد و خشک تھی چلی، تو دیہاتیوں کے دل اپنی بھوک اور بال بچّوں کے فغاں و فریاد سے بے قابو ہو گئے۔

اُدھر وانگ لنگ کا چچا لینڈ دکتے کی طرح سڑکوں پر مٹر گشت کرتا اور گھر گھر یہ منتر جپا کرتا کہ "اس گھر میں اناج ہے ــــــ اس کے بچے اب تک موٹے تازے ہیں"۔ لہٰذا ایک رات کو لوگ ڈنڈے لیے ہوئے وانگ لنگ کے گھر چڑھ آئے اور کواڑ پیٹنے لگے۔ جیسے ہی دروازہ کھلا ان لوگوں نے اسے دھکا دے کر ایک طرف ہٹا دیا اور اس کے بچوں کو باہر کھدیڑ دیا۔ پھر وہ ہر کونے کھندرے میں ڈھونڈنے لگے اور اِدھر اُدھر زمین کھود کر فرضی دفینہ کی تلاش کرنے لگے۔ بالآخر جب انھیں کچھ سوکھی پھلیوں اور مٹھی بھر اناج کے سوا کچھ نہ ملا تو وہ مایوسی اور ناامیدی کے مارے بوکھلا گئے۔ انھوں نے گھر کی میز اور کرسیوں حتیٰ کہ اس پلنگ کو بھی ہتیانا چاہا جس پر بڑے میاں روتے کانپتے ہوئے پڑے تھے۔ یہ دیکھ کر اولان آگے آئی اور اس کی سیدھی سادی آواز نے مردوں کو چپ کر کے کہا:

"یہ نہیں ہو سکتا۔ ہمارے گھر سے یہ سامان لے جانے کا حق آپ کو نہیں ہے۔ گھر میں جو کچھ اناج ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ لیکن ابھی آپ نے اپنے گھر کے فرنیچر کو ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ تب اسے چھونے کا آپ کو کوئی اختیار نہیں۔ ہم میں آپ میں کوئی فرق نہ ہونا چاہیے۔ اس گھر میں آپ سے زیادہ غلّہ یا ترکاری نہیں ــــ بلکہ اس میں بھی آپ کا پلّہ بھاری ہے کیونکہ اب آپ ہماری متاع بھی لیے جا رہے ہیں۔ اگر آپ نے زیادتی کی تو خدا اس کی سزا دے گا۔ اب ہم سب کو باہر جانا ہے اور کھانے کے لیے گھاس

اور پتیاں ڈھونڈتا ہے ـــــــ آپ کو اپنی اولاد کے لیے اور ہمیں ان تینوں بچّوں کے لیے اور اس چوتھی جان کے لیے جس کا ورود ایسی کٹھن گھڑی ہونے والا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اولان نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور سب مرد نادم ہو کر لوٹ گئے کیونکہ کوئی مجبوری ہی ہو تو خیر ورنہ یوں نیک دل تھے۔

ان میں سے صرف ایک وہیں رہا جس کا نام چنگ تھا۔ اس زرد رو اور کم سخن بونے کا چہرا خوشحالی کے زمانے میں لنگور سے مشابہ ہوتا، لیکن اس وقت اس پر تردد اور فکر کے آثار تھے۔ وہ ایماندار تھا اور یقیناً اظہار ندامت کرنا چاہتا تھا۔ صرف ایک بھوکے بچے کی خاطر وہ اس ہنگامے میں شامل ہو گیا تھا۔ مٹھی بھر سیم کے بیج اس نے شلوکے کے نیچے چھپا رکھے تھے اور ڈر رہا تھا کہ زبان کھولی نہیں کہ راز افشا ہوا۔ اس لیے وانگ لنگ کو پشیمان و پریشان نگاہوں سے دیکھتا ہوا وہ بھی چل دیا۔

وانگ لنگ اس آنگن میں جا کھڑا ہوا جہاں سالہا سال سے وہ اپنی فصل کی گہائی کرتا آیا تھا اور جو اب مہینوں سے خالی پڑا ہوا تھا۔ گھر میں بوڑھے باپ یا ننھے بچّوں کے کھانے کے لیے کچھ نہ تھا ـــــــ اور نہ اس عورت کے لیے کچھ تھا جسے اپنے سوا ایک نئی جان کو غذا پہنچانا اور پروان چڑھانا تھا ـــــــ نوزائیدہ بچّہ جو زندگی کی ساری بے دردی کے ساتھ اپنی ماں کے گوشت و پوست کا رس چوسا کرتا ہے۔ لمحہ بھر تو وہ خوف و ہراس سے مبہوت سا رہا۔ بعد ازاں

اس خیال نے تسکین بخش شراب کی طرح اس کے دل کو تسلّی دی :

"وہ میری زمین تو نہیں چھین سکتے ۔ میرے جسم کی محنت اور دھرتی کے پھل کو کون چُرا سکتا ہے ۔ اگر میرے پاس چاندی ہوتی یا چاندی سے خریدا ہوا غلّہ ہوتا تو وہ اسے لے جاتے ۔ لیکن میرے پاس تو یہ زمین ہے اور اسے کوئی نہیں لے سکتا ۔"



باب ۹

اپنی چوکھٹ پر بیٹھے بیٹھے وانگ لنگ سوچنے لگا کہ کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ اس اُجاڑ گھر میں پڑے پڑے چوہوں کی موت مرنا کہاں کی دانائی ہے۔ اس کے سوکھے ہوئے جسم میں جس کے ارد گرد اس کی قبا کے تسمے ہر روز کچھ ڈھیلے پڑ جاتے تھے، عزم حیات کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اب جو اس کی زندگی اپنے عروج پر آ رہی تھی تو وہ اپنی بیہودہ قسمت کو اسے برباد کرنے کی اجازت کیسے دے دے۔ اس کے غصّے کی یہ حالت تھی کہ اسے کسی طرح ظاہر نہ کر سکتا تھا۔ کبھی کبھی تو اس پر جنون سا سوار ہو جاتا اور وہ باہر آ کر آسمان کو مُکّا دکھانے لگتا —— یہ ناہنجار آسمان جو ہمیشہ صاف و سرد اور بے ابر، سر کے اوپر پھیلا ہوا تھا۔

وہ بوکھلا کر پُکار اٹھتا: "اے آسمان میں رہنے والے بڈھے، تجھ جیسا پرانا پاپی کوئی نہیں ۔" زبان سے یہ نکلتے ہی وہ سراسیمہ ہوتا تو فوراً اس کا تدارک یہ کہہ کر کرتا: " اس سے زیادہ میری بُری حالت ہو ہی نہیں سکتی ۔"

ایک بار وہ نقاہت کے باوجود گھسٹتے ہوئے دھرتی ماتا کے مندر کو گیا اور اس بے حس دیوتا کے منہ پر کھکھار کر تھوک دیا۔ دیوی دیوتا کے آگے مہینوں سے اگر بتی نہ سلگائی گئی تھی اور ان کا کاغذی پیراہن بھی جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا اور

اس کے سوراخوں سے ان کے خاکی اجسام نظر آرہے تھے۔
وانگ لنگ نے غضبناک تیوریوں سے انھیں گھورا اور بلبلاتے
ہوئے گھر لوٹ کر بستر پر گر پڑا۔

اب ان میں سے کوئی پلنگ سے وقت پر نہ اٹھتا تھا۔
اس کی ضرورت ہی کیا تھی ۔ کم از کم ایک دو گھڑی کے لیے
تو نیند غذا کی کمی پوری کر ہی دیتی تھی ۔ دھان کی بھوسی تو
وہ سب ختم ہی کر چکے تھے ، اب پیڑوں کی چھال کی باری
تھی اور سارے علاقے کے لوگ ننگی پہاڑیوں پر گھاس ڈھونڈتے
پھر رہے تھے ۔ اگر کوئی ہفتوں بھی اس علاقے کا چکر لگاتا تو اسے کسی
چرند و پرند کا نشان نہ ملتا ۔

بچوں کے پیٹ خالی ہوا سے غباروں کی طرح پھول گئے تھے۔
گانوں کی سڑکوں پر کوئی کھیلتا ہوا بچہ نظر نہ آتا تھا ۔ بہت
ہوا تو وانگ لنگ کے دونوں بیٹے باہر آکر دھوپ میں بیٹھ
جاتے ، اس منحوس دھوپ میں جس کا سلسلہ کسی طرح ختم نہ
ہوتا تھا ۔ ان کے نرم و گداز بدن اب کانٹے کی مانند سوکھ
گئے تھے اور ہڈیاں بھی پرندوں کی ہڈیوں کی طرح نرم پڑ گئی
تھیں ، فرق یہ تھا کہ ان لڑکوں کے پیٹ پھولے ہوئے تھے
لڑکی دن رات دُلائی اوڑھے چپ چاپ پڑی رہتی تھی۔
پہلے تو اس کی چیخوں سے در و دالان گونج اٹھتے لیکن اب
اس نے خاموشی کا درس پڑھ لیا تھا اور وہ بے کچھ کہے سنے
منہ میں جو بھی دے دیا گیا اسے سڑکتے ہوئے پڑی رہتا

اس کا چھوٹا سا دھنسا ہوا منہ انھیں تکا کرتا، اس کے سوکھے ہوئے نیلے ہونٹ کسی پوپلی بڑھیا کے ہونٹوں کی طرح لٹکتے رہتے اور اس کی نزار کالی آنکھیں اِدھر اُدھر کچھ ڈھونڈا کرتیں۔

زندہ رہنے کی اس خواہش نے کسی نہ کسی طرح باپ کے دل کو نرم کر ہی دیا۔ اگر وہ تندرست اور ہنس مکھ ہوتی جیسا کہ اس کی عمر کا تقاضا تھا، تو وانگ لنگ اسے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا کیونکہ وہ لڑکی ہی تو تھی۔ لیکن اس کے حال زار کو دیکھ کر وہ آہستہ سے کہہ اُٹھتا:

بدنصیب بچّی ـــــــ ننھّی نادان"۔ ایک مرتبہ جو بچّی نے مسکرانے کی کوشش کی تو باپ اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا اور اپنے کمزور ہاتھوں میں اس کے ہاتھ لے لیے۔ اس کے بعد وہ اس کے برہنہ جسم کو گود میں لینے لگا۔ گرمی پہنچانے کے لیے وہ اسے کوٹ کے اندر چھپا لیتا اور چوکھٹ پر بیٹھ کر بنجر کھیتوں کا نظّارہ کیا کرتا۔

سب سے اچھی حالت بڑے میاں کی تھی، کیونکہ جو بھی میسّر ہوتا وہ بچّوں سے پہلے انھیں دیا جاتا۔ وانگ لنگ دل ہی دل میں فخر سے کہا کرتا کہ کوئی یہ الزام نہ دھر سکے گا کہ مرتے وقت میں نے اپنے باپ کو بھلا دیا تھا۔ خواہ اپنی بوٹیاں نوچ کر کیوں نہ دینا پڑیں میں بڑے میاں کو بھوکا نہ رہنے دوں گا۔ یہ بڈّھا دن رات لیٹا رہتا اور جو ملتا کھا لیتا۔ اب بھی اس میں اتنی سکت تھی کہ دوپہر کو دھوپ کھانے کے لیے باہر آ جاتا۔ ان میں سب سے

زیادہ خوش وہی تھا اور ایک دن اس نے اپنی بھرّائی ہوئی آواز میں —— جس پر یہ گمان ہوتا تھا گویا بانس کے جھرمٹ سے ہوا کا جھونکا گزر رہا ہو —— کہا:

"میں نے اس سے بھی بُرا زمانہ دیکھا ہے۔ میری آنکھوں کے آگے ماں باپ اپنے بچّوں کو کھا گئے ہیں۔"

وانگ لنگ نے ہیبت زدہ ہو کر جواب دیا: "میرے گھر قیامت تک یہ نہ ہوگا۔"

ایک روز اس کا پڑوسی 'چنگ' جو اب نقاہت کے مارے کوئی بھوت پریت معلوم ہوتا تھا دروازے پر آیا اور اپنے سوکھے ہوئے کالے ہونٹوں سے بمشکل یہ الفاظ نکالے۔

"شہر میں کتّے اور ہر قسم کے جانور کھانے کے لیے ہیں۔ یہاں حیوان تو حیوان ہم نے گھاس پات کا صفایا کر دیا ہے۔ اب کھانے کے لیے کیا رہ گیا ہے؟"

وانگ لنگ نے مایوسی سے سر ہلایا۔ اس کی گود میں وہ ادھ مری بھوکی پیاسی بچّی پڑی ہوئی تھی۔ وانگ لنگ نے اس کے سوکھے ہوئے چہرے کو اور اس کی تیز تیز اُداس آنکھوں کو دیکھا۔ اور جب اس کی نگاہیں ان سے دوچار ہوئیں تو بچّی کے چہرے پر وہ خفیف سا تبسّم آ ہی گیا جو باپ کے دل کو زخمی کر دیتا ہے۔

چنگ نے سر سے سر بھڑا کر کہا: "گاؤں میں آدم خوری شروع ہو گئی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ تمھارے چچا چچی نے اس کی ابتدا کی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ زندہ کیسے رہتے اور ان میں

سیر سپاٹے کی طاقت کہاں سے آئی ؟ سب جانتے ہیں کہ ان کے گھر اناج کا دانا بھی نہیں ۔"

وانگ لنگ نے اپنے پڑوسی کے سر سے جو کاسۂ عزرائیل معلوم ہوتا تھا ، اپنا سر خوف کے مارے ہٹا لیا ۔ یک بیک اس کا دل کسی نامعلوم ہیبت سے بیٹھ گیا ۔ وہ یوں اٹھ کھڑا ہوا گویا کسی وار سے بچنا چاہتا ہو ۔

اس نے پکار کر کہا : " ہم اس بستی کو چھوڑ دیں گے اور دکن کی راہ لیں گے ۔ اس عظیم الشان ملک میں کہیں نہ کہیں قحط پڑتا ہی رہتا ہے ۔ اس کے یہ معنی تو نہیں کہ یہ جابر خدا آدم کی ساری اولاد کو بھوکا تڑپا کر مار سکتا ہے ۔"

پڑوسی نے ٹھنڈے دل سے یہ باتیں سنیں اور اُداسی سے جواب دیا : " تم ابھی جوان ہو ہم دونوں میاں بیوی بوڑھے ہیں اور ایک لڑکی کے سوا کسی کا بار نہیں ۔ سو موت سے کیا ڈریں ۔"

اس پر وانگ لنگ بولا : " تم مجھ سے زیادہ خوش نصیب ہو مجھ پر بوڑھے باپ کے علاوہ چار بچوں کا بار ہے ۔ اگر ہم یہیں رہے تو کیا عجب کہ انسانیت کو بھول جائیں اور بھوکے بھیڑیوں کی طرح ایک دوسرے کو پھاڑ کھائیں ۔"

اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس نے جو کچھ کہا وہ بالکل صحیح ہے ۔ اولان کو آواز دی ، جو دن رات خاموش پلنگ پر پڑی رہتی تھی کیونکہ چولھے میں ایندھن تک کا نام نہ تھا ۔

" اٹھو جی ، سامان ٹھیک کرو ۔ ہمیں دکن چلنا چاہیے ۔"

اس کی آواز میں وہ امنگ تھی جو مہینوں سے نہ سنی گئی تھی۔ بچّوں نے حیرت سے سر اٹھایا، بڑے میاں بڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور اولان کمزوری کے باوجود چل کر دروازے تک آئی اور بولی:

"یہ بہت اچھی رائے ہے۔ مرنا ہی تو چلتے ہوئے کیوں نہ مریں۔"

اس کے پیٹ کا بچّہ کسی گرہ دار پھل کی طرح کولھوں میں اٹکا ہوا تھا، اس کے چہرے میں گوشت کا ذرّہ بھی نہ تھا اور کھال کے نیچے کی ہڈیاں نکیلے پتھروں کی طرح ابھری ہوئی تھیں۔ اس نے کہا:

"کل تک ٹھہر جاؤ، تب تک میرا پنڈا ہلکا ہو جائے گا۔ اس مردار کی حرکت سے میں اندازہ لگا سکتی ہوں۔"

"اچھا کل سہی۔" وانگ لنگ نے جواب دیا۔ اور جب اس کی نظر اپنی بیوی کے چہرے پر پڑی تو اسے خود سے زیادہ اس پر رحم آیا۔ یہ بے چاری پھر ایک بچّے کی تخلیق کر رہی ہے!

اس نے زیر لب کہا: "اس بے چاری سے چلا کیونکر جائے گا۔"

بادل ناخواستہ اس نے اپنے پڑوسی سے جو ہنوز کواڑ کا ٹیکا لگائے کھڑا ہوا تھا کہا: "اگر ممکن ہو تو للہ ایک ٹکڑا میری بیوی کو دے دو تاکہ اس کی جان بچ جائے پھر میں یہ بھول جاؤں گا کہ تم میرے گھر ڈاکہ ڈالنے آئے تھے۔"

پڑوسی نے شرما کر عاجزانہ کہا:

"اس روز کے بعد تمھارا خیال آتے ہی مجھے بے چینی ہوتی تھی۔ تمھارے کمینے چچا نے مجھے ورغلایا کہ تمھارے گودام غلّے سے بھرے ہوئے ہیں۔ اس خدائے قہار کی قسم کہ میرے پاس

تھوڑی سی سوکھی ہوئی لال سیم رہ گئی ہے جو چوکھٹ کی سل کے نیچے چھپی ہوئی ہے۔ میں نے اس خیال سے اسے چھپا رکھا تھا کہ مرنے سے پہلے پیٹ میں کچھ تو ہو، بھوکا تو نہ مروں۔ اس کا تھوڑا سا حصّہ میں تمھیں دیتا ہوں۔ کل تم دکن کی راہ لو۔ میں تم سے عمر میں زیادہ ہوں اور نہ میرا کوئی بیٹا ہے۔ پھر میں جیوں یا مروں اس سے کیا ہوتا ہے"۔

یہ کہہ کر وہ گھر گیا اور زرا دیر میں ایک انگوچھا لیے ہوئے لوٹا جس میں دو مٹھی سیم کی گرد آلو پھلیاں تھیں۔ انھیں دیکھتے ہی بچّے پھڑک اٹھے اور بڈّھے کی آنکھیں بھی چمک اٹھیں مگر وانگ لنگ نے ان سب کو دھتکار دیا اور کھانا اپنی بیوی کے پاس لے گیا۔ اس نے بمشکل سیم کی چند پھلیاں حلق کے نیچے اتاریں۔ اب زچگی کا وقت آگیا تھا اور وہ جانتی تھی کہ کچھ نہ کھایا تو دردِ زہ میں جان نہ بچے گی۔

وانگ لنگ نے اپنی مٹّھی میں چند پھلیاں چھپا رکھی تھیں۔ انھیں منہ میں رکھ کر اس نے خوب چبایا اور پھر یہ ملیدہ اپنی بیٹی کی زبان پر رکھ دیا۔ جب اس کے جبڑے چلنے لگے تو باپ کو ایسی تسکین ہوئی گویا خود اس کا پیٹ بھر رہا ہے۔

رات اس نے بچلے کمرے میں بسر کی۔ بڑے میاں کی کوٹھری میں دونوں لڑکے سو رہے تھے اور تیسرے کمرے میں اولان بچّہ پیدا کر رہی تھی۔ وہاں بیٹھے بیٹھے اس کی وہی حالت تھی جو پہلے بیٹے کی پیدائش کے وقت تھی۔ اب بھی اولان کو ایسے

موقعوں پر اپنے شوہر کی قربت ناپسند تھی۔ زچگی کے وقت وہ تنہائی چاہتی تھی اور اس کے بعد کمرے میں گھوم پھر کر خون کے تمام دھبّوں کو جانوروں کی رسم کے مطابق مٹا دیتی تھی۔

وانگ لنگ اس تیز چیخ کا بے صبری سے انتظار کرنے لگا جس سے اب وہ بخوبی آشنا تھا، اور یہ انتظار اسے بیچین کرنے لگا۔ اب وہ لڑکے لڑکی کی تمیز کو بھول چکا تھا ــــــ پیٹ تو دونوں کا پالنا ہوگا۔

"اس زندگی پر ہزار لعنت" ــــــ وہ یہ بڑبڑا ہی رہا تھا کہ ایک کمزور سی چیخ فضا میں ایک لمحے کے لیے گونج اٹھی۔ اس نے تلخی سے کہا: "لیکن موت بھی کتنی بے رحم ہے" یہ کہہ کر وہ کان لگا کر سننے لگا۔

دوبارہ رونے کی آواز آئی اور مکان میں ایک پُراسرار خاموشی چھا گئی۔ عرصے سے ہر طرف سنّاٹا تھا ــ یہ بے حرکتی کا سنّاٹا تھا، ان آدمیوں کی بے حرکتی جو اپنے اپنے گھر موت کا انتظار کرتے پڑے تھے۔ یہ سب وانگ لنگ سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ خوف زدہ ہو گیا۔ اولان کے کمرے کے آگے جا کر اس نے صدا دی اور اپنی آواز سن کر اسے ذرا سہارا بندھا۔

"تم کیسی ہو؟" اس نے پوچھا اور سننے لگا۔ کہیں اس اثنا میں وہ مر تو نہیں گئی! ۔ لیکن اس نے ایک خفیف سی سرسراہٹ سنی۔ وہ چل پھر رہی تھی اور اس کی آواز آہ بن گئی تھی۔ اس نے کہا: "اندر آؤ۔"

جب وہ اندر گیا تو دیکھا کہ اولان پلنگ پر پڑی ہوئی ہے
اور اس کا جسم ڈھنکا ہوا ہے۔ وہ تنہا تھی۔
"بچّہ کہاں ہے؟"
اس کے ہاتھ نے زمین کی طرف اشارہ کیا اور وانگ لنگ
نے دیکھا کہ زمین پر بچّہ کی لاش پڑی ہوئی ہے۔
"مردہ؟"
"ہاں مردہ" اولان نے زیرلب کہا۔
مرد نے جھک کر مٹھی بھر ہڈیوں کے اس ہیولے کو دیکھا۔
یہ لڑکی تھی۔ وہ یہ کہنا ہی چاہتا تھا کہ "میں نے اس کے رونے
کی آواز سنی تھی" کہ اس کی نگاہ عورت کے چہرے پر پڑی۔ اس کی
آنکھیں بند تھیں، مردنی چھائی ہوئی تھی اور ہڈیاں ابھر آئی
تھیں — ایک خاموش نیم جان لاش جو اپنا فرض انتہائی حد تک
ادا کر چکی تھی۔ وانگ لنگ کو کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس
ساری بپتا میں اس کے جسم پر تو کسی غیر کا بار نہ تھا۔ لیکن اس
عورت پر یہ فاقے کیسے کٹھن گزرے ہوں گے کیونکہ اس کے
بطن میں ایک بھوکا بچّہ 'روٹی روٹی' کی پکار مچایا کرتا تھا اور اپنی
بقا کے لیے اس سے لڑ رہا تھا۔
بے کچھ کہے سنے وہ اس ننھی لاش کو دوسرے کمرے میں
لے گیا اور ڈھونڈھ ڈھانڈ کر ایک پھٹی ہوئی چٹائی نکالی جس میں
اسے لپیٹا۔ بچّی کا سر جدھر چاہو ادھر مڑ جاتا تھا اور اس کی گردن
پر دو گھاؤ بنے ہوئے تھے۔ تاہم وانگ لنگ کو اپنے کام سے

مطلب تھا۔ چٹائی لیے ہوئے وہ گھر سے اتنی دور نکل گیا جتنی دور جانے کی سکت اس میں تھی اور پھر اسے ایک پرانی قبر کے کنارے رکھ دیا۔ یہ قبر وانگ لنگ کے پچھمی کھیت کے ڈانڈے پر دوسری قدیم اور شکستہ قبروں کے ساتھ واقع تھی۔ ابھی اس نے لاش نیچے رکھی ہی تھی کہ ایک کتا اس کے پیچھے آکھڑا ہوا۔ اور یہ کتا اتنا بھوکا تھا کہ وانگ لنگ کے پھینکے ہوئے پتھر کی چوٹ کھا کر بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اب خود اس کی نقاہت کا یہ عالم تھا کہ پانو لڑکھڑانے لگے اور اسے سر چھپائے ہوئے گھر کی راہ لینی ہی پڑی۔

"شکر کے سوا کیا چارہ ہے" اس نے آپ ہی آپ کہا اور اس وقت اس کی مایوسی کی انتہا نہ تھی۔

دوسرے دن صبح جب اس نے دیکھا کہ سورج اسی شان سے نیلے آسمان میں طلوع ہوا ہے۔ تو اسے اس خیال کی حقیقت خواب موہوم سے زیادہ نہ معلوم ہوئی کہ اپاہج باپ، بیمار بیوی اور کمزور بچّوں کے ساتھ دور کا سفر کرنا ہے۔ سیکڑوں میل کی مسافت یہ لوگ کس بل بوتے پر طے کریں گے؟ اور کسے خبر کہ دکن میں روٹی ملتی ہے یا نہیں۔ اس بے بادل آکاس کا اور چھور تو کہیں نظر آتا نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ رہی سہی طاقت ختم کر کے وہ جہاں پہنچیں وہاں بھی بھوکے ننگوں کے سوا اور کوئی نہ ہو ــــ اور یہ سب ان کے لیے اجنبی ہوں۔ اس سے تو گھر میں ہی پڑے پڑے مرجانا بہتر ہے۔ چوکھٹ پر بیٹھے ہوئے وہ یہ سب سوچتا رہا اور ان بنجر کھیتوں کو دیکھتا رہا جن میں سے رزق کے قسم کی

ہر چیز نوچ لی گئی تھی۔

اس کے پاس پیسے کے نام دھیلا بھی نہ تھا۔ عرصہ ہوا کہ آخری روپیہ خرچ ہو گیا تھا۔ اور ر ...ی سے کیا کام چلتا جب کہ خریدنے کو کچھ نہ تھا۔ وہ سنا کرتا تھا کہ شہر کے بنیے بقال اپنے لیے اور امیروں کے لیے غلّہ جمع کر رہے ہیں، لیکن اب اسے ان پر بھی غصّہ نہ آتا تھا۔ شہر میں لنگر کھلا ہوا ہوتا تو بھی وہاں تک جانے کی طاقت اس میں نہ تھی اور سچ تو یہ ہے کہ اب اس کی بھوک بھی مر گئی تھی۔

پیٹ کی وہ کرید جو پہلے اس کے لیے سوہان روح تھی، اب ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔ اپنے کھیت کے کسی خاص مقام سے تھوڑی سی مٹّی کھود کر وہ بچّوں کو دے دیتا، مگر خود اسے منہ سے نہ لگاتا۔ کئی روز سے وہ سب پانی میں گھول کر یہ مٹّی کھاتے اور اسے "خاکِ رحمت" کہا کرتے تھے کیونکہ اس میں خفیف سی غذائیت تھی، مگر اتنی خفیف کہ اس سے زندگی نہیں چل سکتی تھی۔ جب اس مٹّی کی صورت شوربے کی سی ہو جاتی تو کچھ دیر کے لیے بچّوں کو سکون ملتا اور ان کی خالی اور پھولی ہوئی آنتوں میں کہنے کو کچھ پڑ جاتا۔ اسے اُن سیموں کو چھونا ہرگز گوارا نہ تھا جو اب بھی اولان کی مٹّھیوں میں بند تھیں۔ اور وقتاً فوقتاً جب وہ چبانے لگتی تو وانگ لنگ کو ایک طرح کا اطمینان ہوتا تھا

ایک روز وہ چوکھٹ پر بیٹھے ہوئے اس خیال سے اپنے کو مگن کر رہا تھا کہ لیٹے لیٹے کس طرح دم نکل جائے گا۔

اتنے میں اس نے کئی آدمیوں کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ جب وہ قریب آئے تو اس نے اپنے چچا کو تو پہچانا لیکن اس کے تین ساتھیوں سے وہ ناواقف تھا۔

چچا نے مصنوعی شفقت کے انداز میں پکار کر کہا: "بھئی تم سے ملے کتنی مدت گزر گئی"۔ اور قریب آکر بولا "تم تو خوب چاق چوبند نظر آتے ہو۔ اور تمھارے ابّا یعنی بھائی جان کا کیا حال ہے؟"

وانگ لنگ نے چچا کو غور سے دیکھا۔ وہ جھٹک تو ضرور گیا تھا لیکن اس کے تن و توش سے فاقے کے آثار ہرگز نمایاں نہ تھے۔ وانگ لنگ کے لاغر بدن میں زندگی کی جو ذرا سی آنچ رہ گئی تھی وہ اس شخص کو جلا کر راکھ کردینے کے لیے سلگ اٹھی۔ اس نے تلخی سے کہا: "آپ کی کھلائی پلائی میں تو کوئی فرق نہ آیا ہوگا"۔ اس نے ان اجنبیوں کی یا کسی ادب قاعدے کی کوئی پروا نہ کی۔ اس کے سامنے تو صرف اپنے توندل چچا کی مورت تھی۔ چچا کی آنکھیں یہ سنتے ہی کھلی کی کھلی رہ گئیں اور اس کے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھ گئے۔

"کھلائی پلائی!" وہ چلّا اٹھا۔ "کاش تم نے میرے گھر کی صورت دیکھی ہوتی! وہاں کسی چڑیا کو ایک تنکا تک نہ ملے گا۔ تمھیں یاد ہے کہ میری بیوی کیسی موٹی تازی تھی؟ اس کے رنگ میں کیسا نکھار تھا؟ اب تو وہ بانس پر سکھائے ہوئے لہنگے کی طرح ہے ——— ہڈیوں کا کھڑکھڑاتا ہوا ڈھانچہ ہے۔ بچّوں میں اب صرف چار رہ گئے ہیں۔ تینوں ننھے بچّوں کو موت

لے گئی۔ اور میری جو حالت ہے وہ تم خود ملاحظہ کرلو۔" آستین کے کونوں سے وہ اپنی آنکھیں پونچھنے لگا۔

وانگ لنگ نے بے لطفی سے کہا: "تاہم آپ نے کھانے میں کسر نہ چھوڑی۔"

چچا نے تڑاق سے جواب دیا: مجھے تو تمھارے اور قبلہ بھائی جان کے سوا کسی کا خیال نہ تھا۔ اور میں اس کا ثبوت دینے کو تیار ہوں۔ شہر کے ان بھلے مانسوں سے تھوڑی سی خوراک میں نے اس وعدے پر قرض لی کہ اس سے تن میں جو سکت آئے گی وہ میں اس کار خیر میں صرف کروں گا کہ ان کے لیے اس گانو میں کچھ فروختنی زمین تلاش کروں۔ اور اس وقت مجھے تمھارے زرخیز کھیتوں کا خیال تھا کیونکہ تم میرے بھتیجے جو ٹھہرے۔ یہ لوگ تمھاری زمین خریدنے آئے ہیں اور اس کے عوض تمھیں روپیہ — روٹی — زندگی — سب کچھ دیں گے۔" یہ کہہ کر چچا نے بڑی شان سے اپنے پھٹے پرانے لبادے کو درست کیا اور ہاتھ باندھ کر پیچھے کھڑا ہو گیا۔

اب وانگ لنگ بھی ذرا چونکا۔ نہ تو وہ اٹھا اور نہ ان اجنبیوں کو پہچان سکا۔ لیکن ایک نگاہ میں اسے معلوم ہو گیا کہ واقعی یہ تینوں شہری ہیں اور اصلی ریشم کے ڈھیلے ڈھالے لبادوں میں ملبوس ہیں۔ ان کے ہاتھ نرم تھے اور ناخن لمبے۔ ان کے چہرے پُرخوری کی وجہ سے ابھرے ہوئے اور ان کی رگیں خون کے دباؤ سے پھٹی پڑتی تھیں۔ اسے ان

سب سے انتہائی نفرت ہوئی۔ شراب و کباب سے لذت آشنا یہ شہر والے اُس مصیبت زدہ کے آگے کھڑے تھے جس کے ادھ مرے بچّے کھیت کی مٹّی گھول گھول کر پی رہے تھے۔ اور یہ آئے تھے اس کی فاقہ کشی سے فائدہ اٹھا کر اس کی زمین خریدنے کے لیے۔ وانگ لنگ نے اُنھیں ایسے غصّے سے دیکھا کہ پچکے ہوئے چہرے پر اس کی آنکھیں بہت بڑی بڑی معلوم ہونے لگیں۔

اس نے جواب دیا: "میں اپنی زمین نہیں بیچنا چاہتا۔"

یہ سن کر چچا آگے بڑھا۔ اسی وقت وانگ لنگ کا چھوٹا بیٹا گھٹنوں کے بل گھسٹتا ہوا چوکھٹ تک آیا۔ اب اس میں پانو چلنے کی طاقت نہ رہی تھی، اس وجہ سے وہ پھر بچپن کی طرح گھٹنوں چلنے لگا تھا۔

چچا نے پوچھا: "کیا یہ تمھارا بیٹا ہے؟ پچھلی گرمیوں میں جب میں نے اسے ایک پیسہ دیا تو یہ کیسا موٹا تازہ تھا!"

وہ سب بچے کو دیکھنے لگے۔ اس دوران میں وانگ لنگ کی آنکھوں میں کبھی آنسو نہ آئے تھے لیکن اب وہ ضبط نہ کر سکا. اور چپ چپ رونے لگا۔ آنسو کی بوندیں درد پاروں کی طرح گلے میں جمع ہوئیں اور گالوں پر بہنے لگیں۔

بالآخر اس نے دھیرے سے پوچھا: "تم نے کیا دام لگائے ہیں؟" ان تین بچوّں اور بڑے میاں کے لیے روٹیوں کا انتظام تو کرنا ہی ہوگا میاں بیوی کا کیا ـــــ وہ تو کھیت میں قبر کھود کر اس میں اس وقت تک پڑے رہ سکتے ہیں جب تک موت

نہ آجائے۔ جو بھی ہو، ابھی تو ان لوگوں سے معاملہ ہے۔

یہ سن کر ایک اجنبی نے جس کی ایک آنکھ کانی تھی اور چہرے میں ہی دفن تھی، نہایت چکنی چپڑی آواز میں کہا:

"میاں اس بھوکے بچّے کے نام پر ہم تمھیں دوسروں سے زیادہ بہتر قیمت دیں گے۔ ہم تمھیں ———" ایک لمحہ رک کر اور پھر روکھے پن سے ——— "ہم تمھیں ایک ایکڑ کے لیے سو اکنّیاں دیں گے۔"

وانگ لنگ نے تلخ سا قہقہہ لگایا: "خوب، یہ کہیے کہ آپ یہ زمین خیرات میں لینے آئے ہیں۔ میں نے بیس گنا زیادہ قیمت دے کر اسے خریدا تھا۔"

دوسرے شہریے نے جواب دیا: "لیکن تم نے کسی فاقہ زدہ کو اتنے دام نہ دیے ہوں گے۔" یہ شخص تھا تو مختصر سا اور اس کی ناک اونچی نکیلی تھی لیکن آواز اتنی زوردار اور درشت کہ سن کر حیرت ہوتی تھی۔

وانگ لنگ ان تینوں کو گھورنے لگا۔ ان تینوں کو اپنی کامیابی پر کیسا اعتماد تھا! ۔ سچ ہے کہ اپنے بھوکے بچّوں اور بوڑھے باپ کے لیے کسی سے کیا بعید ہے۔ خود سپردگی کے جذبے نے اس کے سینے میں ایسے شدید غصّے کی شکل اختیار کرلی جس سے وہ خود اپنی زندگی میں واقف نہ ہوا تھا۔ وہ ان لوگوں پر یوں جھپٹا جیسے کوئی کتّا اپنے دشمن سے لپٹ پڑے۔

وہ گلا پھاڑ کر چلّایا: "میں ہرگز اپنی زمین نہ بیچوں گا۔

میں کھیتوں کو کھود کھود کر ان کی مٹی بچوں کو کھلاؤں گا اور اگر وہ مر گئے تو انھیں اسی زمین میں گاڑ دوں گا۔ میں خود اپنی بیوی اور باپ کے ساتھ اس دھرتی پر مرنے کے لیے تیار ہوں، جس نے ہمیں پیدا کیا ہے۔"

وہ زار زار رو رہا تھا اور اس کا غصہ دم بھر میں ہوا کی طرح اُڑ گیا اور وہ وہیں کھڑا ہوا آنسو بہانے لگا۔ مہاجن زیرلب مسکراتے ہوئے وہیں ٹھہرے رہے اور اس کے چچا نے بھی کوئی حرکت نہ کی۔

اتنے میں اولان چوکھٹ پر آئی اور اس نے اپنے بے رنگ انداز میں گویا یہ روزمرہ کی باتیں ہوں، ان سے کہا:

"ہم زمین تو کسی صورت میں نہ بیچیں گے، کیونکہ دکن سے واپسی کے بعد ہمارے پاس کوئی ذریعۂ معاش نہ رہے گا۔ لیکن ہم میز، پلنگ، بستر، چاروں بنچیں اور دیگ الگ کرنے کو آمادہ ہیں۔ البتہ ھل بکھر وغیرہ الگ نہ کریں گے اور نہ زمین بیچیں گے۔"

اس کی آواز کے استقلال میں وانگ لنگ کے غصے سے زیادہ طاقت نہ تھی۔ چچا نے سٹپٹا کر پوچھا:

"کیا تم واقعتاً دکن جا رہے ہو؟"

کانے مہاجن نے اپنے ساتھیوں سے کچھ سرگوشیاں کیں اور مڑ کر کہا: "اس دیمک خوردہ لکڑ کا مول ہی کیا، اس سے صرف ایندھن کا کام لیا جا سکتا ہے — سارے کباڑ کے لے دو رُپے سے

زیادہ نہ ملیں گے ـــــ لینا ہے تو لو ورنہ جانے دو۔"

حقارت سے یہ کہہ کر وہ چلا ہی تھا کہ اولان نے جواب دیا:

"ایک پلنگ بھی دو روپے میں نہیں مل سکتا۔ خیر تمھارے پاس نقد دام ہیں تو نکالو اور سامان لے جاؤ۔"

کانے نے بٹوے سے روپے نکال کر اولان کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ تینوں مہاجن گھر میں داخل ہوئے اور میز، بنچ، بستر کے ساتھ پلنگ اور تندور میں چنی ہوئی دیگ تک اکھاڑ لے گئے۔ جب وہ بڑے میاں کی کوٹھری میں گھسے تو چچا باہر ہی کھڑا رہ گیا۔ وہ بڑے بھائی کو منہ دکھانا نہ چاہتا تھا اور نہ اس کا پلنگ چھنتے ہوئے اور اسے زمین پر لیٹے ہوئے دیکھنے کی جرأت تھی۔ جب یہ مصیبت ٹلی اور سارے مکان میں دو ھل بکھر کے سوا کچھ نہ رہا تو اولان نے اپنے شوہر سے کہا:

اب ہمیں فوراً روانہ ہو جانا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ روپے خرچ ہو جائیں اور مکان کی شہتیر بھی بک جائیں اور واپسی کے بعد کہیں سر چھپانے کی جگہ نہ ملے۔"

وانگ لنگ نے غمناک آواز میں کہا: "ہاں چل ہی پڑیں۔"

بہت دور، واپس لوٹتے ہوئے مہاجن نظر آرہے تھے اور ان کی طرف دیکھ کر وانگ لنگ کہنے لگا: "زمین اب بھی میری ہے ـــ اب بھی میری ہے۔"



باب ۱۰

اب کواڑ کے پٹوں کو ان کی چول پر بٹھانے اور لوہے کی زنجیر کو مضبوطی سے بند کرنے کے سوا کوئی کام باقی نہ تھا۔ تن کے کپڑوں کے سوا ان کے پاس اور کچھ نہ تھا۔ ہر بچے کے ہاتھ میں اولان نے ایک رکابی اور بانس کی تیلیاں تھما دیں اور دونوں لڑکوں نے انھیں اس اشتیاق سے سنبھالا گویا یہ طعام کا پیالہ ہے۔ اس ڈھب سے وہ کھیتوں سے ہوتے ہوئے اپنی مہم پر روانہ ہوئے اور یہ مختصر سا ماتمی جلوس اتنا آہستہ خرام تھا کہ یہ قیاس ہی نہ ہو سکتا تھا کہ وہ کبھی شہر پناہ تک پہنچ بھی سکے گا۔

بچی کو وانگ لنگ، گود میں لیے چلتا رہا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ بڑے میاں گر پڑیں گے، تو اس نے بچی ماں کے سپرد کی اور جھک کر بڑے میاں کو پیٹھ پر لاد ا اور ان کی چرمری ہڈیوں کے بار سے لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھا۔ دھرتی ماتا کے مندر کے سامنے سے وہ چپ چاپ گزر گئے، وہاں جہاں دونوں بت دنیا جہان سے بے نیاز بیٹھے رہتے تھے۔ سرد و تند ہوا کے باوجود کمزوری کے مارے وانگ لنگ پسینے سے شرابور ہو گیا۔ یہ ہوا ان کے خلاف تھی اور متواتر تھپیڑے لگا رہی تھی یہاں تک کہ دونوں لڑکے رو پڑے۔ وانگ لنگ، یہ کہ کر انھیں پھسلانے لگا:

ایسے جواں مرد بھی کبھی روتے ہیں! ۔ اور پھر تم تو دکن جا رہے ہو

جہاں گرمی ہے اور روز کھانا ملتا ہے ـــــــ ہم سب باریک چاول کھایا کریں گے ـــــ اور تم اتنا کھاؤ گے کہ چھک جاؤ گے۔"

زرا زرا دیر راہ میں سستاتے ہوئے وہ شہر کے دروازے پر پہنچے جہاں کی خنکی کسی زمانے میں وانگ لنگ کو مرغوب تھی۔ لیکن اس وقت وہ ٹھنڈی ہوا کے ان جھکڑوں پر بہت جھنجلایا جو اس زور شور سے سنسنا رہے تھے جیسے پہاڑیوں میں برفانی چشمے۔ راستے میں کیچڑ ہی کیچڑ تھی اور برف کے ریزے سوئی کی طرح چُبھتے تھے۔ لڑکوں سے چلا نہ جاتا تھا اور اولان بچّی کو کاندھے پر لادے لادے تھک کر چور ہو گئی تھی۔ وانگ لنگ نے بوڑھے باپ کو اس راستے کے پار لے جاکر بٹھایا اور پھر لوٹ کر ایک کے بعد دوسرے بچّے کو لاد کر لے گیا۔ جب یہ مہم سر ہو چکی تو پسینہ مینہ کی طرح اس کے جسم پر بہنے لگا اور وہ دیر تک ہانپتے ہوئے دیوار کا سہارا لیے آنکھیں بند کیے کھڑا رہا۔ اس کے عزیز کانپتے ہوئے آس پاس کھڑے اس کا منہ دیکھتے رہے۔

اب وہ سب بڑی حویلی کے پاس سے گزر رہے تھے۔ لیکن اس کے آہنی دروازے مقفل تھے اور پتھر کے شیر مٹیالے ہو گئے تھے۔ اس کی سیڑھیوں پر کچھ دبلے پتلے انسان پڑے ہوئے قحط زدہ نگاہوں سے بند کواڑوں کو تاک رہے تھے۔ جب وانگ لنگ اپنے ماتم انگیز جلوس کے ساتھ ان کے سامنے آیا تو ایک نے نحیف آواز میں پکار کر کہا:

"ان امیروں کے دل دیوتاؤں کے دل کی طرح بے حس ہیں

اب بھی وہ چاول کھاتے ہیں اور چاول کی شراب بناتے ہیں۔ اور ایک ہم ہیں کہ بھوکے مر رہے ہیں۔"

ایک دوسرے نے یہ فریاد کی:

اگر مجھ میں ذرا بھی طاقت ہوتی تو ان دروازوں اور حویلیوں میں آگ لگا دیتا خواہ خود بھی اس آگ میں جل مرتا۔ ہوانگ گھرانے پر ہزار پھٹکار۔"

وانگ لنگ نے اپنی زبان سے کچھ نہ کہا اور وہ سب دکن کے سمت چلے گئے۔

شہر سے نکل کر جب وہ دکن کی سڑک پر آئے تو ان کی چال اتنی سست تھی کہ شام سر پر آگئی اور اندھیرا پھیلنے لگا۔ اتنے میں وہ کیا دیکھتے ہیں کہ انسانوں کا ایک انبوہ دکن کی طرف جا رہا ہے۔ وانگ لنگ سوچ ہی رہا تھا کہ دیوار کا کون سا کونا رات کے بسیرے کے لیے مناسب ہے کہ یک بیک اس نے اپنے کو ایک بھیڑ کے اندر پایا۔ جو آدمی اسے ڈھکیل رہا تھا اس سے اس نے پوچھا:

"یہ سب لوگ کہاں جا رہے ہیں؟"

جواب ملا: "ہم سب قحط کے مارے ہوئے ہیں۔ ریل گاڑی کی تلاش میں جا رہے ہیں جو ہمیں دکن لے جائے گی۔ وہ یہیں پاس سے روانہ ہوتی ہے اور ہم جیسے غریب بہت تھوڑے سے کرائے میں اس پر سفر کر سکتے ہیں۔"

ریل گاڑی! اس کا نام تو سب نے سنا تھا۔ وانگ لنگ نے چائے خانوں میں اکثر سنا تھا کہ ڈبوں کی قطار زنجیر سے بندھی

ہوتی ہے اور اسے کوئی حیوان یا انسان نہیں بلکہ ایک انجن کھینچتا ہے جو اساطیری دیوؤں کی مانند آگ اور پانی تھوکتا چلتا ہے۔ کئی مرتبہ اس نے ارادہ کیا کہ چھٹی کے دن اس کا تماشا دیکھنے جائے۔ لیکن کھیت میں کوئی نہ کوئی کام نکل آتا تھا اور چونکہ وہ شہر کے شمال میں رہتا تھا اتنی دور نہ آسکتا تھا۔ پھر جس چیز کو وہ جانتا بوجھتا نہ ہو اس سے جھجک بھی ہوتی تھی۔ روٹیوں کے سوا اور کسی مسئلے کو جاننا انسان کے لیے ضروری نہیں۔

لیکن یہ خبر سن کر اس نے رُکتے رُکتے بیوی سے پوچھا:

"کیا ہم بھی ریل گاڑی میں سفر کریں؟"

سارا کنبہ غیروں سے الگ ہٹ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا اور فکر و ہراس سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگا۔ فرصت کی ان گھڑیوں کو غنیمت جان کر بڑے میاں اور بچّے زمین پر لیٹ گئے اور انھوں نے ان لوگوں کی مطلق پروا نہ کی جو آس پاس چل پھر رہے تھے۔ بچّی اب بھی اولان کی گود میں تھی لیکن اس کے چہرے پر کچھ ایسی مردنی چھائی ہوئی تھی کہ وانگ لنگ سب کو بھول کر گھبرا کر پکار اٹھا: "کیا یہ باندی مر گئی؟"

اولان نے سر ہلا کر جواب دیا: "اب تک تو زندہ ہے۔ سانس آجا رہا ہے۔ لیکن آج رات کو وہی کیا ہم سب مر جائیں گے اگر ——"

اس نے اس انداز سے اپنے شوہر کو دیکھا گویا اپنا مطلب الفاظ سے ادا نہیں کر سکتی۔ اس کے چوڑے چکلے چہرے سے تکان کے نشان ہویدا تھے۔ وانگ لنگ نے جی ہی جی میں سوچا کہ اگر آج

کی طرح کل بھی دن بھر پیدل چلنا پڑا تو رات کو کوئی زندہ نہ بچے گا۔ اس لیے اس نے خوش ہوتے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

"میرے بیٹو، اٹھو اور اپنے دادا کو سہارا دو۔ ہم ریل گاڑی میں بیٹھ کر دکن جائیں گے۔"

معلوم نہیں ان سے اٹھا جاتا یا نہیں۔ لیکن اسی وقت اندھیرے سے ایک ہیبت ناک آواز آئی اور آگ اگلتی ہوئی دو آنکھیں چمک پڑیں۔ اب سب لوگ چیختے چلّاتے اس کی طرف دوڑنے لگے۔ یہ بھیڑ کبھی انھیں اِدھر ڈھکیل دیتی تھی اور کبھی اُدھر لیکن کسی نہ کسی طرح وہ سب ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے رہے۔ بالآخر معلوم نہیں کیسے اس کہرام اور دھکّا دھکّی میں وہ ایک چھوٹے سے دروازے اور ایک صندوق نما ڈبّے کے سامنے جا پہنچے۔ اور پھر یہ انجن انھیں لیے ہوئے چنگھاڑتا ہوا، تاریکی کے پردے کو چیر کر آگے چلنے لگا۔



باب ۱۱

جس کارندے کو وانگ لنگ نے سو میل کی مسافت کے کرایے کے لیے دو رُپے دیے اس نے اسے کچھ پیسے واپس کیے۔ جب گاڑی کہیں ٹھہری اور ایک خوانچے والے نے کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر تھال بڑھا دیا تو اس نے چار روٹیاں اور بچّی کے لیے کٹورا بھر چاول خریدا۔ مدتوں سے انھیں ایسی غذا میسّر نہ آئی تھی۔ لیکن جب وہ سامنے آئی تو انھیں مطلق اشتہا نہ رہی اور بہت چمکارنے پھسلانے کے بعد بچّوں نے اسے زہر مار کیا مگر بڑے میاں کا پوپلا منہ نہ تھما اور وہ برابر روٹی چباتے رہے۔ اِدھر ریل گاڑی چنگھاڑتی لڑکھڑتی اپنی راہ چلی جا رہی تھی، اُدھر جو لوگ ان کے قریب آ پڑتے اُن سے یہ بڑی شفقت سے یوں مخاطب ہوتے: "میاں کھانا تو ہی ہی۔ میری بلا سے اگر ان آنتوں کو کام کی عادت نہیں رہی ہے۔ انھیں رزق ملنا چاہیے۔ ان کی کاہلی کی وجہ سے میں کیوں مروں؟" اور سب لوگ اس مسکراتے ہوئے بوڑھے کو دیکھ کر ہنس پڑے۔ جس کی سفید چھدری ڈاڑھی ٹھڈّھی پر اٹھکھیلیاں کر رہی تھی۔

وانگ لنگ نے سب پیسے خرچ نہ کیے۔ اُن ٹٹوں کے لیے اس نے دام بچا رکھے جن سے دکن میں جھونپڑی کھڑی کرنی تھی۔ ریل کے ڈبّے میں ایسے ہم سفر بھی تھے جو پہلے بھی

دکن جا چکے تھے۔ کچھ تو ایسے تھے کہ جو ہر سال دکن کے خوش حال علاقے کا دورہ کرتے تاکہ کام یا بھیک کے ذریعے تھوڑے بہت رُپے جمع کر لیں جن سے اور کچھ نہیں تو ایندھن کا ہی کام چلے۔ جب وانگ لنگ اپنے ماحول سے مانوس ہوگیا اور کھڑکی سے بھاگتی ہوئی زمین کو دیکھتے دیکھتے تھک گیا تو پھر ان مسافروں کی باتیں سننے لگا۔ وہ یوں سنا سنا کر باتیں کر رہے تھے جیسے سیانے کم سمجھوں سے کرتے ہیں۔

ایک شخص نے جس کے ہونٹ اونٹ کی تھوتھنی کی طرح لٹک رہے تھے رائے دی: "پہلے چھ ٹکّے خریدنا ایک ایک آنے کے، اور اگر گنوار ہی بنے رہے تو ایک ایک کے تین تین آنے دینے ہوں گے اور یہ محض حماقت ہوگی۔ مجھے یہ سب خوب معلوم ہے۔ دکنی مالدار ہوا کریں مگر مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔" سر ہلاتے ہوئے وہ آس پاس دیکھنے لگا کہ لوگ اسے سراہ رہے ہیں یا نہیں۔

وانگ لنگ تردد سے یہ گفتگو سن رہا تھا۔ "اور اس کے بعد؟" اس نے پوچھا۔ وہ ڈبّے کے فرش پر اکڑوں بیٹھا ہوا تھا کیونکہ یہ ڈبّا لکڑی کا ایک صندوق سا تھا جس میں بیٹھنے کا کوئی انتظام نہ تھا اور فرش کی دراڑوں سے دھول اور ہوا چھن چھن کر آتی تھی۔

گاڑی کی چھک چھک کے شور سے بلند ہو کر راوی کی آواز گونج اٹھی۔ "اس کے بعد اپنی جھونپڑی بناؤ اور پھر بھیک مانگنے جاؤ۔ لیکن اس سے پہلے خاک دھول اور چیتھڑوں سے اپنی قطع

ایسی بنالو کہ دیکھ کر ترس آئے۔"

وانگ لنگ نے آج تک بھیک نہ مانگی تھی اور دکن کے اجنبیوں کے آگے ہاتھ پھیلانے کا خیال اسے سخت ناگوار تھا۔

"کیا بھیک کے سوا اور کوئی چارہ نہیں؟" اس نے پوچھا۔

تھوتھنی درازے جواب دیا: "ایک یہی صورت ہے، مگر کھا پی کر بھیک مانگنے نکلنا۔ دکن میں چاولوں کی وہ بہتات ہے کہ صبح کسی بھی لنگرخانے میں چلے جاؤ اور پیٹ بھر کر کھالو۔ پھر آرام سے بھیک مانگو اور دہی لہسن اور گوبھی خرید لاؤ۔"

وانگ لنگ ذرا ہٹ کر دیوار کی طرف منہ کرکے بیٹھ گیا بٹوے میں بچے کھچے پیسوں کو ٹٹولنے لگا۔ چھٹوں کے دام کے علاوہ سب کے لیے ایک وقت کی خوراک نکال کر بھی تین آنے بچ رہتے ہیں۔ اسے کچھ تسلّی ہوئی کہ نئی زندگی شروع کرنے کا کوئی سہارا تو ہے۔ لیکن ہاتھ میں کاسہ لیے ہوئے راہ چلتے سے سوال کرنے کا خیال اس کے لیے تکلیف دہ تھا۔ بڑے میاں اور بچّوں ——— عورت تک سے یہ ہو سکتا ہے، لیکن وہ خود کیونکر اس کا خوگر ہوگا۔

لہٰذا ایک بیک لوٹ کر وہ اس راوی سے پوچھ بیٹھا: "کیا وہاں ہاتھ کا کوئی کام نہیں؟"

اس نے حقارت سے فرش پر تھوک کر جواب دیا: "کام! جی، توندل سیٹھوں کو رکشا پر کھینچتے رہو۔ دھوپ میں بھاگے بھاگے پھرو تو لہو پسینہ بن کر بہنے لگتا ہے اور جب رک جاؤ تو پسینہ برف کی طرح جم جاتا ہے۔ ایسے کام سے بھیک ہزار درجہ بہتر!" اور

اس نے ایک ایسی گالی دی کہ وانگ لنگ کو کچھ پوچھنے کی جرات نہ ہوئی۔
تاہم اس گفتگو سے اسے فائدہ ہی ہوا۔ کیونکہ جب ریل گاڑی اپنے ٹھکانے پہنچ گئی تو وانگ لنگ اپنی اسکیم بنا چکا تھا۔ ایک مکان کے سائے میں سب کو بٹھا کر وہ ٹٹّے خریدنے نکلا اور بازار کا راستہ پوچھنے لگا۔ پہلے تو یہاں کی بولی اس کی سمجھ میں ہی نہ آئی۔ کیونکہ ان دکنیوں کا لہجہ بہت تیز اور درشت تھا۔ بار بار پوچھنے پر بھی جب وہ ان کا مطلب نہ سمجھا تو وہ سخت برہم ہوئے۔ چنانچہ، وہ صرف ایسے آدمیوں کو مخاطب کرتا جو چہرے سے مہربان معلوم ہوتے تھے کیونکہ یہ دکنی بڑے نازک مزاج تھے۔ اور بات بات پر جھٹ سے اُکھڑ جاتے تھے۔
شہر کے دوسرے سرے پر چٹائیوں کی دکان تھی۔ اس نے دام یوں گنے گویا ان معاملات کا واقف کار ہے اور ٹٹّے اٹھا کر چلتا بنا۔ جب وہ اس مقام پر پہنچا تو سب اس کا انتظار کر رہے تھے۔ لڑکے اسے دیکھتے ہی خوشی کے مارے چیخ اٹھے اور اسے محسوس ہوا کہ اس نرالی جگہ میں آکر ان کے اوسان ہوا ہو گئے ہیں۔ اکیلے بڑے میاں مسرّت اور حیرت سے ہر چیز کو ٹکر ٹکر دیکھ رہے تھے، اور انھوں نے وانگ لنگ سے کہا:
"دیکھتے ہو کہ یہ دکنی کیسے فربہ اندام ہیں۔ اور ان کی کھال کیسی چکنی اور پیلی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ روز سؤر کھاتے ہیں!"
کوئی راہ گیر آنکھ اٹھا کر بھی وانگ لنگ یا اس کے خاندان کو نہ دیکھتا تھا۔ پس پتھر سے پٹی ہوئی سڑک پر لوگ آ جا رہے تھے۔

اور وہ اتنے مصروف اور منہمک تھے کہ فقیروں کی طرف کوئی توجہ نہ کرتے تھے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد خچّروں کا کوئی کارواں کھٹ پٹ کرتا ہوا آنکلتا۔ اور خچّر بڑی صفائی سے پتھّروں پر کھُر جماتے چلتے تھے۔ ان کی پیٹھ پر عمارت سازی کے لیے اینٹوں کے چٹّے اور غلّے کے بورے لدے ہوئے تھے۔ ہر کارواں کے آخری خچّر پر سالار قافلہ ایک لمبا سا چابک لیے سوار ہوتا، اور وہ ہا ہُو کرتے ہوئے اس چابک کو بڑے زور سے شپشپاتا۔ وانگ لنگ کے پاس سے گزرتے ہوئے ہر ہانکنے والا اسے غرور اور نخوت سے دیکھتا۔ کسی شہزادے کی نگاہوں میں وہ حقارت نہ ہوگی جو ان خچّر بانوں کی نظروں سے عیاں تھی، جب وہ سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے حیرت زدہ لوگوں کے قریب سے گزرتے تھے۔ جب خچّر بانوں کو وانگ لنگ کے گھرانے کے بھولے پن کا اندازہ ہوا تو انھوں نے جان بوجھ کر ان کے سامنے چابک کو زور سے گھُمانا شروع کیا۔ اور جب اس کے کڑاکے سے یہ لوگ اچھل پڑتے تو خچّر بان کھل کھلا کر ہنس پڑتے۔ جب کئی مرتبہ یہی تماشا ہوا تو وانگ لنگ کو طیش آگیا اور وہ وہاں سے ہٹ کر جھوپڑے کے لیے جگہ تلاش کرنے لگا۔

اس دیوار کے سائے میں جھوپڑوں کی ایک قطار کھڑی ہوئی تھی۔ لیکن کوئی نہ جانتا تھا کہ دیوار کے اندر کیا ہے۔ اور نہ یہ جاننا ممکن تھا۔ یہ آسمان بوس دیوار طویل و دراز تھی، اور اس کی بنیاد کے پاس چٹائی کی جھوپڑیاں یوں پڑی ہوئی تھیں گویا کتّے کے

جسم پر مکھیاں ۔ دوسری جھوپڑیوں کی دیکھا دیکھی وانگ لنگ بھی اپنے ٹٹّوں کو موڑنے توڑنے لگا، لیکن وہ بانس کے بنے ہوئے تھے اور کچھ عجب لچلچے سے تھے ۔ وانگ لنگ ہراساں ہو رہا تھا کہ یک بیک اولان نے کہا:

یہ میں کردوں گی ۔ بچپن میں میں نے یہ کام سیکھا تھا۔"

بچّی کو زمین پر بٹھا کر اس نے ٹٹّوں کے بل نکالے ۔ پھر ایسی گول سی چھت کھڑی کی جو زمین تک پہنچی تھی اور جس میں بیٹھا تو مزے میں جا سکتا تھا مگر کھڑا ہونا ممکن نہ تھا ۔ ٹٹّے کے کنارے اینٹ سے دبا دیے گئے اور لڑکے اینٹوں کی تلاش میں نکل گئے ۔ جب یہ مرحلہ طے ہوا تو ایک بنی ہوئی چٹائی اندر بچھا دی گئی اور اس طرح سر چھپانے کی شکل نکل آئی ۔

یہاں بیٹھے بیٹھے انھیں یقین نہ آیا کہ پرسوں تک وہ اپنے گھر پر تھے اور اب وہاں سے سو میل دور ہیں ۔ یہ فاصلہ ہفتوں میں بھی طے نہ ہوتا اور اگر سب نہیں تو ان میں سے کچھ تو ضرور راستے ہی میں ڈھیر ہو جاتے ۔

اس زرخیز علاقے میں بھوکا تو کوئی نظر نہ آتا تھا اور یہاں کے ماحول میں ایسی خوشحالی بسی ہوئی تھی کہ وانگ لنگ کہہ اٹھا:

"اب ہمیں لنگر خانے کا پتہ چلانا چاہیے۔" وہ سب خوشی خوشی اٹھے اور دوبارہ باہر چلے ۔ اس مرتبہ لڑکے رکابیاں بجاتے جا رہے تھے کیونکہ انھیں کھانا ملنے کا یقین تھا ۔ انھیں جلد معلوم ہو گیا کہ دیوار کے سائے میں جھوپڑیوں کا ہجوم کیوں ہے ۔ اس کے

شمالی سرے سے ہوکر ایک سڑک جاتی تھی اور اس پر بہت سے
لوگ خالی تاملوٹ لیے لنگر خانے کی طرف جا رہے تھے جو یہاں سے
زیادہ دور نہ تھا۔ وانگ لنگ بھی اپنے کنبے کے ساتھ اس بھیڑ میں
شامل ہوگیا اور چلتے چلتے دو عظیم الشان پنڈالوں کے سامنے آیا
جن کے اندر سب لوگ داخل ہوگئے۔

ہر پنڈال کے عقب میں اتنے بڑے تندور بنے ہوئے تھے
کہ وانگ لنگ نے کبھی نہ دیکھے تھے اور ان پر دیگ کیا، اچھی
خاصی باؤلی رکھی ہوئی تھی۔ ڈھکن اٹھاتے ہی عمدہ چاول کے
اُبال کی سرسراہٹ سنائی دیتی، اور بھاپ کے ساتھ مہک
اڑتی تھی۔ ان لوگوں نے کبھی ایسی لطیف مہک نہ سونگھی ہوگی۔
اب وہ سب دھکم دھکا کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ ایک شور تھا
کہ اٹھا اور مائیں خوف و غُصّہ سے چیخ پڑیں کہ کہیں ان کے بچے
نہ کچل جائیں اور بچّے رونے لگے۔ دیگوں کے محافظ گرج پڑے:

"باری باری سے آؤ، سب کے کھانے کا انتظام ہے۔"

لیکن ان بھوکے انسانوں کی تنظیم ناممکن تھی اور جب تک ان کے
پیٹ کی آگ ٹھنڈی نہ پڑی وہ حیوانوں کی طرح لڑتے رہے۔
اس بھیڑ میں پھنسنے کے بعد وانگ لنگ صرف یہ کر سکا کہ اپنے باپ اور
بچّوں کا ہاتھ تھامے رہے۔ جب ایک یلغار کے ساتھ وہ بھی دیگ کے
آگے آگیا تو اس نے جھٹ کٹورے بڑھا کر چاول لیے اور پیسے دیے۔
وہ پاؤں جمائے وہیں کھڑا رہا کہ کہیں پھر یہ ریلا اُسے بہا نہ لے جائے۔
باہر آکر وہ چاول کھانے لگے۔ سیر ہونے کے بعد بھی ان کے

کٹورے میں چند لقمے بچ رہے اور اس نے کہا:

"یہ میں گھر لے جاؤں گا اور شام کو کھاؤں گا۔"

لیکن ایک شخص نے جو اپنی وردی سے وہاں کا دربان معلوم ہوتا تھا، تیکھے پن سے کہا:

"تم صرف وہی لے جا سکتے ہو جو تمھارے پیٹ میں ہو!"

وانگ لنگ ہکّا بکّا رہ گیا اور بولا:

"جب میں دام ادا کر چکا تو تمھیں اس سے کیا غرض کہ میں یہ چاول پیٹ میں رکھوں یا پیٹ کے باہر؟"

جواب ملا: "ہمیں یہ قانون بنانا ہی پڑا، کیونکہ بعض ایسے بھی شیطان ہیں جو اکنّی میں غریبوں کی یہ خوراک خریدتے ہیں — ایک آنے میں اتنا کھانا اور کہاں مل سکتا ہے — اور گھر لے جا کر اپنے سوروں کو کھلاتے ہیں کہ ان کی چربی بڑھے۔ یہ چاول انسانوں کے لیے ہیں، سوروں کے لیے نہیں۔"

یہ سن کر وانگ لنگ دنگ رہ گیا اور بولا:

"کیا انسان ایسا خبیث ہو سکتا ہے! — لیکن یہ تو کہو کہ غریبوں کے لیے یہ سب کون کرتا ہے؟"

دربان نے جواب دیا: "یہ شہر کے شرفا اور امرا کا کام ہے۔ کچھ تو عاقبت کے لیے کرتے ہیں کہ مرنے کے بعد اس کا اجر ملے۔ اور کچھ اس لیے کہ اسی دنیا میں ان کی واہ واہ ہو۔"

یہ سن کر وانگ لنگ نے کہا: "وجہ جو بھی ہو، یہ ان کی نیک دلی کا ثبوت ہے۔" جب دربان نے چونچ نہ کھولی تو اس نے اپنی

صفائی میں کہا: "ان میں سے کچھ تو یقیناً نیک دل ہوں گے؟"
مگر دربان اس مغز پچّی سے تھک گیا تھا اور وہ پیٹھ موڑ کر ایک بازاری گیت گنگنانے لگا۔ بچّے وانگ لنگ کو کھینچنے لگے اور وہ انھیں لے کر جھونپڑے میں چلا گیا جہاں سب گھوڑے بیچ کر صبح تک سوتے رہے کیونکہ مدتوں بعد انھیں پیٹ بھر کر کھانا ملا تھا۔ اس کی وجہ سے نیند بھی گہری آئی۔

صبح کے ناشتے کی نذر آخری اکنّی ہوئی، اور اب انھیں روٹیوں کا کوئی انتظام کرنا تھا۔ وانگ لنگ نے تردّد سے اولان کی طرف دیکھا، اس نگاہ میں وہ مایوسی نہ تھی جو اپنے بے آب اور خشک کھیتوں کو دیکھتے وقت ہوا کرتی تھی۔ یہاں سڑکوں پر کھانے پینے کی ریل پیل تھی، بازار میں ترکاری بھاجی کا انبار تھا، مچھلی بازار کے حوضوں میں زندہ مچھلیاں تیرا کرتی تھیں — ایسی جگہ کوئی بھوکوں کیسے مر سکتا ہے۔ یہ اس کا گاؤں تو تھا نہیں جہاں کھری چاندی دے کر بھی غذا حاصل کرنا دشوار تھا۔ مگر اولان نے ایسے اطمینان سے گویا وہ ہمیشہ اسی حال میں رہتی آئی ہے، کہا: "میں بچّوں اور بڑے میاں کو لے کر بھیک مانگنے نکل جاؤں گی۔ جو میری نہ سنیں گے وہ ان کے سفید بال دیکھ کر ضرور پسیج جائیں گے۔"

یہ کہہ کر اس نے دونوں لڑکوں کو آواز دی۔ آخر یہ بچّے ہی تھے۔ انھیں بس اتنا یاد تھا کہ عرصے بعد پیٹ بھر کر کھایا ہے اور یہ جگہ اجنبی ہے۔ اب وہ سڑک کا تماشا دیکھنے کھڑے تھے۔ اولان نے ان سے کہا:

"تم دونوں یہ کٹورے ہاتھ میں تھامو اور اس طرح آواز لگاؤ ــــ"
خالی کٹورا ہاتھ میں لے کر وہ درد ناک لہجے میں گڑگڑانے لگی :
"حضور کے دل سے سوال ہے! ۔ اگر آپ نیک دل ہیں ــــ تو ثواب کمایئے! ایک پیسہ یا ایک دھیلا بھوکے بچّے کا پیٹ بھر سکتا ہے! ــ"

وانگ لنگ اور اس کے بیٹے محو حیرت رہ گئے۔ اس نے یہ سوانگ کہاں سیکھا تھا؟ یہ عورت اب تک ان کے لیے ایک راز سربستہ کی طرح تھی۔ ان کے استعجاب کو دیکھ کر وہ بولی :
"بچپن میں اسی گریہ و زاری سے میرا پیٹ پلا تھا۔ ایسے ہی قحط کے زمانے میں میں بیچ دی گئی تھی ــ"

جب بڑے میاں کی نیند کھلی تو انھوں نے بھی کشکول لیا اور چاروں سڑک پر بھیک مانگنے نکل گئے۔ اولان راہ گیر کے آگے کٹورا پھیلا کر متواتر گڑگڑانے لگی۔ اس نے سوتی ہوئی بچّی کو اپنے سینے میں چمٹا لیا اور جب وہ اِدھر اُدھر بھاگتی تو بچّی کا سر خود بخود پھدکنے لگتا۔ اولان بچّی کی طرف اشارہ کر کے باآواز چلاتی:
"صاحب، آپ نے کچھ نہ دیا تو یہ بچّی مر جائے گی ــــ ہم پر فاقے گزرے ہیں ــ" اور در اصل یہ بچّی بے جان معلوم ہو رہی تھی کیونکہ اس کا سر ایک جگہ نہ ٹھہرتا تھا۔ چنانچہ کچھ راہ چلتوں نے طوعاً و کرہاً اس کی جھولی میں چند پیسے ڈال دیے۔

لیکن بچّوں کے لیے تو یہ اچھا خاصا تماشا بن گیا اور بڑا لڑکا شرما کر بہت کنیاتے ہوئے کسی کے آگے ہاتھ پھیلاتا تھا۔ جب

ماں کی توجہ ان پر گئی تو اس نے جھونپڑی میں لے جاکر ان کی خوب کندی کی اور ڈانٹ بتلائی۔

"کوئی یوں ہنستے کھیلتے بھیک مانگتا ہے! - اُلو کے پٹھو، تمھیں بھوکا لٹکانا چاہیے!" اور اس نے انھیں اتنا پیٹا کہ اس کے اپنے بازو شل ہوگئے اور روتے روتے لڑکوں کی ہچکی بندھ گئی۔ پھر اس نے یہ کہہ کر انھیں باہر کھدیڑ دیا:

"اب ٹھیک سے بھیک مانگی جائے گی! پھر ہنس کر دیکھنا! ہڈی پسلی برابر کردوں گی۔"

ان سب کو وہاں چھوڑ کر وانگ لنگ پوچھتے پوچھتے رکشا کے اڈّے پر پہنچا اور ہر رات ایک روپیہ دینے کی شرط پر ایک گاڑی کرائے سے لی، اور اسے لیے ہوئے سڑک پر نکل آیا۔

اس لوٹے پھوٹے پہیے دار کباڑ کو کھینچتے ہوئے اسے محسوس ہوا کہ ساری دنیا اس کا مذاق اڑا رہی ہے۔ اس کے بموں کے درمیان اس کی وہی حالت تھی جو پہلی مرتبہ ہل میں جتے ہوئے بیل کی۔ اس کے لیے چلنا بھی دوبھر تھا۔ لیکن روزی کمانے کے لیے رکشا کو دوڑانا ضروری تھا۔ جیسا کہ شہر بھر میں ہوتا تھا وہ ایک تنگ سی گلی میں گیا جہاں دکانیں نہ تھیں جو مکان تھے وہ بھی اندر سے بند۔ ان کی سیڑھیوں پر وہ چڑھنے اترنے کی مشق کرنے لگا۔

ابھی وہ مایوس ہوکر دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ گداگری کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ ایک دروازہ کھلا اور ایک عینک لگائے بوڑھے نے جس کا لباس مدرسوں کا سا تھا، اُسے آواز دی

وانگ لنگ معذرت کرنے لگا کہ مجھے دوڑنے کی عادت نہیں۔ مگر بڈّھا بہرا تھا اور اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ بس نیچے کرنے کا اشارہ کرکے وہ رکشا پر سوار ہوگیا اور وانگ لنگ پر اس کے بہرے پن اور عالمانہ شان ولباس نے ایسا رعب ڈالا کہ وہ چوں بھی نہ کر سکا۔ اب بڈّھا تن کر بیٹھ گیا اور بولا:

"مجھے 'کنفیوشئیس' کے مندر جانا ہے۔"

وہ اس اطمینان اور سکون سے بیٹھا تھا کہ مزید سوال کی ہمّت محال تھی۔ اور وانگ لنگ کو قدم بڑھاتے ہی بنی گو اسے مطلق علم نہ تھا کہ یہ مندر کہاں ہے۔

وہ راہ پوچھتے چلتا گیا۔ راستے میں بڑی بھیڑ بھاڑ تھی۔ پھیری والوں کے خوانچے، سودا خریدنے والی عورتوں کی ٹوکریاں، گھوڑا گاڑی، رکشا ——— غرض کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا اور دوڑ بھاگ ناممکن تھی۔ اس لیے وہ تیز تیز چلتا گیا اور برابر اپنی سواری کے ہچکولوں کو محسوس کرتا رہا۔ وہ پیٹھ پر بوجھ لادنے کا عادی تو تھا مگر بوجھ کھینچنے کا عادی نہ تھا۔ مندر پہنچتے پہنچتے اس کے بازو تھک گئے اور ہاتھ چھل گئے کیونکہ ہم وہاں آکر لگتا تھا جہاں ہل چھوتا بھی نہ تھا۔

مندر کے پھاٹک کے آگے مدرّس رکشا سے نیچے اترا اور شلوکے میں ہاتھ ڈال کر ایک چاندی کا سکّہ نکالا:

"میں اس سے زیادہ نہ دوں گا، اس لیے بیکار کی بکواس سے کوئی فائدہ نہیں!" یہ کہہ کر وہ مندر کے اندر داخل ہوگیا۔

وانگ لنگ کو تکرار کا خیال بھی نہ تھا کیونکہ وہ اس سکّے کی

قیمت نہ جانتا تھا۔ چاول کے ایک آڑھتیے نے اس کے بدلے چھبیس پیسے دیے۔ وانگ لنگ تو حیران رہ گیا کہ دکن میں اتنی آسانی سے پیسے بنتے ہیں۔ مگر وہیں ایک دوسرا رکشا بان کھڑا تھا جس نے وانگ لنگ کی کمائی کا تخمینہ لگا کر کہا:

"صرف ساڑھے چھ آنے؟ تم اس بڈھے کو کہاں سے کھینچے لا رہے ہو؟" اور جب وانگ لنگ نے بیان کیا تو وہ چلا اٹھا:

"اس پرانی کینچلی کا مکر تو دیکھو! صرف آدھا کرایہ دے کر چلتا بنا۔ تم نے مول بھاؤ ٹھہرایا تھا یا نہیں؟"

وانگ لنگ نے کہا: "میں نے کچھ طے نہیں کیا تھا۔ اس نے حکم دیا اور میں چلا آیا۔"

دوسرے رکشا بان نے ترس کھا کر اس کی طرف دیکھا اور تماشائیوں کو مخاطب کر کے بولا: "اس چوٹی والے گنوار کو اچھی طرح دیکھ لو! کسی نے کہا کہ آ اور یہ ٹھگے کی طرح بے پوچھے سنے اتر آیا۔ کوئی ایسا احمق بھی ہوگا؟ سن بے گنوار، سب سے پہلے کرایہ ٹھہرانا چاہیے۔ ہاں گوروں کی بات ہی اور ہے، ان سے کچھ پوچھنا مناسب نہیں۔ یہ ہوتے تو ہیں بڑے تیس مار خاں، لیکن جب رکشا لیں تو ان پر یقین کرنا، کیونکہ ان کے نزدیک روپیہ اور پیسہ میں کوئی فرق نہیں۔ یہ پانی کی طرح چاندی بہایا کرتے ہیں۔" وہ اس مزے میں باتیں کر رہا تھا کہ سب لوگ ہنس پڑے۔

وانگ لنگ بے چارہ ششدر رہ گیا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ شہریوں کے

مجمع میں وہ اپنے آپ کو بہت ادنیٰ اور دہقانی پاتا تھا۔ اس نے زبان بھی نہ کھولی اور رکشا اٹھا کر چلتا بنا۔

"بہر حال، کل کی روٹیوں کا ساماں تو ہو گیا" اس نے استقلال سے کہا۔ مگر اُسی وقت یاد آیا کہ رات کو رکشا کا کرایہ دینا ہے اور یہ تو اس کا آدھا بھی نہیں ہے۔

صبح پھر ایک سواری ملی اور اس مرتبہ وہ کرایہ ٹھہرانا نہ بھولا۔ شام کو اور بھی دو گاہک مل گئے۔ لیکن رات کو یہ سارے پیسے گننے پر پتا چلا کہ کرایہ دے کر صرف ایک اکنّی بچ رہے گی۔ وہ سخت پیچ و تاب کھاتا ہوا جھوپڑی کو لوٹا اور سوچتا رہا کہ جتنی محنت دن بھر کھیت میں کرتا تھا، اس سے کم نہیں کی پھر بھی صرف چار پیسے ملے۔ اپنی زمین کی یاد کر کے اس کا دل بھر آیا۔ آج کا دن ایسا عجیب و غریب تھا کہ اسے اپنے کھیتوں تک کی سُدھ نہ رہی تھی۔ لیکن اب اس نے سوچا کہ میں اپنی زمین سے دور ہی سہی، تاہم وہ میری ہی ملکیت تو ہیں۔ اس خیال سے اسے تسکین ہوئی اور وہ گھر لوٹ آیا۔

وہ دن بھر میں او لان کو بھیک سے پانچ آنے ملے تھے۔ بڑے بیٹے نے پانچ پیسوں کی کمائی کی تھی اور چھوٹے نے دو آنہ کی۔ یعنی سب ملا کر کل کے کھانے کے لیے یہ کافی تھا۔ لیکن جب انھوں نے چھوٹے لڑکے کی کمائی بھی بیت المال میں شامل کی تو وہ رونے لگا وہ اسے اپنے سے الگ نہ کرنا چاہتا تھا۔ رات کو بھی پیسے مٹھی میں بند کیے سوتا رہا، اور وہ کسی طرح اس سے یہ رقم نہ لے سکے جب تک کہ اس نے خود اپنی خوراکی کے لیئے نہ دے دی۔

لیکن بڑے میاں کے پلّے کچھ بھی نہ پڑا۔ دن بھر وہ ایک اصول کی پابندی کے لیے سڑک کے کنارے بیٹھا رہا لیکن کسی سے سوال نہ کیا۔ وہ کبھی اونگھتا اور پھر تماشا دیکھنے لگتا اور جب تھک جاتا تو کھٹ سے سو جاتا۔ اور چونکہ وہ گھر میں سب سے بوڑھا تھا کسی کو نکتہ چینی کی مجال نہ تھی۔ اپنے کشکول کو خالی دیکھ کر وہ یوں باتیں بنانے لگا:

"میں نے فصل بو کر اور کاٹ کر اپنا پیٹ پالا ہے۔ اب تو اللہ رکھے میرا بیٹا بھی ہے اور پوتے بھی ہیں!"

وہ اسی دھن میں مگن رہتا کہ گھر والے اسے بٹھا کر کھلاتے رہیں گے۔



باب ۱۲

جب مصیبت کے یہ ابتدائی دن کٹ گئے اور کھانے کے لیے ہر روز کچھ نہ کچھ روکھا سوکھا ملنے لگا، اور جب اس کو یقین ہوگیا کہ اپنی مشقت اور اولان کی بھیک سے جوں توں کرکے کام چل ہی رہا ہے، تو وانگ لنگ کی وحشت کچھ کم ہوئی اور وہ اس شہر کی اصلیت سے واقف ہونے لگا۔ دن بھر شہر کا چکر لگاتے لگاتے وہ اس کے ہر گلی کوچے کو جان پہچان گیا۔ وہ یہ سمجھ گیا کہ صبح اس کے رکشا میں اگر عورتیں سوار ہوئیں تو وہ بازار جاتی ہیں، اور اگر مرد ہوئے تو وہ دکان یا اسکول جاتے ہیں۔ اسے کچھ خبر نہ تھی کہ یہ کس قسم کے اسکول ہیں۔ صرف اتنا معلوم تھا کہ ان کا نام "مغربی تعلیم گاہ" یا "چینی کالج" وغیرہ ہے۔ کیونکہ وہ کبھی ان کے دروازے کے اندر داخل نہ ہوا تھا۔ اور اگر بھولے سے چلا بھی جاتا تو ضرور کوئی ٹوک بیٹھتا کہ تم یہاں کیا کرنے آئے ہو۔ نہ اس نے دکانوں کا حال معلوم کرنے کی کوشش کی۔ اسے تو بس اپنی اجرت سے کام تھا۔

رات کو وہ لوگوں کو چائے خانوں اور عشرت گاہوں میں لے جاتا تھا —— ایک تو وہ علانیہ عشرت جو موسیقی اور قمار کی شکل میں سامنے آتی ہے، اور پھر وہ عشرت جو دیواروں کے پیچھے خاموش اور پوشیدہ ہوتی ہے۔ لیکن وانگ لنگ ان تمام

عیاشیوں سے بیگانہ تھا کیونکہ آج تک اس نے اپنی جھونپڑی کے علاوہ کسی دوسری ڈیوڑھی کے اندر قدم نہ رکھے تھے۔ اس کی منزل ہمیشہ کسی نہ کسی دروازے کے سامنے ختم ہوجاتی تھی اس خوشحال شہر میں اس کی حالت کسی امیر گھر کے چوہے کی سی تھی، جو جھوٹا سوٹا کھاکر کہیں دبک رہتا ہے اور مکان کی زندگی میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

واقعہ یہی تھا۔ گو سو میل کی دوری ہی کیا اور پھر یہ بھی پانی نہیں بلکہ خشکی کا فاصلہ تھا، تاہم اس دکنی شہر میں وانگ لنگ کا گھرانا پردیسی سمجھا جاتا تھا۔ اس کے باوجود وہاں کے باشندوں کی آنکھیں اور بال انھیں کی طرح کالے تھے، ان کی رسمیں بھی وہی تھیں اور ان کی بولی میں بھی کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔

آخر صوبۂ "کیانگسو" اور علاقۂ "انوئی" میں کچھ فرق تو ہونا چاہیے۔ "انوئی" میں جہاں وانگ لنگ کا مسکن تھا، چبا چبا کر بولتے ہیں اور الفاظ گلے کے اندر سے نکلتے ہیں۔ لیکن اس کیانگسو شہر کے باشندے یوں بولتے ہیں کہ الفاظ گولیوں کی طرح ان کے منہ میں سے اڑتے ہیں اور ہمیشہ نوک زبان پر دھرے ہوتے ہر ایک تھے وانگ لنگ کے کھیت جہاں سال میں دومرتبہ گیہوں چاول ہی نہیں پیاز لہسن تک اُگا لو۔ لیکن یہاں کے شہری اراضی کو لید سے پاٹ کر ماہ بہ ماہ ترکاریاں اور دھان پیدا کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔

وانگ لنگ کے دیس میں کسی کو تازی روٹی لہسن کی چٹنی کے ساتھ مل گئی، تو وہ شکرانہ ادا کرتا تھا۔ لیکن یہاں والے

سؤر کے کوفتے ، بانس کے کلّے ، مرغ کے کباب ، غرض انواع و اقسام کے مال اڑاتے ۔ اور اگر کوئی خدا کا بندہ لہسن کھاکر آجاتا تو وہ ناک بھوں چڑھاکر کہتے : "یہ چوٹی والا گندگی کا اوتار ضرور شمال سے آیا ہی!" لہسن کی بو سونگھتے ہی دکاندار کپڑوں کے دام یوں بڑھا دیتے تھے گویا گاہک کوئی غیر ملکی ہی۔

دیوار کے دامن میں بسی ہوئی جھونپڑیوں کی اس بستی کا شمار نہ تو شہر میں تھا اور نہ گرد و نواح کے دیہاتوں میں۔ "کنفیوشیس" کے مندر کے کونے میں ایک چبوترا تھا جہاں ہر منچلا تقریر کر سکتا تھا۔ ایک مرتبہ وہاں ایک نوجوان للکار رہا تھا کہ چین میں انقلاب ہونا چاہیے اور غیر ملکیوں کو مار بھگانا چاہیے۔ یہ سن کر بے چارہ وانگ لنگ چپ چاپ ایسا بھاگا گویا وہی وہ مردود غیر ملکی ہی جس کے خلاف نوجوان یوں گرج رہا تھا۔ دوسری مرتبہ اس نے ایک دوسرے نوجوان کی تقریر سنی — اس شہر میں آتش زبان نوجوانوں کی بھرمار تھی — وہ کہہ رہا تھا کہ چینیوں میں اتحاد اور تعلیم کی سخت ضرورت ہی۔ مگر وانگ لنگ کو مطلق احساس نہ ہوا کہ یہ باتیں اس کے لیے بھی کہی گئی ہیں۔

ایک روز وہ ریشم بازار میں گاہکوں کا انتظار کرنے کھڑا تھا کہ ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے اس پر ثابت کر دیا کہ شہر میں اُس سے بھی زیادہ ناواقف لوگ رہتے ہیں۔ وہ ایک ایسی دکان کے آگے سے گزرا جس میں سے ریشم خرید کر بیگمات نکلا کرتی تھیں اور اگر ان میں سے کسی کی سواری مل گئی تو چاندی تھی۔ حسن اتفاق سے

آج بھی اسے ایک سواری ملی لیکن ایسی عجیب الخلقت کہ وہ چکرا گیا۔ وہ سمجھ ہی نہ سکا کہ یہ مرد ہے یا عورت۔ یہ جانور دراز قد تھا اور موٹے کپڑے کا سیاہ لبادہ اس کے زیب تن تھا، گردن میں مُردہ حیوان کی کھال لپٹی ہوئی تھی۔ رکشا دیکھتے ہی اس نے تحکمانہ انداز میں اسے یہ جھکانے کو کہا۔ حکم کی تعمیل کے بعد جب وانگ لنگ ابھی اس دھیان میں حیران ہی تھا کہ یہ کیسی مصیبت آئی کہ اس شخص نے ٹوٹی پھوٹی زبان میں "پل والی سڑک" چلنے کی ہدایت کی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے اور وہ تیز تیز بھاگنے لگا۔ راستے میں ایک جان پہچان کے رکشا بان سے اس نے پوچھا:

"بتلاؤ تو سہی — یہ کس قسم کی سواری ہے۔"

اس نے چلّا کر جواب دیا:

"یہ امریکن میم ہے — بس تمھارے پو بارے ہیں۔"

لیکن وانگ لنگ اس میم کے ڈر سے بگٹٹ بھاگتا گیا اور جب وہ 'پل والی سڑک پر' پہنچا تو تھک کر پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ میم نے نیچے اُتر کر اسی بے جوڑ لہجے میں کہا: "تمھیں اس بُری طرح بھاگنے کے لیے کس نے کہا تھا۔" یہ کہہ کر اسے دو رُپے پکڑا دیئے جو معمول سے دوگنا تھا۔

اب وانگ لنگ کی سمجھ میں آیا کہ اصل پردیسی یہ ہے۔ بہر حال کالی آنکھوں اور کالے بالوں والے ایک قوم کے ہیں اور بھوری آنکھوں اور بھورے بالوں والے دوسری قوم کے۔

اس کے بعد اس نے شہر میں کبھی اپنے کو غیر ملکی محسوس نہیں کیا۔

جب رات کو وہ یہ رُپے لیے ہوئے گھر گیا اور اولان کو یہ ماجرا سنایا تو اس نے بتلایا: "میں نے بھی انھیں دیکھا ہے۔ میں ہمیشہ ان سے بھیک مانگتی ہوں کیونکہ وہ تانبے کی بجائے چاندی دیتے ہیں۔"

لیکن ان دونوں نے یہ نہ سوچا کہ یہ پردیسی نرم دلی کی وجہ سے نہیں بلکہ جہالت کی وجہ سے ایسی فیّاضی دکھاتے ہیں، کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ کنگالوں کو چاندی نہیں بلکہ تانبا دینا چاہیے۔

اس تجربے نے وانگ لنگ وہ راز سکھایا کہ جوان نوجوانوں نے نہیں سنایا تھا۔ یعنی وہ بھی اپنی قوم کا ایک فرد ہے کیونکہ اس کی آنکھیں اور بال بھی کالے ہیں۔

ایسے لمبے چوڑے اور کھاتے پیتے شہر کے خاکدان ہی میں کیوں نہ رہو، تو بھی بھوک نہیں ستاتی۔ اس کے برعکس وانگ لنگ ایسے علاقے سے آیا تھا جہاں فاقہ اس وقت ہوتا ہے جب قحط پڑتا ہے، کیونکہ بے درد قدرت زمین کو پانی نہیں دیتی۔ چاندی لیے پھرو، پھر بھی کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔

لیکن شہر میں تو ہر طرف غذا کی بہتات تھی۔ مچھلی بازار کی سڑکوں کے آس پاس بڑی بڑی مچھلیوں کے ڈھیر لگے تھے، جو رات کو ندّی میں پکڑی گئی تھیں۔ کہیں ان چھوٹی مچھلیوں سے حوض بھرے ہوئے تھے جو جال لگا کر تالاب سے نکالی گئی تھیں۔ کہیں زرد زرد کچھوؤں کے انبار تھے جو تعجّب سے جھنجھلا کر ہاتھ

پانوں مارنے لگتے تھے ۔ چنڈوروں کے جشن کے لیے بام مچھلی بھی موجود تھی ۔ منڈی میں اناج کے اتنے بڑے بڑے بورے رکھے تھے کہ ان کے اندر آدمی چھپ جائے تو پتا نہ چلے ۔ باریک اور موٹے چاول، سفید اور لال گیہوں، سرخ و سبز سیم، مکئی اور باجرا ـــــ غرض سب کچھ تھا۔ مذبح میں سموچے سؤر گردن سے لٹکے ہوئے تھے اور ان کے تن آور جسم کٹے ہوئے تھے کہ تازہ گوشت اور عمدہ چربی کی بہار دکھائی پڑے، ان کی کھال کیسی نرم و سفید تھی۔ بطخ فروشوں کے ہاں در و دیوار سے قطار در قطار بھنی ہوئی بطخیں لٹکی ہوئی تھیں، جنھیں کوئلوں کی ہلکی ہلکی آنچ دکھائی گئی تھی۔ یہی حال اُن دکانوں کا تھا جہاں تیتر، بٹیر وغیرہ بکا کرتے تھے ۔

اور ترکاریوں کی نہ پوچھو، کیونکہ انسان زمین سے جو کچھ اُگا سکتا ہے وہ سب یہاں موجود تھا ـــــ سفید و سرخ مولی، کنول کی جڑ، سیم کی بیل، جوز اور مہک دار کاہو کی گانٹھیں ۔ غرض، اس شہر کے بازاروں میں وہ سب کچھ میسر ہو سکتا تھا جس کی طلب انسان کا پیٹ کر سکے ۔ پھلوں اور مٹھائیوں کی پھیری والے، میٹھے تیلوں میں تلا ہوا آلو کا گرما گرم حلوا، سؤر کے مزیدار چٹپٹے کباب اور میٹھے چاول کے لڈّو بیچتے پھر رہے تھے ۔ بچّوں کی بھیڑ پیسے کھنکاتی ان خوانچے والوں کے پیچھے جمع تھی۔ اور بچّے اس بُری طرح یہ پکوان کھا رہے تھے کہ ان کے جسم گھی اور شکر سے سن گئے ۔

یہ سب دیکھ کر یہ خیال ہونا لازمی تھا کہ ایسے شہر میں کون بھوکا رہ سکتا ہے ۔

نور کے تڑکے وانگ لنگ گھر والوں کے ساتھ کٹورے لیے نکلتا، اور انھیں کی طرح ہر جھونپڑی سے لوگ برآمد ہوتے۔ جاڑے کے مارے وہ کانپتے ہوتے کیونکہ ان کے پاس کافی کپڑے نہ تھے۔ یوں تھرتھراتے ہوئے وہ لنگر خانوں میں جاتے جہاں اِکنّی میں کٹورا بھر چاول مِل جاتے۔ وانگ لنگ اپنی رِکشا کو خواہ کتنا ہی دوڑائے اور اولان بھیک کے لیے کتنا ہی گڑگڑائے تاہم اتنے پیسے نہ ملتے تھے کہ گھر میں چولھا جل سکے۔ لنگر خانے کا بل ادا کرنے کے بعد اگر گرہ میں دام بچ رہے تو وہ زرا سے سالن کے کام آتے۔ لیکن سالن بنانا گویا پہاڑ توڑنا تھا۔ دونوں لڑکے ایندھن کی تلاش میں جاتے اور ایندھن دو اینٹوں کے بیچ میں جلایا جاتا جن سے اولان چولھے کا کام لیتی تھی۔ ایندھن بچّے کسانوں کے گٹھر سے چراتے تھے جو وہ شہر بیچنے کے لیے لاتے تھے کبھی وہ گرفتار ہو جاتے اور خوب پٹتے۔ بڑا لڑکا جو دبّو بھی تھا اور شرمیلا بھی، ایک رات کسی کسان کے ہاتھ یوں ٹھک کر آیا کہ اس کی ایک آنکھ کھلتی ہی نہ تھی۔ لیکن چھوٹے نے خوب بال و پر نکالے، اور رفتہ رفتہ اسے بھیک سے زیادہ چوری کی مشق ہو گئی۔

اولان کو اس کی پروا نہ تھی۔ اگر لڑکے بے ہنسے کھیلے بھیک نہ مانگ سکتے تھے تو بلا سے وہ چوری ہی کریں۔ کسی طرح اپنا دوزخ تو بھریں۔ وانگ لنگ اپنی بیوی کو کچھ نہ کہہ سکتا تھا، لیکن بیٹوں کی اس حرکت پر اس کا خون جوش میں آجاتا اور بڑا بیٹا اگر اس فن میں کچّا تھا تو اسے خوشی ہی ہوتی تھی۔ وانگ لنگ کو

یہ زندگی سخت ناپسند تھی۔ اُسے اس زمین کا خیال تھا جو اس کا انتظار کر رہی تھی۔

ایک مرتبہ وہ رات کو دیر سے لوٹا تو کیا دیکھتا ہے کہ گوبھی کے سالن میں سؤر کے گوشت کی بوٹیاں بھی ہیں۔ اس بیل کے بعد آج پہلا دن تھا کہ گوشت کے درشن ہوئے۔ لہذا وانگ لنگ کو کچھ اچنبھا ہوُا۔

"یہ کس پردیسی کی دین ہے؟" اس نے اولان سے پوچھا۔ مگر اس نے حسب معمول کوئی جواب نہ دیا۔ مگر چھوٹے لڑکے نے ـــــ جو کم عمری کی وجہ سے ناسمجھ تھا ـــــ اپنی چالاکی کا اعلان کر دیا:

"یہ گوشت میں لایا ہوں ـــــ میں! قصاب اندر گیا تو میں گوشت کا بڑا سا ٹکڑا لے کر بھاگا اور ایک گلی کی موری میں جا چھپا، پھر بھیّا بھی آ گئے۔"

وانگ لنگ نے بگڑ کر کہا: "یہ گوشت میرے لیے حرام ہے! میں کمائی یا بھیک سے خریدا ہوُا گوشت تو کھا لوں گا۔ لیکن چوری کا مال نہیں چھونے کا۔" یہ کہہ کر اس نے ہانڈی سے گوشت کے قتلے نکالے اور لونڈے کی چیخ پکار اَن سنی کر کے انھیں زمین پر پھینک دیئے۔

اب اولان آہستہ سے اٹھی اور انھیں چن کر پانی سے دھویا اور یہ کہتے ہوئے ہانڈی میں ڈال دیا:

"گوشت کہیں سے آئے رہے گا گوشت ہی۔"

وانگ لنگ کی زبان نہ کھلی لیکن دل ہی دل میں وہ مغموم تھا کہ شہر میں آ کر اس کے بیٹے چور بن رہے ہیں۔ اولان نے

نرم نرم بوٹیاں بناکر اس کی آنکھوں کے آگے بڑے میاں اور بچوں کو دیں اور خود بھی کھاتی رہی ، لیکن وانگ لنگ نے گوشت کی طرف آنکھ اٹھاکر بھی نہ دیکھا ، صرف اپنے پیسوں سے خریدی ہوئی گوبھی چکھی ۔ مگر کھانے کے بعد وہ چھوٹے صاحب زادے کو ماں کی آنکھوں سے دور سڑک پر لے گیا ۔ ایک مکان کے پیچھے اس نے لونڈے کا سر اپنی بغل میں دباکر اسے خوب ہی پیٹا اور اس کے بلبلانے کی مطلق پروا نہ کی ۔

وہ برابر چلاّتا رہا : "یہ لے ، یہ لے ! دیکھا چوری کا مزا ۔"
جب سسکیاں بھرتے ہوئے وہ گھر چلا گیا تو وانگ لنگ نے دل ہی دل میں کہا :

"ہمیں فوراً دیہات کی راہ لینی چاہیے ۔"



باب ۱۳

اس شہر کی دولت مندی کی بنیاد غربت پر رکھی گئی تھی اور وانگ لنگ کی زندگی اسی میں گزرتی رہی ۔ بازاروں میں کھاجوں کے بھنڈار لگے ہوئے تھے ، دُکانوں کے آگے رنگا رنگ ریشمی پھریرے ان کی اجناس کا اشتہار دے رہے تھے ، نازک اندام امیرزادے مخمل اور ساٹن ڈٹائے ٹہلتے پھر رہے تھے اور ان کے ہاتھ پھولوں سے نرم تھے اور بے کاری کا حسن ان سے عیاں تھا۔ ایک طرف تو شہر کی یہ شاہانہ شان تھی —— دوسری طرف مفلسوں کی وہ بستی جہاں وانگ لنگ رہتا تھا۔ جہاں نہ پیٹ بھرنے کو روٹی میسر تھی نہ تن ڈھکنے کو کپڑا۔

امیروں کی ضیافت کے لیے مزدور دن بھر پکوان پکایا کرتے اور بچے صبح سے نیم شب تک کام کرتے اور تھک کر سخت فرش پر بے نہائے دھوئے سو رہتے ۔ جاگ کر پھر وہ تنور کی آنچ بنتے۔ اور اس مشقت کے باوجود انھیں اتنی اُجرت نہ ملتی کہ اس کیک کا ایک ٹکڑا خرید سکیں جو وہ دوسروں کے لیے تیار کرتے تھے ۔ زن و مرد موسم سرما کے لیے سمور کی تراش و آرائش میں مصروف رہتے اور بہار کے لیے ہلکی پوستین اور زرق برق ریشم کے لباس تیار کرتے —— ان لوگوں کے لیے جو بازار کے بازار صفاچٹ کر جاتے تھے ۔ لیکن یہ مزدور موٹی جھوٹی نیلی کھادی کے

پیوندوں سے اپنی عریانی چھپایا کرتے۔

وانگ لنگ انھیں لوگوں میں رہتا تھا جو دوسروں کے عیش وآرام کے لیے اپنی جان کھپاتے تھے، اور ان کی زبانی عجیب باتیں سنا کرتا تھا۔ معمّر زن ومرد تو کسی سے کچھ نہ کہتے تھے۔ بڈھوں کا بس یہ کام تھا کہ رکشا کھینچیں اور کوئلے یا لکڑی کے گٹھے نانبائی کی دُکان یا محلوں میں پہنچائیں۔ بس پتھّر کی سڑکوں پر بوجھ ڈھوتے اور گاڑی کھینچتے ہوئے ان کی پیٹھ کمان بن جاتی اور رگیں اُبھر آتی تھیں۔ سوکھی روٹیوں کے چند لقمے کھا کر وہ چپ چاپ پڑ جاتے تھے۔ اولان کے چہرے کی طرح ان کے چہرے بھی بےحس تھے۔ یہ معلوم کرنا محال تھا کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں۔ پیسوں اور روٹیوں کے علاوہ وہ کسی چیز کا ذکر نہ کرتے تھے۔ شاید ہی کبھی ان کی زبان پر چاندی کا نام آیا ہو کیونکہ چاندی ان کے نصیب میں لکھی ہی نہ تھی۔

جب وہ خواب میں ہوتے تو ان کے چہرے یوں مسخ ہو جاتے گویا غصّے میں ہیں، حالانکہ یہ غصّہ نہ تھا۔ عمر بھر کمر توڑ بوجھ اٹھاتے اٹھاتے ان کے اوپری ہونٹ یوں اینٹھ گئے تھے کہ دانت غرّاہٹ کا منظر پیش کرنے لگے تھے۔ اور مشقّت نے آنکھوں اور باچھوں کے نیچے جھرّیوں کا جال بچھا دیا تھا۔ وہ خود بھی نہ جانتے تھے کہ وہ کس قسم کے انسان ہیں۔ کسی آئینے میں آپ اپنی صورت دیکھ کر ان میں سے بےساختہ کہہ اٹھا: "کیسا ڈراونا چہرا!" یہ سُن کر جب اس کے ساتھی ہنس پڑے تو اس کے ہونٹوں پر غمناک تبسم آگیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیوں ہنس رہے ہیں اور وہ دائیں

بائیں دیکھنے لگا کہ اس نے کسی اور پر تو یہ جملہ نہیں کس دیا۔

جھونپڑوں میں ان کی عورتیں ہمیشہ اُن بچّوں کے لیے چیتھڑوں کی گدڑی سیا کرتیں، جو آئے دن پیدا ہوتے رہتے تھے۔ کھیتوں سے ایک آدھ گوبھی اور گنج سے مُٹھی بھر اناج چراتے اور سال بھر پہاڑیوں میں گھاس پھوس چنتے اُن کے دن بیتتے تھے۔ فصل کی کٹائی کے زمانے میں وہ مرغیوں کی طرح کسانوں کے پیچھے لگ جاتیں اور اپنی پینی آنکھوں سے بکھرے ہوئے دانوں کو چنا کرتیں۔ یہیں بچے بھی رہتے تھے۔ بچّے اتنی بڑی تعداد میں پیدا ہوتے اور مرتے رہتے تھے کہ ان کے والدین کو ان کے جینے مرنے کی خبر نہ ہوتی اور نہ وہ صحیح طور پر یہ بتلا سکتے تھے کہ ان میں سے کتنے زندہ ہیں۔ انھیں تو صرف یہ یاد تھا کہ اتنے پیٹوں میں رزق پہنچانا ہے۔

یہ مرد، عورت اور بچّے بازاروں اور کپڑے کی دُکانوں کے آس پاس منڈلایا کرتے اور شہر کے نواحی دیہاتوں کے چکّر کاٹا کرتے۔ مرد چند درہموں کے لیے حمّالی کرتے، ان کے بال بچّے بھیک اور چوری میں وقت کاٹتے۔ اسی گروہ میں وانگ لنگ اور اس کے بال بچّوں کا بھی شمار تھا۔

بوڑھے تو اس زندگی پر قناعت کر چکے تھے۔ لیکن جب ان کے بیٹے جوان ہوئے تو ان میں بے اطمینانی پیدا ہونے لگی۔ ان نوجوانوں میں جوش و خروش پھیلنے لگا۔ پھر شادی کر کے جب انھوں نے بھوکے بچوں کا منہ دیکھا تو جوانی کا وہ مبہم غصّہ ایسی غضبناک مایوسی

اور جذبۂ بغاوت میں تبدیل ہونے لگا جو خالی خولی لنترانی میں
نہ سما سکتا تھا۔ زندگی بھر وہ بھاڑے کے ٹٹو کی طرح محنت کرتے
رہتے تھے اور اس کے عوض انھیں پیٹ بھر روٹی بھی نہ ملتی تھی۔
اسی قسم کی گفتگو کے دوران میں ایک روز وانگ لنگ کو معلوم
ہوا کہ اُس سدِ سکندری کی دوسری طرف کیا ہے جس کے سایہ میں
اس کی جھونپڑی تھی۔

یہ ختمِ سرما کی ایک ایسی شام کا واقعہ ہے جب پہلے پہل
آمدِ بہار کی نوید ملنے لگتی ہے۔ جھونپڑیوں کے اردگرد کی زمین
پگھلی ہوئی برف سے کیچ کیچ ہو رہی تھی اور پانی جھونپڑیوں میں
سرایت کر گیا تھا جس کی وجہ سے ہر کنبہ اینٹیں ڈھونڈتا پھرتا تھا کہ
سونے کی جگہ نکل آئے۔ لیکن زمین کی سیلن کے دکھ کے علاوہ
ہوا میں ایک خاص قسم کی رطوبت تھی جو وانگ لنگ کو بےچین
کر رہی تھی۔ اس لیے وہ کھاتے ہی سو نہ سکا۔ بلکہ سڑک کے
کونے میں چہل قدمی کرنے نکل آیا۔

یہ مقام اس کے بوڑھے باپ کا تکیہ تھا۔ دیوار کا ٹیکا لگائے
وہ یہیں پالتی مار کر آ بیٹھتا تھا۔ اب بھی وہ اپنی رکابی لیے یہیں
بیٹھا تھا کیونکہ جھونپڑی میں بچوں نے کہرام مچا رکھا تھا۔ بڈھے کے
ایک ہاتھ میں رسّی نما کپڑا تھا جو اولان نے اپنے لہنگے سے پھاڑ کر
دیا تھا اور اس کے گھیرے کے اندر وہ بچی بے گرے پڑے
چل پھر رہی تھی۔ اس بچی کی دیکھ بھال میں وہ اپنا وقت
گزارتا تھا اور وہ اپنی ماں کی گود میں رہتے رہتے اب جڑی چڑی

ہوگئی تھی۔ اصل بات یہ بھی تھی کہ اولان پھر حمل سے تھی اور اسے چھاتی پر چڑھائے رکھنا اس کی طاقت سے باہر تھا۔

وانگ لنگ بچّی کی اٹکھیلیوں اور بڑے میاں کے چوچلوں کا تماشا دیکھتا رہا۔ جب اسے نسیم شب کی رطوبت اپنے چہرے پر محسوس ہوئی تو بے اختیار اپنے کھیتوں کا خیال آیا۔

اپنے باپ کو مخاطب کر کے وہ بولا: "ایسے دن تو کھیت کی جُتائی اور گیہوں کی بُوائی ہونی چاہیے"۔

بڈّھے نے اطمینان سے کہا:۔ "ارے میں تیرے جذبات کو خوب سمجھتا ہوں۔ اس سے پہلے میں قحط کی وجہ سے دو بار زمیں چھوڑ چھاڑ چکا ہوں، کیونکہ اگلی فصل کی کوئی امید نہ تھی"۔

"مگر ابا آپ دونوں مرتبہ دیس لوٹ آئے تھے"۔

"بیٹے، وہاں ہماری زمین ہے"۔ بوڑھے نے سادگی سے کہا۔

وانگ لنگ سوچنے لگا کہ میں بھی دیس لوٹ سکتا ہوں، اس سال نہیں تو اگلے سال۔ جب تک وہ خاکِ پاک ہے مجھے کیا فکر!۔ اس خیال سے اس کا دل بہت تڑپا کہ موسم بہار کی بارش سے نہا دھو کر وہ کھیت اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ گھر لوٹ کر اس نے سختی سے اپنی بیوی سے کہا:

اگر میرے پاس کچھ بھی ہوتا تو بیچ کر گھر کی راہ لیتا۔ اس بڈھے کا خیال نہ ہوتا تو ہم جوں توں کر کے پیدل ہی چل کھڑے ہوتے۔ لیکن ان کے اور بچّی کے لیے سو میل چلنا تو ناممکن ہے۔ اور تم بھی یہ بارِ شکم اٹھائے کیسے چل سکوگی!۔"

اولان برتن دھو رہی تھی۔ انھیں پونچھ کر ایک طرف رکھتے ہوئے اس نے جواب دیا: "چھوٹی لڑکی کے سوا بیچنے کو کچھ نہیں ہے۔"

وانگ لنگ کا دم نکل سا گیا۔ اس نے زور سے کہا:

"میں کوئی بچّہ نہ بیچوں گا۔"

اولان نے نہایت آہستہ سے کہا: "آخر میں بھی تو بیچی گئی تھی۔ میرے والدین بڑی حویلی میں مجھے فروخت کر گئے تاکہ واپسی کا انتظام ہو سکے۔"

"کیا تم واقعتاً اس بچّی کے ٹکے لگانے کے درپے ہو؟"

"مجھ سے پوچھو تو میں اس کا گلا گھونٹنے کے لیے آمادہ ہوں! ... غلامی سے بدتر کوئی چیز نہیں! لیکن اس کی لاش کے کیا دام لگیں گے۔ میں اسے بیچ دوں گی — تاکہ تم واپسی کا بندوبست کر سکو۔"

وانگ لنگ نے کڑی آواز سے کہا: ہرگز نہیں، خواہ میری تمام عمر پردیس ہی میں کیوں نہ گزر جائے۔"

لیکن باہر آکر خلافِ مرضی خود بخود یہ خیال اسے ورغلانے لگا۔ اس نے بچّی کی طرف دیکھا جو اپنے دادا کی گرفت سے نکلنے کے لیے اُچھل کود مچا رہی تھی۔ دن میں جو کچھ روکھا سوکھا مل جاتا تھا اسی سے اُس کی پرورش ہوئی تھی۔ وہ بول تو نہ سکتی تھی لیکن اپنی عمر کے لحاظ سے خاصی تندرست تھی۔ اس کے متبسّم اور لالہ گوں ہونٹ کسی بڑھیا کے ہونٹوں کے سے تھے اور اب بھی باپ سے نظر چار ہوتے ہی وہ مسکرا پڑتی تھی۔

وانگ لنگ سوچنے لگا: اگر یہ یوں نہ مسکراتی اور میں نے اسے گود میں نہ کھلایا ہوتا تو ممکن تھا کہ بیوی کے مشورے پر عمل کر سکتا۔"

پھر یک بیک اسے اپنی زمین کی یاد آئی اور وہ بیتابی سے چلّا اٹھا:

"کیا میں کبھی دیس نہ لوٹوں گا! صبح و شام کی گداگری اور حمّالی کے باوجود یہاں بمشکل روٹی نصیب ہوتی ہے۔"

تاریکی کو چیر کر ایک سنجیدہ آواز نے جواب دیا:

"تم تنہا نہیں بلکہ تم جیسے ہزاروں اس شہر میں پڑے ہیں۔"

یہ شخص جو وانگ لنگ کا پڑوسی تھا بانس کا پائپ پیتے ہوئے قریب آیا۔ دن کے اجالے میں کسی نے اسے نہ دیکھا تھا۔ کیونکہ وہ دن بھر سوتا اور رات بھر مال کی وہ بھاری بھرکم گاڑیاں گوداموں میں لے جاتا جن کا دن کی گھما گھمی میں سڑک سے گزرنا ناممکن تھا۔ بعض اوقات صبح صبح وانگ لنگ نے اسے تکان سے نڈھال، گھر لوٹتے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ خود رکشا بانی کی مہم پر نکلتا اور راہ میں اس سے صاحب سلامت کرتا۔ جھٹپٹے کے وقت وہ شخص کام پر جاتے ہوئے گھڑی بھر کے لیے پڑوسیوں سے گپ لڑانے آجاتا، جو اب اپنے اپنے آشیانوں میں تلاش خواب میں جاتے ہوتے تھے۔

وانگ لنگ نے تلخی سے پوچھا: "کیا زندگی بھر یہ چکر چلتا رہے گا۔"

پڑوسی نے پائپ کا دھنواں دھار کش لگا کر زمین پر تھوکا اور کہا:

"نہیں، ایک روز اس مصیبت کا خاتمہ ہو کر رہے گا۔ جب امیر ضرورت سے زیادہ امیر ہو جائیں گے اور غریبوں کی غربت حد سے تجاوز کر جائے گی تو اس کا سدِّ باب ہو کر رہے گا۔ گزشتہ سرما میں دو بیٹوں کو بیچ کر

ہم نے اپنا کام چلایا۔ خدا کرے اس بار بھی میری بیوی بیٹی ہی جنے کہ اسے بیچ سکیں۔ صرف ایک باندی گھر میں ہے جو میری بڑی لڑکی ہے لڑکیوں کو مارنے کے بدلے بیچ دینا اچھا ہے، حالانکہ ایسے لوگ بھی ہیں جو پیدا ہوتے ہی ان کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ جب افلاس انتہا کو پہنچ جائے تو کیا کیا جائے۔ لیکن امارت جب حد سے تجاوز کر جائے گی تو اس کا مداوا نکل آئے گا اور میری سُن رکھو کہ اس میں زیادہ دیر نہیں!"

سر ہلا کر اور پائپ کی نوک سے اس دیوار کی طرف اشارہ کر کے اس نے پوچھا: "کبھی تم نے اس کے اندر جھانک کر دیکھا ہے؟"

وانگ لنگ لاعلمی کا اظہار کر کے اسے گھورنے لگا۔ پڑوسی نے بیان کیا:

میں ایک غلام زادی وہاں بیچنے لے گیا اور اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا۔ اگر میں تمھیں وہاں کی چہل پہل کا حال سناؤں تو تم یقین نہ کرو گے۔ لیکن میں جھوٹ نہیں بولتا —— وہاں کے خدمت گار بھی روپہلے دستے کی ہاتھی دانت کی تیلیوں سے کھاتے ہیں اور لونڈیوں کے کان زمرد سے اور ان کی جوتیاں موتیوں سے جگمگاتی ہیں۔ اور جب کبھی جوتی میلی ہو جاتی ہے یا اس میں ذرا سی خراش آجاتی ہے تو وہ موتی سمیت انھیں پھینک دیتی ہیں!"

پڑوسی نے ایک لمبا کش کھینچا۔ مگر وانگ لنگ کا منہ کھُلا کا کھُلا رہ گیا۔ تو یہ کہیے کہ اس دیوار کے اندر ایک طلسم آباد ہے!

"جب امارت کی انتہا نہ رہے، تو اس کا ایک ہی علاج ہے۔"

یہ کہہ کر پڑوسی دیر تک خاموش رہا اور پھر وہ یہ کہہ کر شب کی

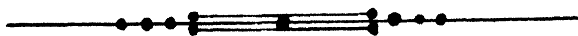
تاریکی میں کھو گیا گویا اس نے اس سے پہلے کچھ کہا ہی نہ تھا:

"اب کام پر چلنا چاہیے۔"

وانگ لنگ کو رات بھر نیند نہ آئی۔ وہ سوچتا رہا کہ اسی دیوار کے پرے سونے رُپے اور موتیوں کی ریل پیل ہے لیکن میرے جسم پر آٹھ پہر اس ایک کرتے کے سوا کچھ نہیں۔ اوڑھنے کو کچھ نہیں اور لیٹنے کو اینٹوں پر یہ چٹائی۔ پھر اس بچی کے بیچنے کا خیال آیا اور وہ دل کو سمجھانے لگا:

"یہ کہیں بہتر ہے کہ وہ کسی بڑے گھر کی لونڈی بن جائے۔ اگر بڑھ کر اس نے روپ نکالا اور کسی رئیس کا دل اس پر آ گیا تو وہ بھی زیوروں میں لدی رہے گی اور بھر پیٹ کھا سکے گی۔" لیکن اپنے کو روک کر وہ یوں سوچنے لگا: لیکن اس سے کیا فائدہ؟ کوئی اس کے وزن بھر رُپے دینے سے تو رہا۔ اگر اس کی قیمت سے واپسی کا کرایہ نکل بھی آیا تو بیل اور گھر باری کا سامان کہاں سے آئے گا؟۔ بچی کو بیچ کر وہاں جانا اور پھر فاقوں کی زندگی بسر کرنا کہاں کی دانائی ہے؟ فصل بونے کے لیے بیج تک تو ہے نہیں۔"

پڑوسی کی اس پہیلی کا حل اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ: "اگر امیر حد سے زیادہ امیر ہو جائیں تو اس کا بھی ایک علاج ہے۔"



باب ۱۴

بالآخر ان غریبوں کے گھر بھی بہار آئی جو گداگری کیا کرتے تھے اب پہاڑیوں اور قبرستانوں میں کلکروندے، لگر متے وغیرہ کی تلاش میں پھرنے لگے، جن میں ابھی ابھی کونپل آئی تھی۔ ہر روز جھونپڑوں سے گدڑی پوش بچّوں اور عورتوں کا غول زنگ خوردہ چھریاں، نوک دار پتھر یا ٹین کے ٹکڑے لیے ہوئے بانس یا سرکنڈے کی ٹوکریوں کے ساتھ نکلتا اور سڑکوں یا میدانوں میں ایسے رزق کی تلاش میں سرگردانی کرتا جس کے لیے نہ دام دینے ہوں، نہ ہاتھ پھیلانا پڑے۔ اولان اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ اس گروہ کی ہم رکاب ہوتی۔

لیکن مردوں پر محنت فرض ہی۔ وانگ لنگ حسب دستور کام کرتا رہا گو کہ دھوپ، گرمی اور بارش مصیبت زدوں میں تمناؤں اور بے اطمینانیوں کی لو سلگاتی رہتی۔ جاڑوں میں ان سب نے جی جان سے محنت کی اور زبان بھی نہ ہلائی۔ ننگے پانو وہ برف پر چلا کیے اور شام کو گھر جا کر چپ چاپ وہ نان شبینہ زہر مار کر لی جو دن بھر کی بھیک اور مشقت کے بعد انھیں میسر آئی تھی۔ پھر مرد، عورت اور بچے ایک ساتھ گہری نیند سو رہتے۔ اس کے باوجود اپنے جسم کو یہ روکھے سوکھے ٹکڑے نہ دے سکتے تھے جس کی انھیں ضرورت تھی۔ یہ وانگ لنگ کی جھونپڑی کی حالت تھی اور جانتا تھا کہ

اس کے پڑوسیوں کے ہاں بھی یہی حال ہے۔
لیکن آمد بہار کے ساتھ ان کے دل کے بندھن کھل گئے۔ اور دل کی بات زبان تک آنے لگی۔ شفق کے دھندلکے میں وہ سب جھونپڑیوں کے باہر جمع ہوتے اور گفتگو کے دوران میں وانگ لنگ کو ایسے پڑوسیوں سے ملنے کا اتّفاق ہوا جنہیں وہ پہلے نہ جانتا تھا۔ اگر اولاد ہوتی تو وہ یا تو کسی بیوی کے پٹنے کی شکایت کرتی یا کسی کوڑھی یا گرہ کٹ کا حال سناتی اور اس کے بعد "ہاں نا" کہہ کر چپ ہو رہتی۔ وانگ لنگ اس قسم کی باتوں کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ دوسروں کی سنتا اور اپنی ایک نہ کہتا۔
ان پھٹے حال پڑوسیوں کے پاس بھیک یا محنت کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ اور وانگ لنگ کو ہمیشہ ان سے ایک بیگانگی سی محسوس ہوتی۔ اس کی اپنی زمین اس کی منتظر تھی۔ دوسروں کو بس یہ فکر تھی کہ کل زراسی مچھلی کہاں سے ملے۔ کس طرح چھٹّی منائیں یا ایک دو آنے کا جوا کہاں کھیلیں۔ کیونکہ ہر روز ان کے لیے گناہ و افلاس کا پیامی تھا اور انسان کتنا ہی مایوس کیوں نہ ہو بازی لگانے سے نہیں چوکتا۔
لیکن وانگ لنگ کو بس اپنی زمین کی دُھن تھی۔ اس اُمید موہوم نے اس کے دل میں یہ لو لگا رکھی تھی کہ کسی ترکیب سے گانو واپس جاؤں۔ نہ تو وہ اس امیر کی حویلی کا غلام ہے اور نہ اس کی دیوار سے لتھڑی ہوئی کیچڑ کا زائیدہ۔ وہ کسان ہے اور اُس وقت تک خوش نہیں رہ سکتا جب تک اس کے پانو تلے زمین نہ ہو۔

بسنت میں ہاتھوں میں ہل اور دھان کٹائی کے سمے ہاتھوں میں کھرپی نہ ہو۔ اسی لیے وہ ان باتوں کو اوپری دل سے سنتا تھا کیونکہ اس کے دل میں یہ خیال پوشیدہ تھا کہ وہ کئی کھیتوں کا مالک ہے۔ گیہوں کے وہ کھیت جو اس کے اجداد چھوڑ گئے تھے، اور چاول کے وہ کھیت جو اس نے خود خریدے تھے۔

یہ لوگ ہمیشہ روپیوں کا ذکر کیا کرتے۔ چار گرہ کپڑے کے کتنے پیسے دیے، بالشت بھر مچھلی کے کو آنے لگے، دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد پلّے کیا پڑا۔ ٹیپ کا بند یہ ہوتا کہ اگر اس حویلی کے خزانے انھیں مل جائیں تو کیا کریں۔ ہر صحبت کا خاتمہ اس لفظ خیر کے ساتھ ہوتا:

"کاش میرے پاس وہ سونا ہوتا جو اس کی پیٹی میں ہے، اور وہ چاندی جو اس کے جیب میں ہر روز کھنکتی ہے، اور وہ زمرّد جو اس کی بیوی کے جسم پر اور وہ موتی جو اس کی خادماؤں کے بدن پر ہیں ......!"

اگر یہ مال دولت انھیں مل جائے تو وہ کیا کریں گے، اس کی نسبت وانگ لنگ نے صرف یہ سنا کہ وہ کیا کھائیں گے اور خوب آرام کریں گے۔ اُن نعمتوں کا ذکر جو ان کی نظر سے بھی نہ گزری تھیں، اور قہوہ خانوں میں قمار بازی کی خواہش، حسین عورتوں کی خرید کے چرچے۔ سب سے زیادہ یہ خواہش کہ وہ کبھی کام نہ کریں گے اور ہمسایہ امیر کی طرح نٹھلّے رہیں گے۔

یہ سن کر وانگ لنگ یک بیک پکار اٹھا:

"اگر میرے پاس اتنی دولت ہوئی تو میں اچھی اچھی زمینیں خریدوں گا اور اُن سے غلّہ پیدا کروں گا۔"

اب تو سب لوگ بیک آواز اُس سے اُلجھ پڑے

"اس کوڑھ مغز گنوار کو جو نہ تو شہری زندگی کو سمجھتا ہی اور نہ دولت کے صحیح مصرف کو۔ اسے تو بیل یا گدھے کی دُم پکڑے غلامی کرنے میں مزہ آتا ہی۔" ان میں سے ہر ایک کو یقین ہو گیا کہ وہ وانگ لنگ سے زیادہ اس دولت کا اہل ہی کیونکہ وہ بہتر طریقے سے اسے خرچ کر سکے گا۔

لیکن وانگ لنگ نے اس حقارت کا کوئی اثر قبول نہ کیا۔ آپ ہی آپ وہ یوں منصوبے گانٹھنے لگا۔

"یہ بکا کریں، لیکن میں ہیرے موتی کو زرخیز زمین کی شکل میں بدل لوں گا۔"

یہ ادھیڑ بُن اُسے اپنی زمین کے لیے زیادہ بے چین کرنے لگی۔

دن رات اسی خیال میں محو رہنے کی وجہ سے اسے اپنے گرد و نواح کی زندگی پرخواب کا سا گمان ہونے لگا۔ کوئی عجیب چیز دیکھ کر بھی وہ اس کی وجہ دریافت نہ کرتا تھا۔ مثلاً اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ لوگ آئے دن پرچے کیوں بانٹا کرتے ہیں اور کبھی کبھی اُسے بھی بے مانگے کیوں دے دیتے ہیں۔

وانگ لنگ نے کبھی پڑھنا لکھنا نہ سیکھا تھا۔ یہ کالے انچھر اس کی سمجھ میں نہ آتے تھے، جو اشتہاروں کی صورت میں شہر پناہ پر

چپکا دیئے جاتے یا لوگوں میں بانٹ دیے جاتے تھے۔ دو مرتبہ اسے یہ اشتہار ملے تھے۔

پہلی بار ایک پردیسی نے اُسے ایک اشتہار دیا تھا۔ یہ پردیسی ویسا ہی تھا جسے اس نے کبھی رکشا پر بٹھایا تھا، فرق یہ تھا کہ یہ مرد تھا اور اس قدر نحیف، گویا آندھی نے کسی پیڑ کو مروڑ کر رکھ دیا ہو۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں اور چہرا ریش آلودہ۔ اس کے ہاتھوں پر بھی بال تھے اور اس کا رنگ بھی سرخ تھا۔ اس کی بڑی سی ناک گالوں کے آگے یوں ابھر آئی تھی جیسے جہاز کا مستول۔ وانگ لنگ اس کے ہاتھ سے کچھ لیتے ہوئے ڈرا، لیکن اس کی نیلی آنکھوں اور بڑی سی ناک کو دیکھ کر انکار کرنے کی بھی جرأت نہ ہوئی۔ جب یہ گورا چلا گیا تو وانگ لنگ نے اشتہار پر نگاہ ڈالی۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک گورے آدمی کی تصویر بنی ہے جو چوبی صلیب پر ٹنگا ہوا ہے۔ ایک لنگوٹی کے سوا اس کے جسم پر کوئی کپڑا نہیں۔ بظاہر وہ مردہ تھا کیونکہ اس کا سر کندھے پر ڈھلک آیا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔ وانگ لنگ سہمی ہوئی دلچسپی سے اس تصویر کو دیکھتا رہا۔ اس کے نیچے کچھ لکھا ہوا تھا جسے وہ نہ پڑھ سکا۔

رات کو وہ یہ تصویر گھر لے گیا اور اپنے باپ کو دکھائی۔ وہ بھی ان پڑھ تھا۔ چنانچہ گھر کے سب لوگ اس کے متعلق قیاس لگانے لگے۔ دونوں لڑکے قدرے وحشت اور قدرے حیرت کے ساتھ چیخ پڑے:

"اس کے سینے سے یہ خون کیسا نکل رہا ہے!"

اور بڑے میاں نے رائے زنی کی:

"یہ ضرور کوئی بدکار ہوگا کہ یوں سولی پر چڑھا دیا گیا۔"

لیکن وانگ لنگ خوف زدہ ہوکر غور کرنے لگا کہ پردیسی نے یہ تصویر اسے کس غرض سے دی تھی۔ ممکن ہو کہ مقتول اس کا بھائی ہو اور وہ یا اس کے ہم قوم اس قتل کا انتقام لینا چاہتے ہوں۔ یہ سوچ کر کئی روز تک وہ اس سڑک کی طرف نہ گیا۔ جب یہ واقعہ گیا گزرا ہوا تو او-لان نے ردّی کاغذوں کے ساتھ یہ تصویر کسی جوتے کے تلے میں لگا دی تاکہ وہ مضبوط ہو جائے۔

دوسری مرتبہ جس نے اسے ایک پرچہ دیا وہ ایک خوش لباس نوجوان تھا جو اُن لوگوں سے بے تکلفانہ باتیں کر رہا تھا جو ایسے موقعوں پر لامحالہ سڑکوں پر جمع ہو جایا کرتے ہیں۔ اس پرچے پر بھی موت کی تصویر تھی لیکن یہ کوئی پردیسی گورا نہیں بلکہ وانگ لنگ کا ہم جنس اور ہم قوم تھا ــــــ پیلی رنگت کا زار و نحیف، شکستہ حال مفلس۔ اس کی مردہ لاش پر ایک فربہ اندام کھڑا ہوا بڑے سے چھرے سے پے در پے اس پر وار کر رہا تھا۔ یہ نظارہ دردناک تھا اور وانگ لنگ اس کی تحریر کو بوجھنے کی سعئ لاحاصل کرنے لگا۔ پاس کھڑے ہوئے کسی آدمی سے اس نے پوچھا:

"آپ اگر کچھ شُد بُد جانتے ہیں تو مجھے اس ہولناک سانحے کی تفصیل پڑھ کر سنائیے؟"

جواب ملا: "خاموشی سے سنو، یہ نوجوان ہمیں سب کچھ سمجھا دے گا۔"

اب وانگ لنگ نے جو کچھ سنا وہ اس سے پہلے کبھی اس کے گوش گزار نہ ہوا تھا۔

نوجوان بولا: "یہ مردہ لاش تمھاری ہے۔ قاتل وہ امیر اور سرمایہ دار ہے جو جیتے جی اور بعد موت تمھارا خون پیتا رہتا ہے۔ تم نادار و خوار ہو کیونکہ سرمایہ دار تمھاری متاع غصب کر رہا ہے۔"

جب پانی کم یا زیادہ برستا تھا تو وانگ لنگ قدرت کو رو دھو کر چپ ہو رہتا تھا۔ جب بارش اور دھوپ کا توازن ٹھیک ہوتا اور فصل اچھی ہوتی تو وانگ لنگ اپنے کو غریب نہ سمجھتا۔ اس وجہ سے وہ اشتیاق سے تقریر سننے لگا تاکہ بے آبی سے سرمایہ دار کا تعلق معلوم کر سکے۔ جب اس مسئلے کو چھوڑ کر مقرر زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگا تو وانگ لنگ سے نہ رہا گیا اور وہ پوچھ بیٹھا:

"حضرت، کوئی ایسی صورت بھی ہے کہ یہ ظالم سرمایہ دار برابر پانی برساتے رہیں تاکہ میں برابر کام کر سکوں؟"

نوجوان نے حقارت سے اسے گھور کر جواب دیا:

"تم بھی کتنے احمق ہو، اور تمھاری حماقت تو اس چوٹی سے ہی ظاہر ہے! جب پانی کے دن نہ ہوں گے تو کوئی پانی نہیں برسا سکتا۔ لیکن اس سے ہمیں کیا غرض؟۔ اگر سرمایہ دار اپنی پونجی ہمیں بانٹ دیں تو بارش ہو یا نہ ہو، ہم سب کے پاس رزق و دولت کی بہتات ہوگی!"

اس پر ہر طرف سے تحسین و آفریں کی صدا بلند ہوئی، لیکن وانگ لنگ کو تسلّی نہ ہوئی۔ آخر زمین زمین ہی ہے۔ پیسہ تو ہاتھ کا

میل ہے، اور پانی یا گرمی میں کمی زیادتی ہوئی تو قحط یقینی ہے۔
نوجوان نے اسے جو پرچے دیئے اس نے خوشی خوشی لے لیے تاکہ جوتوں کے تلے میں لگانے کے کام آئیں۔ اولان کو یہ سب دے کر اس نے کہا:
"اب نہ کہنا کہ جوتوں میں دینے کے لیے ردّی کے کاغذ نہیں ہیں"
اور وہ بدستور کام میں لگ گیا۔
شام کی گفتگو کے دوران میں اسے معلوم ہوا کہ پڑوسیوں میں سے کئی کو نوجوان کی باتیں پسند آئیں۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ پسِ دیوار ایک سرمایہ دار کی حویلی تھی اور اُس حویلی اور ان جھونپڑیوں کے درمیان صرف ایک دیوار کا فصل تھا اور یہ دیوار اُن مضبوط کانوروں کی ضربوں سے توڑی جا سکتی تھی۔ جنھیں وہ بوجھ لادنے کے لیے کاندھے پر لادے پھرتے تھے۔
بہار کی فطری اشتعال انگیزی کے ساتھ اب یہ نئی بے چینی ہر طرف پھیلنے لگی جو اس قسم کے نوجوان خاک نشینوں میں پیدا کر رہے تھے —— یہ خیال کہ جو اُن کے پاس نہیں ہے وہ بے انصافی کے سبب سے دوسروں کو حاصل ہے۔ ہر شام ان مسئلوں پر بحث کرتے کرتے اور روز بروز بے گار کرتے کرتے جوانوں اور جگرداروں میں ایک ایسا طوفان اٹھا جو سیلاب کی طرح بے روک ٹوک پھیلتا چلا گیا —— یہ خواہشات کی تکمیل کا تقاضا تھا۔
لیکن وانگ لنگ ان سب باتوں کو دیکھ اور سن کر اور ان کے غصّے سے متاثر ہونے کے باوجود اسی خیال میں مگن رہا کہ اپنی زمین تک

کس طرح پہنچے۔

اس شہر میں جو عجائبات کا مخزن تھا، وانگ لنگ نے ایک نئی چیز دیکھی جو اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ ایک روز جب وہ رکشا لیے گاہکوں کا انتظار کر رہا تھا تو کیا دیکھتا ہے کہ کچھ مسلح سپاہی ایک آدمی کو گرفتار کر رہے ہیں اور جب اس نے احتجاج کیا تو تلواروں کی جنبش نے اس کی زبان بند کر دی۔ وانگ لنگ کے دیکھتے ہی دیکھتے کئی آدمی پکڑے گئے اور اس نے دیکھا کہ یہ سب غریب مزدور ہیں۔ ابھی اس کے اوسان سدھرے بھی نہ تھے کہ اس کا ایک پڑوسی بھی اس نرغے میں آگیا۔

یہ دیکھ کر اس کے حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ ان گرفتاروں کو اپنے گناہ کا مطلق علم نہ تھا اور وہ خواہ مخواہ اس طرح باندھ دیے گئے تھے۔ پاس کی گلی میں اپنی رکشا چھوڑ کر وہ گرم پانی کی دُکان میں جا چھپا کہ مبادا دوسروں کی طرح دھر نہ لیا جائے اور تب تک دیگوں کے پیچھے دبکا رہا جب تک سپاہی گزر نہ گئے۔ جب اس نے دکاندار سے اس معمّے کا حل دریافت کیا۔ بھاپ کی لہروں میں رہتے رہتے یہ بڈّھا گیلے کپڑے کی طرح لجلجا ہو گیا تھا۔ وہ بولا: "اب پھر کہیں جنگ ہو رہی ہو گی۔ کسے معلوم کہ یہ مرغے کیوں لڑتے رہتے ہیں؟ بچپن سے لے کر اب تک یہی دیکھتا آیا ہوں اور میری موت کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔"

وانگ لنگ نے سخت استعجاب کے عالم میں پوچھا: لیکن میرا پڑوسی اتنا ہی بے گناہ ہے جتنا میں۔ اور اسے اس جنگ کی کوئی اطلاع

نہ تھی۔ وہ کیوں گرفتار ہو گیا؟"

بڈھے نے دیگوں کے ڈھکنے کھڑکھڑاتے ہوئے جواب دیا:

"یہ سپاہی کہیں لڑنے جا رہے ہیں اور انھیں بار برداری کے لیے تم جیسے قلیوں کی ضرورت ہے۔ اسی وجہ سے وہ جبر کرتے ہیں۔ لیکن تم کہاں کے رہنے والے ہو؟۔ اس شہر میں یہ تماشا آئے دن ہوا کرتا ہے۔"

وانگ لنگ کا دم رُکنے لگا: "لیکن اس کی اجرت —— محنتانہ——"

اس بڈھے فرتوت نے جسے کسی سے کوئی توقع نہ تھی اور نہ اپنی دیگوں کے علاوہ کسی سے کوئی دلچسپی تھی، لاپروائی سے کہا:

"میاں، اللہ کا نام لو۔ کاہے کی اُجرت۔ دن بھر میں روٹی کے دو ٹکڑے مل گئے اور تالاب کا پانی تو بہت ہے۔ جب یہ سپاہی ٹھکانے لگ گئے اور تمھارے پاؤں صحیح سلامت رہے تو گھر لوٹ سکتے ہو۔"

وانگ لنگ ساری سٹی بھول گیا: "اور اُن کے بال بچے۔"

"انھیں اس خرافات سے کیا مطلب؟" بڈھے نے حقارت سے کہا اور وہ ڈھکنا ہٹا کر دیکھنے لگا کہ ہنوز پانی میں اُبال آیا یا نہیں۔ بھاپ کے بادل نے اس کا حلقہ کر لیا اور اب وہ مشکل سے نظر آ رہا تھا۔ بلاشبہہ وہ رحم دل تھا کیونکہ وانگ لنگ سڑک کا جو منظر نہ دیکھ سکتا تھا وہ اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ جب دوبارہ سپاہیوں کا جھنڈ سڑکوں کو ڈھونڈتا اور مزدوروں کو کھدیڑتا

ہوا قریب آیا تو اس نے کہا:

"جلدی سے دبک جاؤ۔ وہ لوگ پھر اِدھر آرہے ہیں۔"

وانگ لنگ چھپ گیا اور جب سپاہی کھٹ پٹ کرتے ہوئے پچھم میں اوجھل ہوگئے تو وانگ لنگ اپنی جائے پناہ سے برآمد ہوا اور رکشا اٹھا کر بیک بینی دو گوش اپنے جھوپڑے کو بھاگا۔

اولان میدان سے ذرا سی بھاجی چن لائی تھی اور اسے پکانے بیٹھی ہی تھی۔ اسے ہانپتے کانپتے ہوئے وانگ لنگ نے یہ ماجرا سنایا۔ وہ اُسے اپنے فرار کا قصہ سناتے سناتے اس خیال سے دہل اٹھا کہ کہیں پکڑ کر میدان جنگ نہ بھیج دیا جائے۔ پھر اس کا کنبہ فاقوں سے مرجائے گا، خود اس کی جان ماری جائے گی اور وہ سب کھیت دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ اولان کو حسرت سے دیکھ کر اس نے کہا:

"اب میں لڑکی کو بیچ کر اپنے گاؤں پہنچنا چاہتا ہوں۔"

کچھ سوچ بچار کر عورت نے اپنے مخصوص انداز میں کہا:

"کچھ روز اور دیکھ لو۔ آج کل عجیب و غریب چہ میگوئیاں ہورہی ہیں۔"

دن کے اُجالے میں باہر جانے کی اس نے قسم کھالی۔ بڑے بیٹے کے ہاتھ اس نے رکشا اس کے مالک کو لوٹا دی۔ رات کو گوداموں میں جاکر وہ آدھی اُجرت پر ٹھیلے کھینچنے لگا۔ دس دس آدمی ایک گانٹھ اٹھاتے اور بوجھ کے مارے کراہنے لگتے۔ اور ان صندوقوں میں روئی یا ریشم یا خوشبودار تمباکو ہوتا اور اس کی مہک اتنی تیز ہوتی کہ چھن چھن کر باہر نکلتی۔ تیل اور شراب کے بڑے بڑے گیلن بھی ہوتے تھے۔

رات بھر تنگ گلیوں میں وہ بوجھ ڈھوتا رہا۔ اس کا ننگا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا، ننگے پاؤں پتھروں پر پھسلنے لگے کیونکہ اوس کی وجہ سے وہ نم پڑ گئے تھے۔ راستہ دکھانے کے لیے آگے آگے ایک لڑکا مشعل لیے چلتا تھا اور اس کی روشنی میں یہ گیلے پتھر اور انسانوں کے پتھرائے ہوئے جسم ایک جیسے معلوم ہوتے تھے۔ پو پھٹنے سے پہلے وہ گھر لوٹا، اتنا نڈھال کہ بھوک بھی باقی نہ تھی۔ لیکن دن کو جب سپاہی سڑکوں کی تلاشی لیتے تو وہ اطمینان سے گھاس کی ڈھیری میں سوتا رہتا۔ جو اولان نے اس کے تحفظ کے لیے جمع کر رکھی تھی۔

جنگ کہاں اور کن میں ہو رہی تھی، وانگ لنگ کو اس کا علم نہ تھا۔ لیکن دوسری بہار کے آتے ہی شہر میں کھل بلی سی مچ گئی۔ ہر روز گھوڑا گاڑیوں میں دولت مند اپنی متاع اور بیویوں سمیت لدے پھندے ندی کنارے جاتے نظر آتے تھے جہاں سے جہاز انھیں دوسرے مقاموں کو لے جاتے تھے۔ یا یہ امیر اس مکان میں جمع ہو رہے تھے جہاں سے آگ بجھانے والی گاڑیاں آتی جاتی رہتی تھیں۔ وانگ لنگ خود تو باہر نہ جاتا تھا لیکن اس کے بیٹے دوڑ کر آتے اور اچنبھے سے پکار اٹھتے:

ہم نے ایک آدمی دیکھا جو مندر کے دیوتا سے زیادہ توندل اور موٹا تھا۔ وہ زرد ریشم کے پورے تھان میں ملبوس تھا اور اس کی انگلی میں سونے کی انگوٹھی تھی جس میں ایک سبز پتھر آئینے کی مانند جگمگا رہا تھا۔ اس کا بدن کھلائی اور ملائی کے سبب سے

دمک رہا تھا۔"

بڑے لڑکے نے سنایا:

"ہم نے بڑے بڑے صندوق جاتے دیکھے اور جب پوچھا کہ ان میں کیا ہے کسی نے کہا کہ 'ان میں سونا روپا ہے۔ مالک یہ سب کچھ نہیں لے جا سکتا اور کبھی یہ ہمارے ہتّے چڑھے گا۔' ابّا، دراصل اس کا مفہوم کیا تھا؟" یہ کہہ کر لڑکے نے باپ کو متجسس نگاہوں سے دیکھا۔

جب وانگ لنگ نے جھلّا کر جواب دیا: "ان بے کار شہریوں کی بات چیت بے معنی ہوا کرتی ہے۔" تو لڑکا حسرت سے بول اٹھا:

"ہمیں چل کر اس میں حصّہ بانٹ لینا چاہیے۔ نان خطائی کھانے کو بے اختیار جی چاہتا ہے۔ آج تک میں نے تل کے لڈّو بھی نہیں چکھے۔"

اب تو بڑے میاں کی نیند بھی غائب ہوگئی اور وہ بڑبڑانے لگے:

"جب اچھّی فصل ہوتی تو تیوہاروں میں ہمارے گھر یہ لڈّو بنا کرتے تھے۔ تل صاف کر کے منڈی لے جاتے وقت ہم تھوڑے سے بچا رکھتے تھے کہ تقریبوں میں کام آئیں۔"

وانگ لنگ کو وہ کلچے یاد آئے جو نوروز کو اولان نے بنائے تھے۔ اس کے منہ میں پانی بھر آیا اور گزشتہ یاد نے دل میں چٹکی سی لی۔

"کاش ہم اپنے گانو لوٹ سکتے" وہ آپ ہی کہہ اٹھا۔ اور یکایک اس کے من میں یہ ترنگ اٹھی کہ اب اس جھونپڑی میں ایک روز بسر کرنا بھی محال ہے جہاں پانو پھیلا کر سونے کی جگہ بھی

نہ تھی اور نہ وہ رات کو مزید بار برداری کر سکے گا جب کہ جسم کو کاٹتی ہوئی رسی میں بندھے بندھے سڑکوں پر حیوانوں کی طرح بوجھ ڈھونا ہوتا ہے۔ راہ کے ہر روڑے کو وہ اپنا بَیری تصور کرتا اور ہر ایک کو پہچانتا تھا جو اُسے ان روڑوں سے پناہ دے اور زندگی کے ایک آدھ ذرّے کو ضائع ہونے سے بچالے۔ اندھیری راتوں میں ایسی ساعتیں بھی آتیں جب برسات نمناک رستوں کو اور بھی ترکر دیتی۔ پھر تو وانگ لنگ کی تمام تر نفرت ان سنگ ریزوں کی طرف منعطف ہو جاتی جو اس کے بوجھل ٹھیلوں کو آگے نہ بڑھنے دیتے۔

"ہائے میری دھرتی ماتا!" کہہ کر وہ یک بیک یوں دہاڑ مار کر رونے لگا کہ لڑکے خوف زدہ ہو گئے اور اپنے بیٹے کی مایوسی دیکھ کر بڈّھا اپنی چُگّی ڈاڑھی میں منہ یوں ہلانے لگا جیسے روتی ہوئی ماں کو دیکھ کر بچّہ کرتا ہے۔

اولان نے اپنے اُسی بے احساس انداز میں کہا:

"ذرا صبر سے کام لو اور دیکھو کہ کیا ظہور میں آتا ہے۔ ہر طرف عجیب و غریب افواہیں اُڑ رہی ہیں۔"

اپنی جھونپڑی میں لیٹے ہوئے وانگ لنگ ہر آن سپاہیوں کے قدم کی آہٹ سنتا تھا جو میدان جنگ کو کوچ کر رہے تھے۔ ٹٹّی کی دراڑ سے جھانک کر وہ صرف یہ دیکھ سکتا تھا کہ موزوں یا چرمی پاپوشوں کی ایک لا متناہی قطار ہے جو یلغار کیے جاتی ہے۔ رات کو حمّالی کرتے وقت وہ سپاہیوں کو قریب سے گزرتے ہوئے دیکھتا جن کے چہروں کو رہنما مشعل کی جوت دم بھر کے لیے

اُچال دیتی۔ ان کے متعلق کچھ پوچھنے کی جرات اُسے نہ ہوتی تھی۔ اپنا بوجھ لاد بھاند کر وہ جلدی جلدی کھانا کھاتا اور دن لوٹ پوٹ کر گزار دیتا تھا۔ ان دنوں کوئی کسی سے کچھ نہ کہتا تھا۔ شہر پر خوف کی فضا چھائی ہوئی تھی اور ہر آدمی جھٹ پٹ اپنا کام ختم کر کے گھر لوٹ جاتا اور اپنے کو اندر سے بند کر لیتا تھا۔

جھونپڑیوں کے اردگرد جھٹپٹے کے وقت گپ شپ کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ شہر کے بازار سونے پڑے تھے۔ ریشم کی دوکانوں نے اپنے سائن بورڈ (نام کے تختے) اُتار دیے اور دروازوں کو بڑی مضبوطی سے مقفّل کر دیا۔ غرض کہ بھری دوپہر میں گمان ہونے لگا کہ یہ شہر ویرانہ ہو گیا ہے۔

چہار سو کانا پھوسی ہونے لگی کہ غنیم سر پر آ پہنچا۔ جو مالدار تھے وہ سخت ہراساں تھے۔ مگر وانگ لنگ یا اس کے پڑوسیوں کو کوئی پروا نہ تھی۔ ایک تو وہ جانتے ہی نہ تھے کہ یہ غنیم کون ہے۔ علاوہ بریں اُنھیں اپنی زندگی کی پروا تو تھی نہیں، کسی اور چیز کا تو کیا ذکر۔ دشمن گھر میں گھسا آتا ہے تو آیا کرے، اس سے بدتر ان کی حالت ہو ہی نہیں سکتی۔ ہر آدمی اپنی راہ جا رہا تھا اور سر بازار کسی سے بات چیت نہ کرتا تھا۔

اب گوداموں کے منیموں نے حمالوں کو برطرف کر دیا کیونکہ اس زمانے میں مال کی خرید و فروخت یک لخت بند تھی۔ لہذا وانگ لنگ کو دن رات خرّاٹے بھرنے اور اینڈنے کے سوا کوئی کام نہ رہا۔ پہلے تو وہ خوش ہوا کیونکہ اس پر ایسی تھکن سوار تھی

کہ گھنٹوں سوتا اور پھر بھی نیند پوری نہ ہوتی تھی۔ لیکن کام کے ساتھ کمائی بھی بند ہو گئی تھی اور چند روز میں ان کی جمع پونجی ختم ہو گئی۔ اب پھر میاں ہنجو تلاش روزگار میں مارے مارے پھرنے لگے۔ گویا یہ مصیبت ان کے لیے کافی نہ تھی کہ لنگر خانے بھی بند ہو گئے۔ اور ان کے کارکنوں نے اپنی اپنی راہ لی۔ اب نہ تو کام تھا نہ روٹی اور نہ راہ گیر جن سے بھیک مل سکے۔

وانگ لنگ نے اپنی بیٹی کو گود میں لیا اور نرمی سے پوچھا:

"کیوں ری بگلی، تجھے کسی بڑی حویلی میں رہنا پسند ہے جہاں پیٹ بھر کر کھاتا اور تن ڈھانکنے کو کپڑا ملا کرے؟"

لڑکی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور مسکرا کر اس نے اپنے باپ کی وحشت زدہ آنکھوں کو پکڑنے کی کوشش کی۔ وانگ لنگ سے ضبط نہ ہو سکا اور اس نے کرب آمیز آواز میں اپنی بیوی کو آواز دی:

"کیوں جی! کیا اُس حویلی میں کبھی پیٹا بھی جاتا تھا؟"

اولان نے سادگی سے جواب دیا:

"ہر روز مجھ پر مار پڑتی تھی۔"

"کمر بند سے، قمچی سے یا چابک سے؟"

"میں اُس چابک سے پیٹی جاتی تھی جو کبھی جانوروں کو ہانکنے کے کام آتا تھا اور باورچی خانے میں لٹکا دیا گیا ہے۔"

وہ جانتا تھا کہ اولان اس کا مدعا سمجھ رہی ہے۔ تاہم اپنی آخری امید کی بازی لگا کر اس نے پوچھا:

"ہماری بیٹی اس وقت بھی شکیل ہے۔ کیا حسین باندیوں کو بھی

زد و کوب کیا جاتا ہے؟"

عورت نے ایسی بے نیازی سے گویا اس معاملے میں اسے کوئی تعلق نہیں، جواب دیا:

"یہ مالک کی مرضی ہے۔ جب چاہے اُسے پیٹے اور جب چاہے اسے ساتھ سلائے۔ وہ صرف ایک کے لیے نہیں ہوتی بلکہ رات کو جس کا دل آئے اسے لے جا سکتا ہے۔ صاحب زادے باندیوں کے لیے تکرار کرتے اور بازی لگاتے تھے۔ کوئی کہتا کہ "اچھا آج تمھاری تو کل میری باری ہوگی۔ اور جب وہ سب کسی لونڈی سے سیر ہو جاتے تو ان کی جھوٹن پر نوکر چاکر جھپٹ پڑتے تھے۔ اور یہ سب اس حسین باندی کے ساتھ ہوتا تھا جو ابھی جوان بھی نہ ہوئی ہو۔"

وانگ لنگ نے آہ بھر کر بچّی کو سینہ سے چمٹا لیا اور زیرِ لب "اری ننھی پگلی" کہتا رہا۔ لیکن اس کا دل اس طریقے سے رو رہا تھا گویا کوئی سیلاب زدہ سوجھ بوجھ کھو بیٹھے اور کہنے لگے "بس یہی ایک راستہ ہے۔"

ابھی وہ یوں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایسی دہشت ناک گرج کی آواز آئی گویا آسمان پھٹ رہا ہو۔ اور سب نے خود بخود زمین پر گر کر منہ چھپا لیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ یہ کڑک اور گرج ان کے ٹکڑے اڑا دے گی۔ وانگ لنگ نے بچّی کا منہ اپنی ہتھیلی سے ڈھک لیا کیونکہ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس غلغلے کے بعد کس قسم کی مصیبت آنے والی ہے۔ بڈّھے نے وانگ لنگ کے کان میں چیخ کر کہا: "بھئی یہ شورِ قیامت تو میں نے بھی آج تک نہ سنا تھا۔" اور دونوں لڑکے ہراس کے مارے چلّانے لگے۔

مگر اولان نے خاموشی ہوتے ہی سر اٹھا کر کہا: "میں نے جو کچھ سنا تھا وہی نظر کے سامنے آیا۔ دشمن شہر پناہ کے اندر داخل ہو رہا ہے۔" یہ جملہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ شہر سے ایک شور اٹھا۔ یہ انسانوں کی آواز تھی جو پہلے دھیمی تھی۔ جس طرح آندھی رفتہ رفتہ قریب آرہی ہو۔ اور پھر یہ قیامت خیز شور ہر درو دیوار میں تھرتھری ڈالنے لگا۔

وانگ لنگ جھوپڑی کی زمین پر تن کر بیٹھ گیا۔ ایک عجیب سی ہراس اس کے دل میں اٹھی اور اس کا رُواں رُواں کانپنے لگا۔ گھر کے سب لوگ مبہوت ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے اور کسی نامعلوم واقعے کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن انسانوں کی بھیڑ کے ہلّے کے سوا کوئی کانوں پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی اور اس بھیڑ کا ہر فرد گلا پھاڑ کر چلّا رہا تھا۔

اتنے میں دیوار کے پرے اور جھوپڑی کے پاس انھوں نے ایک بڑے پھاٹک کے چرمرانے اور ٹوٹنے کی آواز سنی۔ اسی وقت اس پڑوسی نے جس نے کسی شام کو پائپ پیتے ہوئے وانگ لنگ سے گفتگو کی تھی، جھوپڑی کے اندر سر ڈال کر کہا:

"ایں، تم اب بھی یہاں دھونی رمائے بیٹھے ہو۔ اماں، وہ مبارک ساعت آپہنچی ——— سیٹھ کی حویلی کے دروازے ہمارے لیے کھل گئے ہیں!" یہ سننا تھا کہ اولان اس شخص کے ساتھ گویا جادو کے زور سے غائب ہو گئی۔

بچّی کو نیچے رکھ کر وسوسے اور ہراس کے عالم میں وانگ لنگ اُٹھ کھڑا ہوا اور باہر آکر دیکھا کہ سرمایہ دار کے آہنی پھاٹک کے

آگے عوام کا ایک جمِّ غفیر شور مچاتا اور دھکّے دیتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ وہی ہولناک گرج تھی جو سڑکوں سے متواتر آرہی تھی اور بتلارہی تھی کہ ہر امیر کے در پر ننگے بھوکوں کا یہی گروہ موت کی دستک دے رہا ہے —— وہ زن مرد جو فاقہ و افلاس اور قید و بند میں رہتے آئے تھے اب اس گھڑی زندگی پر حکمراں تھے۔ آہنی دروازے کھُل گئے تھے اور حملہ آوروں کی وہ ریل پیل تھی کہ سب لوگ ایک دوسرے سے گتھ گئے تھے اور پوری بھیڑ ایک ساتھ حرکت کرسکتی تھی۔ وانگ لنگ بھی پھسڈیوں کے نرغے میں آگیا اور ریلے میں آگے بڑھ گیا۔ ان واقعات نے اُسے ایسا چکرا دیا تھا کہ وہ سوچ بچار کا اہل نہ رہا تھا۔

پھاٹک کی چوکھٹ پار کرتے وقت اسے محسوس بھی نہ ہوا کہ پیر زمین پر پڑے یا نہیں ایسی دھکّم دھکّا تھی اور حیوانوں کی طرح یہ انسان دہاڑ رہے تھے۔

دالان در دالان وہ حرم کے اندر تک جا پہنچا لیکن کہیں ایک مکین بھی نظر نہ آیا گمان ہوتا تھا کہ یہ محل عرصے سے خوابیدہ ہے۔ زندگی کے آثار صرف اُن پھولوں سے عیاں تھے جو چمن میں لہلہا رہے تھے اور پیڑ کی اُن کونپلوں سے جو بہار کو سلام کر رہی تھیں۔ لیکن کمروں میں میز پر کھانے چنے ہوئے تھے اور باورچی خانوں میں آگ دہک رہی تھی جو بھی ہو، ان بلوائیوں کو امیروں کی کوٹھی کا نقشہ خوب یاد تھا۔ کیونکہ وہ غلام گردش اور باورچی خانوں کو چھوڑ کر اُن اندرونی دالانوں کی طرف لپکے جہاں امیروں اور بیگموں کی

خواب گاہیں ہوتی ہیں ، جہاں سنگار میزیں ، گہنوں اور کپڑوں کی پیٹیاں اور عیش کے سب سامان ہوتے ہیں۔ لوگ ان سامانوں پر ٹوٹ پڑے۔ ہر صندوق یا الماری سے جو کچھ برآمد ہوتا۔ خواہ وہ لباس ہو یا توشک یا پردہ —— ہاتھوں ہاتھ یہاں سے وہاں جا پہنچتا۔ کیونکہ لوگ بغیر دیکھے بھالے ایک دوسرے کے ہاتھ سے اُسے چھیننے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس آپا دھاپی میں صرف وانگ لنگ کے ہاتھ کچھ نہ لگا۔ آج تک اس نے کسی دوسرے کے مال کو ہاتھ نہ لگایا تھا اور اس وقت بھی اسے یک بیک اس کی جرات نہ ہوئی۔ بھیڑ کے بیچوں بیچ وہ تھپیڑے کھاتا کھڑا رہا۔ جب اسے ہوش آیا تو بہ ہزار دقت بھیڑ کو چیر کر الگ نکل آیا اور اس غول کے چھور پر یوں کھڑا ہو گیا جیسے کسی موجزن دریا کے کنارے ایک بے حقیقت بلبلہ۔ تاہم یہاں سے وہ آس پاس کا نظارہ کر سکتا تھا۔

اب وہ آخری بارہ دری میں تھا جہاں امیروں کی بیویاں رہتی ہیں تو کیا دیکھا کہ جو دروازہ جو صدیوں سے ان کے لیے راہِ مزار کا کام دیتا آیا ہے اور اسی وجہ سے باب الامن کہلاتا ہے کھلا ہوا تھا۔ یقیناً وہ وہ سب آج اسی راستہ سے چمپت ہو گئے تھے اور یہاں وہاں چھپ کر عوام کے غضب کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ لیکن ایک آدمی جو اپنے موٹاپے یا شراب کے نشے کی وجہ سے بھاگ نہ سکا تھا اتفاقاً ایک چھوٹی سی خالی کوٹھری میں وانگ لنگ کے ہاتھ آ پھنسا۔ لوگ کئی مرتبہ اُدھر سے آ جا چکے تھے لیکن اس موٹے کی جائے پناہ کو

نہ تاڑ سکے تھے اور وہ یہ سوچ کر کہ میری جان بچ گئی اپنے ڈربے سے نکل آیا تھا۔ دوسروں سے علیحدہ ہونے کے بعد اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے وانگ لنگ اس کی طرف نکل آیا تھا۔

یہ ادھیڑ عمر کا لحیم و شحیم مرد پلنگ پر کسی حسینہ کو آغوش میں لیے ننگ دھڑنگ پڑا ہوا تھا کیونکہ ساٹن کے ایک لبادے کے اندر سے اس کا جسم صاف نظر آتا تھا۔ سینے اور شکم پر گوشت کی کئی کئی پرتیں چنی ہوئی تھیں اور پھولے ہوئے گالوں کے اندر دونوں چھوٹی چھوٹی آنکھیں سُور کی آنکھوں کی طرح دھنسی ہوئی تھیں۔ وانگ لنگ کو دیکھتے ہی اس کی گھگھی بندھ گئی گویا کسی نے الٹی چھری سے حلال کر دیا ہو۔ نہتا ہونے کے باوجود وانگ لنگ بشکل اپنی ہنسی ضبط کر سکا۔ وہ موٹا گھٹنوں کے بل گر پڑا اور فرش پر سر پٹک کر گڑگڑانے لگا:-

"للّٰہ میری جان بخش دو، مجھے نہ مارو۔ میں تمھیں رُپے دوں گا۔ بہت سے رُپے۔"

رُپے کے نام نے وانگ لنگ کو موقعے کی اہمیت سمجھا دی۔ سے رُپے کی اشد ضرورت تھی۔ گویا کسی آوازِ غیب نے پکار کر کہا:

"روپیہ ــــــ زمین مل گئی ــــــ بچّی بچ گئی!"

اَچانک ایسی درشت آواز میں جس کے وجود سے وہ ہنوز ناآشنا تھا، اس نے ڈپٹ کر کہا۔

"لاؤ جلدی سے رُپے نکالو!"

موٹا آدمی روتے کانپتے کھڑا ہوا اور لبادے کی جیب سے مُٹھی بھر

اشرفیاں نکال کر وانگ لنگ کو دیں جس نے انھیں اپنی جیبوں کے حوالے کیا۔ اور اس نے پھر اسی نامعلوم آواز میں کہا:

"اور دو اس سے کیا ہوتا ہے!"

اشرفیوں کی دوسری مٹھی بڑھا کر وہ شخص گڑگڑانے لگا:

"اب میرے پاس ایک کانی کوڑی بھی نہیں۔" یہ کہہ کر وہ رونے لگا اور آنسو تیل کی طرح اس کی ٹھوڑی پر بہنے لگے۔

اس روتے کانپتے انسان سے وانگ لنگ کو ایسی گھن آئی کہ ساری عمر کسی چیز سے نہ آئی ہوگی اور اس نے انتہائی حقارت سے کہا:

"بھاگتا ہے یا نہیں، ورنہ تجھے کھٹمل یا پسو کی طرح مسل ڈالوں گا۔"

بذات خود وہ ایسا نرم دل تھا کہ کسی حیوان کی جان لینے کا بھی روادار نہ تھا لیکن اس کی ڈپٹ سن کر وہ موٹا کتے کی طرح دُم دبا کر بھاگ نکلا۔

وانگ لنگ ان اشرفیوں کے ساتھ تنہا رہ گیا اور بغیر گنے اس نے سینے میں چھپالیں اور 'باب الامن' سے ٹھنڈے ٹھنڈے نکل کر اپنی جھونپڑی کے پاس آپہنچا۔ اشرفیوں کو چھو چھو کر وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا:

"ہم گھر لوٹ جائیں گے ——— کل ہی چلے جائیں گے۔"



باب ۱۵

چند ہی روز گزرے ہوں گے لیکن وانگ لنگ کو محسوس ہونے لگا کہ وہ کبھی اپنی زمین سے نہ بچھڑا تھا اور اس کے دل سے پوچھیے تو یہ صحیح بھی تھا۔ اس نے تین اشرفیوں کے عمدہ دکنی بیج خریدے —— گیہوں، چاول اور کپاس کے بیج۔ دولت کے نشے میں وہ ایسے بیج لایا جو پہلے کبھی نہ بوئے تھے۔ باولی کے لیے کنول اور سیلہ اور بڑی بڑی لال مولی اور چھوٹی چھوٹی لال سیم۔

پانچ اشرفیوں سے اس نے گھر پہنچنے سے پہلے کسی کسان کا بیل کھڑے گھاٹ مول لیا۔ اسے ہل چلاتے دیکھ کر یہ سب ٹھہر گئے گو کہ انھیں کھیت اور گھر کو فوراً دیکھنے کا شوق تھا۔ اور اس بیل کو سراہنے لگے۔ اس کی مضبوط گردن اور کاندھوں نے وانگ لنگ کا دل موہ لیا لیکن کہنے کو اس نے یہ کہا:

"بیل اچھا تو نہیں ہے! خیر، میرے پاس کوئی جانور نہیں ہے اور مجھے اس کی فوری ضرورت ہے۔ اس صورت میں تم اس کے کیا دام لوگے؟"

کسان نے جواب دیا:

"میں اپنی بیوی کو بیچ دوں گا مگر اسے الگ نہ کروں گا کیونکہ اس کی عمر فقط تین سال ہے اور ابھی نرا یا ٹھا ہے۔" یہ کہ کر وہ ہل چلانے لگا اور وانگ لنگ کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

وانگ لنگ نے بھی تہیّہ کرلیا کہ دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے لیکن لوں گا اسی بیل کو۔ اس نے اپنے باپ اور بیوی سے پوچھا:

"یہ بیل کیسا ہے؟"

بڑے میاں نے گھور کر جواب دیا: "اس کا آختہ بھلی بھانت ہوا ہے۔"

اولان نے کہا: "عمر ایک سال کم بتلاتا ہے۔"

مگر بیل کی کالی آنکھوں، پیلی رنگت اور ہل چلائی کے انداز نے وانگ لنگ کو گرویدہ کرلیا۔ یہ ہو تو کھیتوں کی جُتائی بھی ہو سکے اور تیل گھانی بھی چل سکے۔ اس لیے اس نے کسان کی منّت کی۔

"اگر یہ بیل مجھے دے دو تو میں اس کی قیمت سے زیادہ دینے کو تیار ہوں۔"

بڑی تو تو میں میں کے بعد کسان نے ڈیوڑھی قیمت پر بیل کھول دیا اس بیل کو دیکھ کر وانگ لنگ کو اشرفیوں کے جانے کا غم نہ رہا۔ دام دے کر اور بیل کے نتھنے میں رسّی ڈال کر ملکیت کے احساس سے شاداں و فرحاں وہ اپنے گھر چلا۔

گھر کے کواڑ اور چھپّر کی پرال چوری ہو گئی تھی۔ اور نہ ہل بکھّر کا کہیں پتا تھا۔ شہتیروں اور ننگی دیواروں کے سوا کچھ نہ رہا تھا اور دیواریں بھی برف و باراں کی وجہ سے چٹخ گئی تھیں۔ ابتدائی صدمے کے بعد وانگ لنگ کو اس کا بھی غم نہ رہا۔ شہر جا کر وہ نیا ہل نئے بیلچے اور سر پر ڈھکنے کے لیے نئی ٹٹیاں لے آیا تاکہ فصل تک پوال نہ ملنے کی صورت میں انھیں چھت پر

ڈال دے۔

شام کو جو کھیت پر کھڑے ہو کر وہ کیا دیکھتا ہی کہ اس کی تروتازہ زمین افزائش کے لیے تیار سامنے پڑی ہی۔ بہار کی جوانی کا زمانہ تھا اور باولی میں مینڈک ایک سُر اور ایک تال میں ٹرٹرا رہے تھے۔ ہلکی ہلکی پُروا ہَوا بانس کے پیڑوں میں گدگدی کر رہی تھی اور شفق کے اُجالے میں کھیت کی مینڈ کے پیڑ نظر آ رہے تھے۔ آڑو کے پیڑ گلابی کوپلوں کا بسنتی لباس اوڑھے ہوئے تھے اور بیدِ مجنوں کی ٹہنیوں میں نئی پتّیاں آ رہی تھیں۔ منتظر و مضطرب زمین سے جھینے بینے کھاسے کی چادر چاندنی کی مانند اٹھی اور پیڑوں پر لٹک گئی تھی

دیر تک وانگ لنگ سوچتا رہا کہ کاش کوئی آدمی مجھے نہ ستائے اور میں زمین کو دیکھا کروں۔ وہ گانوں میں کسی سے ملنے نہ گیا اور جب وہ پڑوسی جو مرورِ ایّام کے بعد بچ رہے تھے آئے تو اس نے ان سے سیدھے منہ بات بھی نہ کی۔

تم میں سے کس نے میرے کواڑ چرائے، کون میرا ہل لے گیا اور کس نے میری چھت جلائی ہی؟" اس نے بگڑ کر پوچھا۔ سب نے سادگی سے انکار کیا۔ کوئی بولا " یہ تمھارے چچا کے کرتوت ہیں "

کسی نے کہا: " یہ لڑائی اور اکال کے دن ہیں۔ ہر طرف ڈاکوؤں اور ٹھگوں کا راج ہی۔ پھر بھلا کون کسی پر الزام لگا سکتا ہی بھوک کی حالت میں کون چوری نہیں کرتا "

اتنے میں پڑوسی چنگ اپنے بِل سے برآمد ہوا اور بولا:
"جاڑوں میں ڈاکوؤں کا ایک دَل تمہارے گھر میں رہتا تھا اور اس سے تمہارے چچا کے تعلقات بُرے نہ تھے۔ لیکن اِس زمانے میں حق وناحق کی تحقیق مشکل ہی اور میں کسی پر الزام نہیں لگا سکتا۔"
یہ آدمی کیا تھا بُھس بھری کھال تھی۔ ابھی اس کی عمر ۴۵ بھی نہ ہوگی لیکن بال سفید پڑ گئے تھے اور ہڈیوں کے سوا جسم پر کچھ نہ تھا۔ وانگ لنگ کو اس کا یہ حال زار دیکھ کر بڑا ترس آیا اور بولا:
"تم نے ہم سے بھی زیادہ مصیبت جھیلی۔ بھلا یہ تو کہو کہ اس دوران میں کھانے کو کیا ملا؟"
پڑوسی نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا:
"یہ پوچھو کہ کیا نہیں ملا؟ شہر میں گداگری کرتے ہوئے کتّوں کے ساتھ سڑی گلی چیزیں کھائیں، مردہ کُتّے تک کھانے پڑے۔ مرنے سے پہلے میری بیوی نے کسی ایسے گوشت کا شوربہ بنایا جن کے تصوّر سے میری روح لرزتی ہی۔ جب وہ نقاہت کی وجہ سے مرگئی تو میں نے اپنی بیٹی ایک سپاہی کو دے دی کیونکہ اسے اپنی آنکھوں کے آگے دم توڑتے دیکھنے کی جرات مجھ میں نہ تھی۔"
کچھ دیر چپ رہ کر وہ بولا: "کاش میرے پاس تھوڑے سے بیج ہوتے اور میں کھیتی کرسکتا۔"
یہ سن کر وانگ لنگ اسے اندر کھینچ لے گیا اور اس کے دامن کو ہر قسم کے بیج سے بھر دیا اور کہا:
"کل میں تمہارا کھیت اپنے بیل سے جُتوا دوں گا۔"

چنگ کا دل بھر آیا اور وہ رونے لگا۔ وانگ لنگ نے اسے میٹھی سی ڈانٹ پلائی: "کیا تم نے سمجھا تھا کہ میں ان مٹّھی بھر سیموں کو بھول گیا؟" لیکن چنگ بے کچھ کہے سنے زار و قطار روتا اپنے گھر چلا گیا۔

یہ معلوم کر کے وانگ لنگ کو دلی مسرّت ہوئی کہ اس کا چچا گانْو میں نہیں ہے اور کسی کو اس کی خبر نہیں۔ کوئی کہتا تھا کہ وہ شہر میں ہے اور کوئی کہتا کہ وہ بال بچّوں سمیت بدیس میں ہے۔ بہرکیف اس کا گھر سونا پڑا تھا۔ البتہ وانگ لنگ یہ جان کر سخت برہم ہوا کہ چچا نے اپنی سب بیٹیاں بیچ دیں جن کی شکل صورت غنیمت تھی۔ ان کے خاصے دام ملے۔ لیکن سب سے چھوٹی چیچک رو بھی چند پیسوں کے لیے کسی سپاہی کے حوالے کر دی۔

اب وانگ لنگ جی جان سے کاشت کاری میں لگ گیا۔ اور اسے کھانا یا سونا بھی تضیع اوقات معلوم ہونے لگا۔ روٹی اور لہسن کی ڈلی وہ کھیت لے جاتا اور وہیں کھڑے کھڑے کھاتے ہوئے منصوبے گانٹھنے لگتا تھا۔ "یہاں میں چاول کی کیاریاں لگاؤں گا اور ادھر مٹر بوؤں گا۔" اور اگر وہ دن کو تھک جاتا تو وہیں پڑ کر سو رہتا اور اس کا جسم زمین کی قربت سے فرحت حاصل کرتا تھا۔

گھر میں اولان بھی مصروف رہتی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے اس نے چھت پر ٹٹّیاں لگائیں، مٹّی کا گارا بنا کر دیواروں کو ٹھیک کیا، تنور دوبارہ بنایا اور فرش کو درست کیا جس میں برسات کے

پانی نے سوراخ ڈال دیے تھے۔
ایک روز میاں بیوی دونوں شہر گئے اور پلنگوں کے علاوہ ایک میز، چھ بنچیں اور ایک بڑی سی دیگ خریدی۔ انھوں نے چائے کی ایک لال کیتلی بھی لی جس پر بڑا سا کالا پھول بنا ہوا تھا اور اسی رنگت کی چھ پیالیاں لیں۔ آخر میں انھوں نے دولت کے دیوتا کی تصویر بچلے کمرے میں لٹکانے کے لیے لی اور ایک اگردان اور دو لال موم بتیاں بھی لیں تاکہ انھیں دیوتا کے آگے روشن کریں۔
ساتھ ہی ساتھ وانگ لنگ کو دھرتی ماتا کے مندر کے دونوں ننھّے دیوتاؤں کا خیال آیا۔ گھر لوٹتے وقت اندر جھانک کر وہ دیکھتا ہے کہ ان کی حالت قابلِ رحم ہے۔ بارش کے پانی نے نقش و نگار دھو ڈالے ہیں اور پھٹے ہوئے کاغذی پیرہن کے اندر سے ان کے خاکی جسم کی برہنگی جھلک آئی ہے۔ اس ہولناک زمانے میں کسی نے ان کی بات بھی نہ پوچھی۔ اور وانگ لنگ نے نیم سختی نیم اطمینان سے ان کے حالِ زار کو دیکھ کر ایسے لہجے میں گویا کسی قابلِ سزا لڑکے سے باتیں کر رہا ہو، کہا:
"انسانوں پر آفت ڈھانے والے خداؤں کی یہی سزا ہے۔"
تاہم جب گھر از سرِ نو بس گیا۔ جتنے شمع دان جھلملائے اور ان کی شمعیں جگمگائیں۔ جب میز پر پیالیاں اور چائے دان اور کمروں میں پلنگ اور بستر بچھ گئے، جب اس کی خواب گاہ کا سوراخ کاغذ سے بند ہو گیا اور ایک نیا دروازہ اپنی چول پر چرچرانے لگا، تو وانگ لنگ اپنی خوش حالی پر آپ خائف ہوا۔ اولان کو پھر

حمل ٹھہرا۔ چوکھٹ پر بچے کُتّے کے پلّوں کی طرح لوٹنے لگے اور دیوار کے سائے میں بڑے میاں پڑے اونگھنے اور مسکرانے لگے۔
اس کے کھیتوں میں دھان کی بالیاں بِنّے کی سی ہری اور اس سے زیادہ من بھاون تھیں۔ ادھر سیم کی پھلیاں زمین سے سانپ کے پھن کی مانند اجاگر ہوئیں۔ اگر کفایت شعاری کی تو یہ پسماندہ دھان کٹائی تک گھر بھر کے لیے کافی ہوگا۔ نیلے آسمان اور سفید بادلوں کو دیکھ کر، اور زمین کو کافی دھوپ پانی مل چکنے پر اسے کہتے ہی بنی:
"ان دونوں بتوں کے آگے مجھے اگربتّی سلگانی چاہیے۔
بہرحال دھرتی پر انھیں کا بس چلتا ہے۔"



باب ۱۶

ایک رات جب وانگ لنگ اپنی بیوی کے ساتھ لیٹا ہوا تھا، تو اس کے سینے میں کوئی سخت سی شئ محسوس ہوئی اور اس نے پوچھا:

"تم نے اپنے جسم میں یہ کیا چھپا رکھا ہے؟"

ہاتھ سے ٹٹولا تو یہ ایک چھوٹا سا بٹوا تھا جو سخت ہونے کے باوجود ہاتھ میں پھسلتا تھا۔ پہلے تو اولان نے اسے جھڑک دیا لیکن جب وہ چھینا جھپٹی پر اتر آیا تو وہ بولی:

"لو بھئی، دیکھ ہی لو" بٹوا جس ڈوری سے گلے میں بندھا ہوا تھا اسے توڑ کر اس کے حوالے کر دیا۔

بٹوا کیا یہ ایک چیتھڑا تھا جسے وانگ لنگ نے پھاڑ ڈالا۔ اچانک اس کے ہاتھ جواہرات سے نہال ہو گئے۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ کسی نے خواب میں بھی ایک ساتھ اتنے مختلف اقسام کے جواہرات نہ دیکھے ہوں گے۔ کوئی تو تربوز کی قاش کی طرح سُرخ تھا۔ کوئی گیہوں کی بالی کا سا سنہرا۔ کوئی بہار کی کونپلوں کی طرح سبز، کوئی جھرنے کے پانی کا سا نرمل۔ وانگ لنگ ان کے نام نہ جانتا تھا کیونکہ اس نے نہ کبھی ایسے رتن دیکھے تھے نہ ان کے نام سنے تھے۔ لیکن جب اس نے انھیں ہاتھ میں لیا اور کمرے کی تاریکی میں ان کی جوت پھیلی تو اسے ان کی قیمت کا کچھ اندازہ ہوا۔ وہ کوئی حرکت نہ کر سکا، زبان تک نہ کھول سکا۔ ان کی جوت اور روپ میں

کھویا سا گیا اور میاں بیوی اس دولت کو دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔
بالآخر اس نے سانس روک کر اس سے پوچھا:

"کہاں ـــــ کہاں ـــــ!"

اولان نے آہستہ سے کان میں کہا:

"اسی سیٹھ کے گھر۔ یہ ضرور اس کی عزیز جان کا خزانہ ہوگا۔ دیوار کی ایک اینٹ کھسک گئی تھی۔ اس سے ہوکر میں چپکے سے اندر چلی آئی تاکہ کوئی دیکھ کر حصّہ نہ مانگ بیٹھے۔ اینٹیں ہٹاتے ہی مجھے جواہرات کی جوت نظر آئی اور میں نے جھٹ انھیں چھپالیا۔"
وانگ لنگ نے اپنی بیوی کے کمال پر ریجھ کر پوچھا: "تمھیں معلوم کیونکر ہوا؟" اس وقت اولان کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ نظر آئی جو کبھی اس کی آنکھوں میں نہ آتی تھی اور جواب دیا:

"تم سمجھتے ہو کہ میں کبھی کسی مالدار کے گھر نہیں رہی؟ امیروں کا دل ہمیشہ دھک دھک کرتا رہتا ہے۔ ایک قحط کے زمانے میں ڈاکو بڑی حویلی میں گھس آئے۔ تو میں نے دیکھا کہ لونڈی باندیاں حتّٰی کہ بڑی بیگم بھی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگیں اور سب نے اپنے اپنے گہنے ایک خاص جگہ چھپا دیئے۔ اسی وجہ سے مجھے کھسکی ہوئی اینٹ کا بھید معلوم تھا۔"

وہ پھر خاموش ہوگئے اور ان پتھروں کی آب و تاب کو گم سم دیکھنے لگے۔ دیر کے بعد وانگ لنگ کے اوسان بجا ہوئے اور کہنے لگا:
یہ خزانہ ہم اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتے۔ اسے بیچ دینا ہوگا اور فی الحال کسی محفوظ جگہ میں گاڑ دینا چاہیے ـــــ زمین میں، کیونکہ

زمین کے سوا کوئی شئ محفوظ نہیں۔ اگر کسی کو کانوں کان بھی خبر ہو گئی تو ہماری جان نہ بچے گی اور کل ہی کوئی ڈاکو ان جواہروں کو لے کر چل دے گا۔ ہم انھیں فوراً زمین میں دفن کر دیں ورنہ مجھے رات بھر نیند نہ آئے گی۔"

اسی جھنجھٹ میں جواہرات کو ڈوری سے باندھ کر اپنے کوٹ میں چھپاتے وقت اچانک اس کی نگاہ اولان کے چہرے پر پڑی۔ وہ پلنگ کی پائینتی پالتی مارے بیٹھی تھی اور اس کا چہرہ جو ہمیشہ بے حس رہتا تھا اس وقت کھلے ہوئے دہن اور جھکی ہوئی گردن کے اشارے سے ایک خفتہ خواہش بیان کر رہا تھا۔

"کیوں کیا بات ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

اولان نے زیرِ لب کہا: "کیا تم ان سب کو بیچ دوگے؟"

وانگ لنگ دنگ رہ گیا: "کیوں نہیں؟۔ اس گھاس پھوس کی جھوپڑی میں ہیرے موتی کا کیا مصرف؟"

اولان نے ایسی بے چارگی اور مایوسی سے کہا کہ "کاش ان میں سے دو میں رکھ سکتی" کہ وانگ لنگ کا دل پسیج گیا گویا کوئی بچہ مٹھائی یا کھلونے کے لیے مچل رہا ہو۔

حیرت کے مارے وہ چلا اٹھا: "بھئی خوب کہی!..."

وانگ لنگ کے دیدے پھٹے کے پھٹے رہ گئے: "موتی!"

اس نے کہا: "میں انھیں پہنوں گی نہیں ــــ بس اپنے پاس رکھ چھوڑوں گی۔" آنکھیں جھکا کر وہ بستر سے نکلے ہوئے ایک پھوس کے تنکے کو یوں اینٹھنے لگی گویا اسے کسی جواب کی توقع نہیں۔

اب وانگ لنگ کی نگاہ اس باوفا اور سادہ مزاج عورت کے دل کی تہہ تک پہنچی (گو وہ اسے سمجھ نہ سکا) جو بغیر کسی عوض کے، ہمیشہ باندی گری کرتی آئی تھی اور جس نے بڑی حویلی میں دوسروں کے بدن پر جواہرات دیکھے تھے لیکن کبھی انھیں چھو بھی نہ سکی ہوگی۔

گویا آپ اپنے کو سناتے ہوئے اولان نے کہا: "کبھی کبھی میں نے انھیں ہاتھوں میں لیا تھا!"

معلوم نہیں کس جذبے سے متاثر ہو کر وانگ لنگ نے جیب سے بٹوا نکالا اور چپ چاپ بیوی کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ ان نو پاروں میں اس کی انگلیاں بڑی احتیاط سے ڈھونڈتی رہیں تاوقتیکہ اسے دو صاف و شفاف موتی نہ مل گئے۔ انھیں لے کر اس نے بٹوا باندھا اور اپنے میاں کے سپرد کر دیا۔ اپنے لبادے کا ایک ٹکڑا پھاڑ کر اس نے اس میں موتی لپیٹے اور اپنے سینے میں انھیں چھپا لیا تو اسے چین آیا۔

مگر وانگ لنگ محوِ حیرت ہو کر اُسے تاکتا رہا اور اس کی سمجھ میں یہ رمز نہ آئی چنانچہ اب وہ اکثر اسے دیکھتے ہی ٹھٹک جاتا اور دل میں سوچنے لگتا:

"غالباً اس کی چولی کے اندر اب تک وہ موتی چھپے ہوئے ہیں!"

لیکن اس نے کبھی اولان کو انھیں نکالتے یا نہارتے نہ دیکھا اور نہ ان میں پھر کبھی اس موضوع پر گفتگو ہی ہوئی۔

بقیہ جواہرات کے متعلق وہ زمین و آسمان کے قلابے ملاتا رہا اور آخرکار یہ فیصلہ کیا کہ بڑی حویلی میں چل کر دیکھیں کہ کوئی قطع

فروختنی رہ گیا ہی یا نہیں ۔"

جب وہ حویلی کے پھاٹک پر پہنچا تو وہ دربان نظر نہ آیا جو لمبے سے کے بالوں کو اینٹھتا ہوا آنے جانے والوں پر رعب گانٹھا کرتا تھا پھاٹک بند تھا اور وانگ لنگ نے لاکھ آوازیں دیں لیکن کسی نے خبر نہ لی۔ راہ چلتوں نے پکار کر کہا:

"اماں، ہزار سر پیٹو لیکن یہ دروازہ نہیں کھلنے کا۔ ہاں، بڑے نواب کی آنکھ کھل گئی یا کوئی بچی کھچی لونڈی رہ گئی ہو تو دوسری بات ہی۔"

بہت دیر بعد پس آستانہ پانو کی دھیمی چاپ سنائی دی، کوئی سہما لڑکھڑاتا آرہا تھا۔ پھر لوہے کی سانکل کھلی، پٹ چرمرائے اور ایک بھرائی ہوئی آواز نے پوچھا:

"کون ہی؟"

حالانکہ وانگ لنگ کے تعجب کی حد نہ تھی، تاہم اس نے زور سے کہا:

"میں ہوں وانگ لنگ۔"

اُسی آواز نے چڑچڑے پن سے کہا:

"وانگ لنگ کس جانور کا نام ہی؟"

وانگ لنگ ان تیوروں سے سمجھ گیا کہ یہ بڑے نواب ہیں کیونکہ اندازِ گفتگو یہی ظاہر کر رہا تھا۔ لہذا اس نے پہلے سے بھی زیادہ عاجزی سے کہا:

"سرکار میں آپ کو زحمت دینے نہیں آیا۔ مجھے آپ کے منیم سے معاملہ کی ذرا سی بات کرنی ہی۔"

بڑے نواب نے داڑھی سے جس میں سے صرف اُن کے ہونٹ نظر آتے تھے ـــــ کہا:

"وہ حرام زادہ تو مدت ہوئی منہ کالا کر گیا۔ کیا یہاں بیٹھا ہے؟"

وانگ لنگ کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کرے۔ بڑے نواب سے کھیت خریدنے کا ذکر کس طرح کیا جائے، اس کے لیے کسی دلال کی وساطت ضروری تھی۔ اِدھر اس کے سینے پر وہ جواہرات انگاروں کی طرح لوٹ رہے تھے اور زمین کے حصول سے زیادہ اسے انھیں چلتا کرنے کا فکر تھا۔ زمین دُگنی بھی ہو جائے تو کیا مضائقہ، بیج پڑتے ہی اس میں فصل آنے لگتی ہے۔ بہر صورت وہ ہوانگ گھرانے کی اراضی پر قابض ہونا چاہتا تھا۔

بڑے حیص وبیص کے بعد اس نے کہا: "یہ روپوں کا معاملہ ہے۔" یہ سنتے ہی بڑے نواب نے دروازہ بند کر دیا اور آواز اونچی کر کے پکار اٹھا: "یہاں نہ پیوں کا نام نہ لینا۔ وہ موچکا نیم ـــــ خدا اس کی سات پُشتوں کو جہنّم کی آگ میں جلائے ـــــ سب لے دے کر چلتا ہوا۔ اب ہم کوئی قرض ادا نہیں کر سکتے۔"

وانگ لنگ نے جلدی سے کہا: "میں قرض کے تقاضے کے لیے نہیں بلکہ رُپے ادا کرنے آیا ہوں۔"

اب ایک نرالے قسم کی کلکاری کی آواز آئی اور یک بیک دروازے کے اندر سے کسی عورت کا مکھڑا برآمد ہوا۔

"بہت عرصے سے ایسی خوش خبری نہ سنی تھی۔" اس نے جھک کر کہا۔ وانگ لنگ نے دیکھا کہ ایک حسین وجمیل مگر چالاک وعیار عورت

اس سے ہم کلام ہی۔ "اندر آؤ" اس نے پھرتی سے کہا اور دروازہ اتنا کھول دیا کہ وہ اندر داخل ہو سکے۔ اور ابھی وہ ہکّا بکّا دالان میں گیا ہی تھا کہ عورت نے دروازہ بند کر دیا۔

بڑے نواب وہاں آنکھیں مچمچاتے اور کھانستے کھکارتے، بھوری ساٹن کے ایک گندے لبادے میں ملبوس کھڑے تھے اور لبادے میں توشک کی پوستین کے روئیں چپکے ہوئے تھے۔ کبھی یہ لبادہ بڑے ٹھاٹ کا ہوگا کیونکہ ساٹن چکنی اور بھاری تھی۔ لیکن اس پر دھبّے پڑ گئے تھے اور اُس میں اتنی شکنیں پڑی ہوئی تھیں جس سے گمان ہوتا تھا کہ نواب اسے پہن کر سوتے ہیں۔ وانگ لنگ نے کچھ اچنبھے اور کچھ جھجک سے ان حضرت کی طرف دیکھا، کیونکہ وہ ساری زندگی حویلی والوں کی ہیبت میں گزار چکا تھا یقین نہ آتا تھا کہ جن بڑے نواب کا اتنا چرچا سنا کرتے تھے وہ یہی بڈّھا پھونس ہی، جو اس کے باپ سے بھی کم رعب دار ہی کیونکہ بڑے میاں کم از کم صاف ستھرے اور ہنس مکھ تو تھے۔ مگر بڑے نواب کی ساری چربی پگھل گئی تھی۔ کھال لٹک آئی تھی، نہ جسم صاف تھا نہ ڈاڑھی۔ اور پیلے ہاتھ حرکت کرتے ہی خود بخود کانپنے لگتے تھے۔

لیکن عورت چاق چوبند تھی۔ چہرے پر تیزی و تندی کے آثار کے باوجود نمک تھا۔ اور اس کی کمانی دار ناک، چمک دار سیاہ آنکھوں، ہڈّیوں سے چپکی ہوئی پیلی کھال اور سرخ و سخت لب و رخسار کے مجموعی حسن پر کسی شاہین کا گمان ہوتا تھا۔ اس کے سیاہ بالوں میں ایسی چمک تھی کہ سیاہ آئینے کا دھوکہ ہوتا تھا۔ لیکن اس کی گفتگو یہ

بھید کھول دیتی تھی کہ وہ کوئی نواب زادی نہیں بلکہ ایک چرب زبان باندی ہے۔
ان دونوں کے سوا حویلی میں، جہاں کبھی خادموں کی ریل پیل رہا کرتی
تھی کوئی آدمی نظر آیا۔

عورت نے جلدی سے کہا: "نکالو روپیہ" لیکن وانگ لنگ ہچر مچر
کرتا رہا۔ بڑے نواب کے آگے زبان کھولنے کی جرات اسے نہ ہوئی۔
عورت فوراً یہ بات بھانپ گئی اور سچ تو یہ ہے کہ منہ سے بات نکلنے
کے پہلے وہ تاڑ جاتی تھی۔ اس لیئے اس نے بڈّھے کو ڈانٹ کر کہا: "تم منہ کالا
بھی کرو!"

بے کچھ کہے سنے بڑے نواب کھلستے اور چپل چٹخاتے دم دبا کر بھاگے۔
وانگ لنگ کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس عورت سے کیا کہے یا کیا کرے۔ ہر طرف
ایسا سنّاٹا تھا کہ اسے وحشت ہونے لگی۔ اس نے دوسرے آنگن میں
جھانک کر دیکھا تو وہاں بھی کوئی چڑیا کا بچہ نہ تھا اور ہر طرف کوڑا کرکٹ
سوکھی پتّیاں اور مرجھائے ہوئے پھول بکھرے ہوئے تھے جس سے
ظاہر ہوتا تھا کہ مدّت سے یہاں کسی نے جھاڑو بھی نہیں دی ہے۔

عورت نے کڑک کر کہا: "ابے اُلّو، بولتا کیوں نہیں؟" اور
اس کی یہ ڈانٹ ایسی غیر متوقع تھی کہ وانگ لنگ اچھل پڑا۔ "تم کیا معاملہ
کرنے آئے ہو؟ اگر گرہ میں دام ہیں تو مجھے دکھلاؤ!"

وانگ لنگ نے سنبھل کر کہا: "میں نے یہ کب کہا کہ میرے پاس
رُپے ہیں۔ میں تو صرف معاملہ کرنے آیا ہوں!"

عورت نے جواب دیا: "معاملہ رُپے بغیر نہیں ہو سکتا۔ یا تو روپیہ
دیا جائے یا لیا جائے۔ مگر اس گھر میں دینے کے لیے روپیہ نہیں!"

اب وانگ لنگ نے پینترا بدل کر نرمی سے کہا: "معاملہ کسی عورت سے کیسے پٹ سکتا ہے؟" ہنوز وہ حالات نہ سمجھ سکا تھا اور اپنے گرد و پیش کو مشتبہ نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

عورت بگڑ کر بولی: "کیوں اس میں ہرج کیا ہے۔ اور کیا تمھارے کان بہرے ہو گئے ہیں کہ یہ نہیں سنا کہ یہاں کوئی دوسرا مرد نہیں۔"

وانگ لنگ کو اعتبار نہ آیا اور اس نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔

عورت چیخ پڑی: "بڑے نواب اور میرے سوا اس حویلی میں کوئی انسان نہیں۔"

وانگ لنگ پر گویا بجلی سی گری اور وہ ان الفاظ کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ "باقی سب لوگ کہاں ہیں؟"

عورت نے سارا ماجرا سنایا: "بڑی بیگم کو مرے مدت ہوئی۔ کیا تم نے شہر میں نہیں سنا کہ ڈاکو حویلی میں گھس آئے اور جتنا مال اور جتنی باندیاں لے جا سکے اٹھا لے گئے۔ بڑے نواب کو انھوں نے چھت سے باندھ کر درّے لگائے اور بیگم کے منہ میں رومال ٹھونس کر انھیں کرسی سے باندھ دیا اور سب تو بھاگ گئے لیکن میں وہیں ڈٹی رہی۔ میں ایک باؤلی کے اندر ڈبکی لگا کر بیٹھ رہی۔ جب باہر نکلی تو ڈاکو جا چکے تھے اور بیگم کرسی پر دہشت کے مارے مری پڑی تھیں۔ ان کے جسم میں افیون نے گھن لگا دیا تھا۔ اس وجہ سے وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکیں۔"

وانگ لنگ نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا: "نوکر چاکر اور دربان؟"

عورت نے لاپروائی سے کہا: "ارے یہ! یہ تو بہت پہلے چلے گئے تھے۔ جو چل سکتے تھے وہ کبھی کے جا چکے تھے کیونکہ عین سرما میں نہ دام رہے تھے

نہ روٹیاں۔" اب وہ دھیمی آواز میں بولی: "یہ حقیقت ہے کہ ڈاکوؤں میں بہتیرے گھر کے نوکر تھے۔ میں نے اس نمک حرام دربان کو ان کی رہبری کرتے دیکھا۔ گو کہ بڑے نواب کے آگے اس نے اپنا منہ پھیر لیا لیکن میں اس کے مسے کے بالوں کو پہچان گئی۔ اس کے علاوہ اور بھی نوکر تھے، ورنہ انھیں ان خفیہ مقامات کا حال کیسے معلوم ہو جاتا جن میں جواہرات اور خزانے چھپے ہوئے تھے؟۔ مجھے تو اس موئے نیم کا ہاتھ نظر آیا حالانکہ بدنامی کے ڈر سے وہ کھلم کھلا اس ڈاکے میں حصّہ نہ لے سکتا تھا۔ اور پھر وہ اس گھرانے سے دور کا تعلّق بھی رکھتا تھا۔"

عورت خاموش ہو گئی اور در و دالان میں موت کا سا سناٹا چھا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ بولی:

"یہ کوئی عجیب بات نہ تھی۔ بڑے نواب بلکہ ان کے باپ کے زمانے میں اس خاندان کا انحطاط شروع ہو چکا تھا۔ اسی زمانے سے ان لوگوں کا یہ شیوہ ہے کہ جائداد کی دیکھ ریکھ خود نہیں کرتے اور روپیہ پانی کی طرح بہاتے ہیں۔ اس دوران میں وہ زمین کا خون چوستے رہے اور وہ رفتہ رفتہ ان کے ہاتھوں سے نکلتی گئی۔"

وانگ لنگ کے لیے ان سب باتوں پر یقین کرنا اب بھی مشکل تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر اس نے پوچھا: "اور صاحب زادوں کا کیا حشر ہوا؟"

عورت نے لاپروائی سے کہا: "جہاں قسمت لے گئی چلے گئے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ اس افتاد سے پہلے دونوں لڑکیوں کا بیاہ ہو چکا تھا۔ جب بڑے صاحب زادے کو اس مصیبت کی خبر ملی تو انھوں نے اپنے باپ کو لوا لے جانے کے لیے سواری بھیجی لیکن میں نے انھیں یہ کہہ کر روک

لیا کہ حویلی میں کسی نہ کسی کا رہنا ضروری ہے کیونکہ ایک عورت ذات اکیلی کیسے رہ سکتی ہے۔"

اپنے سُرخ ہونٹوں کو پاک دامنوں کی طرح کاٹ کر اور اپنی شوخ آنکھوں کو جھکا کر وہ دم بھر چپ رہی اور بولی: "اپنے مالک کی میں ایک ہی وفادار باندی ہوں اور میں نے اب تک کسی دوسرے گھر کا منہ نہیں دیکھا۔"

غور سے اسے دیکھ کر وانگ لنگ نے منہ پھیر لیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس بوڑھے کی لاش سے یہ جونک چپکی ہوئی ہے اور اس کی بچی کھچی طاقت کو سلب کرنے کے فکر میں ہے۔ اس لیے اس نے حقارت سے کہا:

"مگر میں تم جیسی باندی سے کیا معاملہ کروں؟"

عورت نے گلا پھاڑ کر کہا: "میں جو کہوں گی بڈّھا وہی کرے گا۔"

یہ جواب سن کر وانگ لنگ کی نگاہ کھیتوں پر گئی اور اس نے سوچا کہ میں نے انھیں نہ خریدا تو اس عورت کے ذریعے دوسرے انھیں ہتیا لیں گے۔"

بادلِ ناخواستہ اس نے پوچھا: "اب کتنی زمین بچ رہی ہے؟"

عورت فوراً اس کا مقصد سمجھ گئی اور بولی: "اگر تم زمین خریدنے آئے ہو تو اس کی کچھ کمی نہیں۔ پچھّم کی جانب سو ایکڑ اور دکن کی سمت دو سو ایکڑ بیچنے کو ہے۔ یہ سب زمین ایک جگہ نہیں، تاہم ہر کھیت بڑا ہے۔ تم چاہو تو سب خرید لو۔"

جواب اتنا بے ساختہ تھا کہ وانگ لنگ کو یقین ہو گیا کہ اس عورت کو بڈّھے کی آخری لنگوٹی تک کا پتا ہے۔ اس کے باوجود اسے

اعتبار نہ آتا تھا اور اس سے معاملہ کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے اعتراض کیا:۔

"یہ کیسے ممکن ہے کہ اپنے بیٹوں کی رضامندی کے بغیر بڑے میاں خاندان کی ساری جائداد ٹکے لگا دیں گے ۔"

عورت نے جھٹ سے یہ بات بنائی: "لڑکوں نے کہ رکھا ہے کہ موقع ملتے ہی ان زمینوں کو ٹھکانے لگائیں۔ اس علاقے میں کوئی لڑکا نہیں رہنا چاہتا اور پھر ہر طرف چور ڈاکو منڈلا رہے ہیں۔ اس لیے انھوں نے کہ دیا ہے کہ یہاں نہ رہیں گے۔ جائداد بیچ کر رُپے آپس میں بانٹ لیں گے ۔"

وانگ لنگ کو اب بھی اعتبار نہ آیا: "لیکن میں دام کسے دوں؟"

عورت نے چکنی چپڑی آواز میں کہا: "بڑے نواب کو، اور کسے؟"۔

لیکن وانگ لنگ جانتا تھا کہ بڈھے کی مٹھی اس کے ہاتھ میں کھلتی ہے۔

چنانچہ اس نے بات بڑھانا بے کار سمجھا اور یہ کہتے ہوے اُلٹے پانؤں لوٹ آیا کہ "کسی اور روز ــــ کبھی اور . . ."۔ دروازے تک وہ عورت اس کا پیچھا کرتی آئی اور برابر چلاتی رہی:۔

"کل اسی وقت ــــ یا آج ہی شام کو ــــ سب اوقات برابر ہیں۔"

جواب میں اس نے کچھ نہ کہا اور سخت پس و پیش کے عالم میں ان سب باتوں پر غور کرنے لگا۔ چائے خانے میں جاکر اس نے چائے منگوائی اور جب ایک لونڈا پیالی سامنے رکھ کر اور بدتمیزی سے انگلی بجا کر چلا گیا تو وانگ لنگ خیال کی دنیا میں کھو گیا اور وہ جتنا سوچتا اتنا ہی اسے افسوس ہوتا کہ یہ نامور اور مال دار گھرانا جو پشتہا پشت سے اس شہر کی رونق کو چار چاند لگاتا آیا تھا آج

یوں منتشر اور ذلیل و خوار ہو گیا ہے۔
اس نے دکھ سے پسیج کر کہا: "زمین چھوٹنے کے سبب سے وہ اس حال کو پہنچے"۔ اسے فوراً اپنے دونوں بیٹوں کا خیال آیا جو بہار کے نونہال پودوں کی طرح پروان چڑھ رہے تھے اور اس نے اسی وقت تہیہ کر لیا کہ اب انھیں کھیل کود میں وقت ضائع نہ کرنے دے گا بلکہ ان سے کھیت میں کام کرائے گا تاکہ ابھی سے ان کے گوشت و پوست میں مٹی کی بو باس بس جائے اور ان کے ہاتھ ہل سے آشنا ہو جائیں۔
یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ ابھی تو وہ جواہرات اس کے جسم پر انگاروں کی طرح دہک رہے تھے اور اس کی سراسیمگی کی انتہا نہ تھی۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں اس کی جوت گدڑی سے باہر نہ نکل پڑے اور کوئی چلّا کر کہہ دے کہ:
"دیکھو یہ بھک منگا راجاؤں کا خزانہ لیے جا رہا ہے"!
تب تک سکون اس پر حرام تھا جب تک یہ پتھر زمین کی صورت میں نہ تبدیل ہو جائیں۔ اور جیسے ہی دوکاندار کو فرصت کا ایک لمحہ میسر آیا، وانگ لنگ نے اسے آواز دی: "بھئی آؤ یہاں بیٹھ کر چائے پیو اور شہر کی خبر سناؤ۔ میں سال بھر بعد یہاں آیا ہوں"!
دکاندار ہمیشہ اس قسم کی گپ شپ کے لیے تیار رہتا تھا خصوصاً اس وقت جب دوسروں کے دام پر اپنی چائے پینے کو ملے۔ وہ فوراً وانگ لنگ کی میز پر بیٹھ گیا۔ اس کا منہ نیولے کا سا اور بائیں آنکھ ٹیڑھی بھینگی تھی۔ اس کے کپڑے ٹاٹ کے سے تھے اور شلوکے و پائجامے کا سرا تیل سے لتھڑا ہوا تھا۔ کیونکہ یہ حضرت چائے کے علاوہ کھانا بھی

پکاتے تھے اور اس دوران میں برابر یہ آواز لگایا کرتے تھے" مثل مشہور ہے کہ اچھے باورچی کے کپڑے صاف نہیں رہتے"۔ چنانچہ وہ اپنی غلاظت کو قطعاً برمحل اور ازبس ضروری تصور کرتا تھا۔ بیٹھتے ہی اس نے کہا:

"بھوکوں کا حال نہ پوچھو تو سب سے دلچسپ خبر ہوانگ کی حویلی کی لوٹ کی ہے"

وانگ لنگ اسی کا منتظر تھا۔ چنانچہ دُکاندار مزے لے لے کر اسے سنانے لگا کہ باقی ماندہ غلام کس طرح واویلا مچا رہے تھے اور ڈاکو انھیں زبردستی پکڑلے گئے اور خادمائیں زنا بالجبر کی شکار ہوئیں۔ کچھ تو کھدیڑ دی گئیں۔ کچھ مال غنیمت قرار پائیں۔ اس واقعے کے بعد گھر میں سنّاٹا ہوگیا۔ بڈّھے نواب اور 'کویل' نامی باندی کے سوا اب کوئی نہیں۔ یہ باندی برسوں سے ان کی منظور نظر ہے اور اس کی عیّاری کے آگے کسی کا چراغ نہیں جل سکتا"۔

وانگ لنگ کان لگا کر یہ باتیں سن رہا تھا: "تو کیا دراصل اس عورت کا طوطی بولتا ہے؟"

دوکاندار نے بتلایا: "ابھی تو اسی کا سکّہ چلتا ہے۔ جو بھی ہاتھ لگتا ہے وہ بے ڈکار لیے ہضم کر جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ صاحب زادے پردیس سے کبھی لوٹ آئیں۔ پھر اس مکّار کے وفاداری کے جھوٹے وعدے کام نہ آئیں گے اور وہ کھڑی کھڑی نکال دی جائے گی۔ لیکن اس نے اتنا بٹور لیا ہے کہ سو سال گھر بیٹھے کھا سکتی ہے"۔

اب وانگ لنگ نے سخت تردد سے پوچھا: "ان کی زمین کا کیا حشر ہوگا؟"

دُکاندار کی سمجھ میں نہ آیا: "زمین ؟"۔ اس کے نزدیک زمین کی کوئی قیمت نہ تھی۔

"اچھا تم زمین کی بات پوچھ رہے ہو"۔ اس نے لاپروائی سے کہا اور کسی نئے گاہک کی تواضع کے لیے اٹھ کر جاتے ہوئے بولا:

"سنا ہے خاندانی قبرستان کے علاوہ ان کی ساری زمین بک جائے گی"۔

اپنے مطلب کی بات سن کر وانگ لنگ بھی اٹھا اور دوبارہ حویلی کے پھاٹک پر جا کر دستک دی۔ جب عورت کھولنے کے لیے آئی تو اس نے باہر کھڑے کھڑے کہا:

"پہلے مجھے بتاؤ کہ کیا بڑے نواب راضی نامہ پر اپنی مہر لگا دیں گے ؟"

عورت نے فرطِ مسرّت سے اچھل کر جواب دیا:

"اپنی قسم وہ مہر لگا دیں گے"

وانگ لنگ نے صفائی سے پوچھا:

"تم زمین کے عوض چاندی لوگی یا سونا یا جواہرات ؟"

جواب دیتے وقت عورت کی آنکھیں چمک پڑیں:

"میں تو جواہرات لوں گی"



باب ۱۷

وانگ لنگ کے پاس اتنی زمین ہوگئی تھی کہ نہ اسے اکیلا بیل جوت سکتا تھا اور نہ فصل کو ایک آدمی کاٹ سکتا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے مکان میں ایک کوٹھڑی کا اضافہ کیا اور ایک گدھا خرید کر اپنے پڑوسی چنگ سے کہا:

"تم اپنا چھوٹا سا کھیت مجھے بیچ دو اور اپنے ویران مکان کو چھوڑ کر میرے ساتھ رہنے لگو اور کاشت میں میرا ہاتھ بٹاؤ۔"

چنگ کو یہ مشورہ بدل و جان پسند آیا۔

عین موقع پر بارش ہوئی۔ جب گیہوں کٹ چکا اور خرمن میں جمع کر دیا گیا تو دونوں کسانوں نے آب آلودہ زمین میں چاول بوئے۔ کبھی وانگ لنگ نے اتنے چاول نہ بوئے تھے کیونکہ برکھا ایسی موسلا دھار ہوئی کہ جہاں کبھی سوکھا تھا وہاں اب شادابی تھی۔ جب دھان کٹائی کا وقت آیا تو یہ دونوں بھی اس کے لیے کافی نہ تھے اور وانگ لنگ کو اپنے گاؤں کے دو مزدوروں کی مدد لینی پڑی۔

کام کرتے وقت اسے ہوانگ کے برباد خاندان کا خیال آیا۔ اور وہ ہر صبح اپنے بیٹوں کو سختی سے حکم دینے لگا کہ اس کے ساتھ کھیت چلیں۔ اپنے ننھے ہاتھوں سے وہ تھوڑا بہت کام کر سکتے تھے۔ مثلاً بیل یا خچر کی دیکھ ریکھ، وہ ان کے سپرد کی۔ حالانکہ وہ زیادہ محنت نہ کر سکتے تھے، تاہم دھوپ کی تپش اور کھیت کی لیک پر چلنے کی

تھکن ہی کیا کم تھی۔

لیکن اولان کا کھیتوں میں کام کرنا اسے ناپسند تھا۔ کیونکہ اب وہ کوئی معمولی کسان نہ تھا، بلکہ ضرورت کے وقت مزدور نوکر رکھ سکتا تھا۔ علاوہ بریں اس سال جیسی فصل کبھی نہ ہوئی ہوگی۔ اسے گھر میں ایک اور نئی کوٹھری اناج رکھنے کے لیے بنانی پڑی۔ ورنہ کہیں پانؤ رکھنے کی جگہ نہ رہی تھی۔ اس نے تین سور اور درجنوں مرغیاں خریدیں جن کی خوراک کے لیے بکھرے ہوئے دانے بس تھے۔

اولان گھر میں بیٹھی سب کے لیے نئے کپڑے اور نئے جوتے بنانے لگی۔ جب یہ ہوگیا تو اس نے پھولدار کپڑے میں نئی روئی بھر کر ہر ایک کے لیے رضائی سی۔ آج تک ان کے پاس پہننے اوڑھنے کا اتنا سامان نہ ہوا تھا۔ اس کے بعد پھر وہ بچہ جننے کے لیے پلنگ پر پڑ گئی۔ اور حالانکہ وہ کوئی دائی بلا سکتی تھی لیکن اب بھی اسے کسی کا ساتھ گوارا نہ تھا۔

اس مرتبہ دردِ زہ کا سلسلہ دیر تک جاری رہا اور وانگ لنگ جب شام کو گھر لوٹا تو اس کا باپ چوکھٹ پر کھڑا قہقہہ مار کر کہہ رہا تھا:

"اب کے انڈے میں دو دو زردیاں ہیں!"

اور اندر جا کر اس نے سچ مچ دیکھا کہ اولان پلنگ پر دو نوزائیدہ بچوں کے ساتھ لیٹی ہوئی ہے۔ ایک لڑکا ہے ایک لڑکی، اور دونوں ایک دوسرے سے اتنے مشابہ ہیں گویا چاول کے دو دانے ہوں۔ اپنی بیوی کی کارستانی پر وہ کھل کھلا کر ہنس

پڑا اور سوچ کر یہ جملہ تراشا:
"معلوم ہوا کہ اسی غرض سے تم دو موتی سینے میں چھپائے پھرتی تھیں!"

اپنی خوش مذاقی پر اترا کر وہ زور سے ہنس پڑا اور اولان بھی اس کی خوشی کو دیکھ کر اپنے خاموش اور اُداس انداز میں مسکرانے لگی.

یہ کہنا چاہیے کہ اس زمانے میں وانگ لنگ کو کسی قسم کا غم نہ تھا. البتّہ اسے وجہ تردّد سمجھیں تو دوسری بات ہے کہ اس کی بڑی بیٹی نہ تو منہ سے بولتی تھی نہ اپنی ہم جولیوں کی طرح کھیلتی تھی۔ بس باپ سے نگاہ دوچار ہوتے ہی اس کے ہونٹوں پر ایک طفلانہ تبسم آجاتا تھا۔ معلوم نہیں یہ پہلے سال کی تکالیف تھیں یا فاقے کا اثر تھا، خدا جانے کیا بات تھی کہ ماہ وسال گزرتے گئے اور وانگ لنگ اس دن کا منتظر رہا جب وہ بولنے لگے گی یا کم ازکم دوسرے بچّوں کی طرح اسے "بابا" کہہ کر بلانے لگے گی لیکن اس کی زبان گنگ رہی۔ ایک میٹھی مسکراہٹ کے سوا اس نے کچھ نہ دیا اور جب بھی وہ اسے دیکھتا تو افسردہ ہو کر کہہ اٹھتا: "اری پگلی ——— میری ننھی پگلی!"

دل ہی دل میں وہ سوچتا:

اگر اس بے چاری کو میں بیچ دیتا اور بعد ازاں وہ اس کی یہ حالت دیکھتے تو یقیناً اس کا گلا گھونٹ دیتے۔"

اور گویا اس کا بدل ادا کرنے کی غرض سے وہ اس کا بڑا خیال رکھتا اور کبھی کبھار اسے ساتھ کھیت لے جاتا۔ وہ چپ چاپ اس کے

پیچھے لگ جاتی اور جب وہ اسے دیکھتا تو مسکرنے لگتی۔

اس علاقے میں جہاں وانگ لنگ پشتہا پشت سے رہتا آیا تھا، پانچ سال میں ایک بار قحط پڑہی جاتا تھا۔ اگر دیوتا بڑے مہربان ہوئے تو آٹھ دس سال چین سے کٹ جاتے تھے۔ سبب یا تو یہ ہوتا تھا کہ بارش ضرورت سے زیادہ ہوگئی یا بہت ہی کم۔ یا شمالی دریا بارش کی زیادتی یا دور دراز کے پہاڑوں کی پگھلی ہوئی برف کی وجہ سے امنڈ پڑتا اور ان بندھوں کو توڑ کر کھیتوں میں دھنس آتا جنھیں کسانوں نے صدیوں پہلے تعمیر کیا تھا۔

کئی کئی مرتبہ لوگ زمین چھوڑ کر بھاگ جاتے اور پھر لوٹ آتے تھے۔ لیکن اب وانگ لنگ ایسا ساز و سامان کرنے لگا کہ اگر فصل نہ بھی ہو تو گھر چھوڑنے کی نوبت نہ آئے بلکہ گزشتہ خوش سالی اس کٹھن گھڑی کا تدارک کر دے۔ اس نے اپنی جان کھپا دی۔ قسمت نے یاوری کی اور متواتر سات سال تک زمین سونا اگلتی رہی۔ اور اس کے کارندے اتنا اناج کاٹتے رہے جو اس کی ضرورت سے بہت زیادہ تھا۔ ہر سال اس کے مزدوروں کی تعداد بڑھتی گئی، حتیٰ کہ وہ چھ ہو گئے۔ اور اس نے اپنے گھر کے متصل ایک نیا مکان بنا لیا، جس میں ایک دالان کے ساتھ بڑا سا کمرا اور دونوں بازوؤں پر دو چھوٹے کمرے تھے۔ چھت کھپریلوں سے چھائی گئی لیکن دیواریں کھیت کی مٹی کی ہی تھیں۔ البتہ ان کی سفیدی چونے سے کر دی گئی تھی جس کی وجہ سے وہ جگر مگر کر رہی تھیں۔ یہاں وہ اپنے بال بچوں سمیت اٹھ آیا اور پرانا مکان کارندوں کو

دے دیا جن کا سردار چنگ تھا۔
اب تک وانگ لنگ اپنے پڑوسی چنگ کو خوب پرکھ کر دیکھ چکا تھا کہ وہ ایماندار اور وفادار ہے۔ لہذا اسے اس نے دوسروں کا مکھیا اور اپنا گماشتہ بنا دیا۔ کھانے کپڑے کے علاوہ دو روپیہ ماہانہ اس کی تنخواہ مقرر کر دی۔ لیکن وانگ لنگ کے ہزار تقاضوں کے باوجود کہ وہ کس کر کھایا کرے۔ چنگ وہی ہڈیوں کا ڈھانچا رہا۔ دبلا پتلا اور سنجیدہ قسم کا آدمی تھا۔ تاہم خوشی خوشی صبح سے شام تک کام کیا کرتا اور اگر کوئی کہنے کی بات ہوئی تو اپنی منمنی آوازیں دو ٹوک کہہ دیتا۔ لیکن بے کچھ کہے کام چل جائے تو اسے انتہائی خوشی ہوتی تھی۔ جب دیکھو اس کی کھرپی حرکت میں رہتی اور وہ ڈولوں میں پانی لیے یا ٹوکروں میں کھاد اٹھائے کھیتوں میں کام کرتا نظر آتا تھا۔
اگر کوئی مزدور کھجور کے پیڑ کے نیچے زیادہ دیر سو رہا یا پنچایت میں بیٹھ کر اپنے حصے سے زیادہ کھا گیا یا دھان کٹائی کے وقت کسی کے بال بچے چپکے سے آتے اور مٹھی دو مٹھی اناج چرا کر لے گئے تو جشن نوروز کے موقع پر چنگ اپنے مالک کے کان میں یہ کہنے سے ہرگز دریغ نہ کرتا تھا:

"فلاں فلاں کو اگلے سال کام پر نہ بلایئے گا۔"

یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان مٹھی بھر سیم کے بیجوں نے ان دونوں میں برادری کا رشتہ قائم کر دیا ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کم عمر ہونے کے باوجود وانگ لنگ نے بڑے بھائی کا مرتبہ حاصل کر لیا تھا۔ اور اپنی جانب سے چنگ اس امر کو فراموش نہ ہونے دیتا تھا کہ بہرحال

وہ ملازم ہی اور دوسرے کے گھر میں رہتا ہی۔

پانچ سال گزرتے گزرتے وانگ لنگ نے کھیتوں میں کام کرنا بہت کم کردیا کیونکہ اب اس کی اراضی اتنی وسیع ہوگئی تھی کہ انتظام اور اناج کی خرید فروخت سے اسے مطلق فرصت نہ ملتی تھی۔ کتابی علم سے بے بہرہ ہونے کے سبب سے اسے بڑی دقت پیش آتی تھی۔ مشکل یہ بھی تھی کہ وہ روشنائی اور اونٹ کے بالوں کی کوچی سے لکھی ہوئی عبارت کو پڑھ نہ سکتا تھا۔ اور پھر یہ کتنی شرم کی بات تھی کہ منڈی میں جب اناج کا نرخ نامہ تیار کیا جاتا تو وہ شہر کے مغرور تاجروں سے بصد عجز یہ کہنے کے لیے مجبور ہوتا:

"صاحب، میں نرا جاہل ہوں، براہِ کرم مجھے پڑھ کر سنا دیجیے"۔

اس سے بھی بری بات یہ تھی کہ جب اس کے دستخط کی باری آتی تو کوئی بھی ایرا غیرا منشی حقارت سے اسے دیکھتا اور اپنی کوچی اٹھا کر جھٹ پٹ اس کا نام لکھ دیتا۔ پھر وہ طعنہ دے کر کہتا:

"کیوں جی اس "خط" کا نام کیا ہی؟"

وانگ لنگ ندامت سے کہتا:

"مجھے تو اپنا نام لکھنا بھی نہیں آتا، یہ سب کیا جانوں"

ایک بار منڈی کے محرّروں کی ہنسی سن کر —— یہ سب عمر میں اس کے بیٹوں سے بڑے نہ ہوں گے اور دوپہر کو خالی وقت کاٹ رہے تھے —— وہ غصّے سے آگ بھبوکا اپنے گھر لوٹا۔ آپ ہی آپ وہ کہنے لگا:

"ان شہری احمقوں میں سے کسی کے پاس گز بھر زمین بھی

نہ ہوگی۔ لیکن وہ میرا انداق بس اس لیے اڑاتے ہیں کہ میں کاغذ پر بنی ہوئی کچھ لکیروں کا مطلب نہیں سمجھ سکتا۔" مگر جب اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا تو اس نے سوچا: "دراصل یہ امر شرمناک ہے کہ میں پڑھ لکھ نہیں سکتا۔ اپنے ایک بیٹے کو میں کھیت سے ہٹا کر شہر کے کسی مدرسے میں داخل کرا دوں۔ پھر جب میں منڈی جاؤں گا تو وہ میرے ساتھ ہو گا تاکہ لکھائی پڑھائی کا کام کر سکے اور پھر یہ بدمعاش مجھ جیسے زمیندار پر ہنسنے کی جرات نہ کر سکیں۔"

یہ منصوبہ اس کے من کو بھایا اور اس نے فوراً اپنے بڑے بیٹے کو طلب کیا۔ اس لڑکے کی عمر کوئی بارہ سال ہوگی۔ وہ اونچا پورا تھا اور ماں کے جوڑے چکلے چہرے اور بڑے بڑے ہاتھ پاؤں کے ساتھ آنکھوں میں اپنے باپ کی تیز نگہی رکھتا تھا۔ جب لڑکا سامنے آ کھڑا ہوا تو وانگ لنگ نے کہا:

"اب تم کاشت کاری کو فی الحال خیر باد کہو۔ کیونکہ مجھے گھر میں کسی عالم کی ضرورت ہے جو راضی ناموں کو پڑھ سکے اور میرا نام لکھ سکے تاکہ شہر میں میری خفت نہ ہو۔"

لڑکے کی آنکھیں خوشی سے چمک پڑیں اور وہ چلا اٹھا:

"ابا دو سال سے میری یہی خواہش تھی لیکن آپ سے کہنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔"

اس واقعے کی اطلاع ملتے ہی چھوٹا بھائی مچلتا اور بڑبڑاتا ہوا دوڑا، کیونکہ یہ اس کی عادت تھی۔ یہ لونڈا غضب کا باتونی اور جھگڑالو تھا، ہمیشہ اسے شکایت رہتی کہ دوسروں کے مقابلے میں

اس کی حق تلفی ہو رہی ہے۔ چنانچہ اب وہ اپنے باپ کے آگے سسکیاں بھر کر کہنے لگا:

"آخر میں ہی کھیت میں کیوں کمر توڑوں ؟ میرا بھائی تو کرسی پر بیٹھے پڑھنا سیکھے اور میں بیل کی دُم اینٹھا کروں۔ میں آپ کا بیٹا ہوں یا نہیں ؟"

وانگ لنگ اس قسم کے شور و غل سے بہت گھبراتا تھا اور جب بھی یہ لڑکا ہڑبونگ مچاتا، باپ اس کی خواہش پوری کر کے اپنا پیچھا چھڑاتا تھا۔ اس لیے اس نے جلدی سے کہا:

"بابا، سر نہ کھا تو بھی چلا جا۔ اگر تم دونوں میں سے کوئی مر گیا تو دوسرے کا علم میرے کام آئے گا۔"

لڑکوں کی ماں کو اس نے شہر بھیج کر کپڑا منگوایا تاکہ دونوں کے لیے ایک ایک لمبا لبادہ بنایا جائے۔ خود کتب خانے جا کر کاغذ اور دوات قلم خریدی، حالانکہ وہ ان چیزوں کے متعلق کچھ نہ جانتا تھا اور اس کا اعتراف کرتے شرم آتی تھی۔ اس لیے دکاندار اسے جو سامان دکھاتا اسے یہ شک و شبہ کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ خدا خدا کر کے سارے انتظامات مکمل ہو گئے اور شہر کے پھاٹک کے کنارے ایک چھوٹے سے اسکول میں انھیں بھیجنے کا دن آ گیا۔ یہ اسکول ایک بڑے میاں کا تھا جو سرکاری امتحانوں میں کئی بار فیل ہو چکے تھے۔ مکان کے بچھلے کمرے میں اس نے بنچ اور میزیں بچھا رکھی تھیں۔ ہر تیوہار کو ایک مقررہ رقم کے عوض وہ لڑکوں کو پڑھایا کرتا تھا۔ اگر وہ کاہلی کرتے یا اپنا سبق

یاد کرکے نہ دیتے تو بڈّھا اپنے بڑے سے پنکھے کی ڈنڈی سے ان کی ٹھکائی کیا کرتا تھا۔

صرف بہار اور گرما کے زمانے ہیں لڑکوں کو چھٹّی ملتی تھی، کیونکہ دوپہر کے کھانے کے بعد میاں جی قیلولہ فرمایا کرتے تھے اور وہ تنگ و تاریک کمرا ان کے خرّاٹوں سے گونج اٹھتا تھا۔ اب لونڈے سرگوشی کرتے، کھیلتے یا مختلف چیزوں کے کارٹون بنایا کرتے تھے۔ اور اگر کوئی مکھی استاد کے کھلے منہ پر بھنبھنانے لگتی تو وہ آپس میں بازی لگاتے کہ دیکھیں یہ غار دہن میں داخل ہوتی ہے یا نہیں لیکن اگر استاد نے بلا اطلاع آنکھ کھول دی — اور کس کو خبر تھی کہ وہ چپکے سے یک بیک یوں جاگ اٹھے گا گویا سویا ہی نہ تھا — تو ان سب کی شرارت پکڑی جاتی تھی اور پھر پنکھے کی ڈنڈی کبھی اس اور کبھی اُس کھوپڑی پر تاک دھنا دھن کرنے لگتی تھی۔ اور جب پڑوسی ڈنڈے کا ساز اور بچّوں کی ہائے پکار سنتے تو کہنے لگتے:

"اس استاد کی علمیت میں کوئی شک نہیں"۔ اسی وجہ سے وانگ لنگ نے اپنے بیٹوں کے لیے اس کے مدرسے کا انتخاب کیا۔"

پہلے دن جب وہ انھیں وہاں لے گیا تو آگے آگے چلتا رہا کیونکہ باپ بیٹوں کا ساتھ چلنا آداب کے خلاف تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک نیلا رومال تھا جس میں تازے انڈے بندھے ہوئے تھے اور یہ اس نے استاد کی نذر کیے۔ اس بڈّھے کی پیتل کی عینک، ڈھیلی ڈھالی سیاہ قبا اور شاندار پنکھے کو جسے وہ سردیوں میں بھی جھلا کرتا تھا، دیکھ کر وانگ لنگ مرعوب ہوگیا اور جھک کر بولا:

"حضرت، میں اپنے دو نالائق بیٹوں کو لایا ہوں۔ ان کی بُھس بھری کھوپڑی میں علم صرف مار کے ذریعے داخل ہو سکتا ہے۔ اس لیے میری خاطر آپ پیٹ پیٹ کر انھیں پڑھایے۔" دونوں لڑکے دوسرے طالب علموں کو حیرت سے گھور رہے تھے اور وہ بھی ان کا جائزہ لے رہے تھے۔
لڑکوں کو وہاں چھوڑ کر اکیلے گھر لوٹتے وقت وانگ لنگ کے گھمنڈ کی حد نہ تھی اسے محسوس ہوا کہ سارے مدرسے میں ان دونوں کے سے تندرست، تنومند اور خوش قیافہ بچے نہ تھے۔ شہر کے پھاٹک پر جب دیہات کے کسی دوست نے پوچھا تو اس نے جواب دیا:
"میں اپنے بیٹوں کے مدرسے سے آرہا ہوں۔" اور جب دوست نے تعجّب ظاہر کیا تو اس نے ظاہری لاپروائی سے کہا: مجھے کھیتوں میں ان کی ضرورت نہیں۔ ان کا جی چاہے تو سارا علم گھول کر پی جائیں۔"
لیکن چلتے چلتے وہ سوچنے لگا:
"اگر بڑا لڑکا پڑھ لکھ کر کوتوال بن گیا تو بڑی بات نہیں۔"
اس دن کے بعد لڑکوں کا نام بڑے میاں اور چھوٹے میاں نہ رہا۔ استاد نے ان کے آبائی پیشہ کی رعایت سے ان کے عالمانہ نام رکھے۔ بڑے کو 'ننگ اِن' اور چھوٹے کو 'ننگ وین' کا لقب بخشا کیونکہ 'ننگ' سے مراد وہ آدمی ہے جس کی روزی کا ذریعہ کاشت ہے۔



باب ۱۸

وانگ لنگ کی عمارت کا کاشانہ کھڑا ہوگیا۔ پھر ساتویں سال جب دھنوا دھار برکھا اور پگھلی ہوئی برف کی وجہ سے دریائے شمالی میں سیلاب آیا اور وہ اپنے بندھ کو توڑ کر علاقے کی ساری زمین پر چھا گیا تو وانگ لنگ کے ماتھے پر بل تک نہ آیا۔ اسے کوئی فکر نہ ہوا حالانکہ اس کی اراضی کا آدھا حصّہ گلے گلے پانی میں ڈوب گیا تھا۔ ختم بہار اور آغازِ گرما میں پانی برابر چڑھتا رہا اور پھر ایک وسیع سمندر کی طرح لہریں مارنے لگا۔ اس کے سکون میں حُسن کا پہلو تھا اور چاند ستارے اور ڈوبے ہوئے پیڑ پودے اس کی آرسی میں اپنا منہ دیکھتے تھے کہیں کہیں مٹّی کا کوئی گھروندا جس کے رہنے والے بھاگ گئے تھے کھڑا رہتا اور پھر ٹوٹ کر گر پڑتا تھا۔ وانگ لنگ کے مکان کی طرح جو مکان پہاڑیوں پر بنے ہوئے تھے وہ تو بچ رہے کیونکہ یہ پہاڑیاں جزیروں کی طرح تھیں۔ ورنہ اور گھر سب غرقاب ہو گئے۔ لوگ ریل یا ڈونگیوں پر بیٹھ بیٹھ کر شہر کا رخ کرنے لگے۔ ان میں فاقہ زدوں کی کمی نہ تھی جن کی ساری عمر فاقوں میں گزر گئی تھی۔

لیکن وانگ لنگ کو کسی بات کا کھٹکا نہ تھا۔ منڈی کے ذمّے اس کا حساب نکلتا تھا، پچھلے دو سال کی فصل سے اس کا بھنڈ بھرا ہوا تھا۔ اور اس کا مکان اتنی بلندی پر تھا کہ پانی اس کے

پائے تک نہ پہنچ سکتا تھا۔ پھر بھلا وانگ لنگ کیوں ڈرے۔
تاہم، جوت کی زمین کم رہ جانے کی وجہ سے وہ ایسا بے کار ہوگیا تھا کہ ساری عمر نہ ہوا ہوگا۔ رہا سہا کام ختم کرکے اور ضرورت سے زیادہ سوکر کاہلی اور خوش خوراکی نے اس میں بے چینی پیدا کرنی شروع کی۔ علاوہ بریں وہ مزدور بھی تھے جن سے ایک سال کے لیے معاملہ ہوچکا تھا۔ جب وہ اپنے مالک کی روٹیاں کھاکر آدھے دن نکھٹو بنے، پانی اتر جانے کا شگون لگائے بیٹھے ہوں تو وانگ لنگ کا اپنے ہاتھوں سے کام کرنا کتنا مضحکہ خیز تھا۔ اس لیے جب وہ انھیں وہ سب کام کرنے کا حکم دے چکا جو وہ پہلے خود انجام دیتا تھا — مثلاً پرانے گھر کے چھپّر کی چھوائی، نئی چھت کی کھپریلوں کی سدھرائی، ہل بکھر کھرپی وغیرہ کی مرمّت، جانوروں کی کھلائی۔ بطخوں کی دیکھ ریکھ، رسی بٹائی — تو اس کے لیے کچھ کرنے کو نہ رہا اور اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وقت کس طرح کاٹے۔
کوئی آدمی دن بھر بیٹھا سیلاب کا نظّارہ نہیں کرسکتا، نہ وہ بھوک سے زیادہ کھا سکتا ہے اور سونے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ مکان کے آس پاس ٹہل کر وہ محسوس کرتا کہ سنّاٹا ہی سنّاٹا ہے، ایسی خاموشی جس کا متحمل اس کا گرم خون نہ ہوسکتا تھا۔ بڑے میاں اب نرے اپاہج ہوگئے تھے۔ انہیں سنائی تو بالکل نہ دیتا تھا، نظر بھی مشکل سے آتا تھا۔ ان سے اس کے سوا کسی قسم کی گفتگو نہ ہوسکتی تھی کہ کھانا تو اچھا ملتا ہے یا اوڑھنے کو کافی ہے یا چائے کی ضرورت ہے۔ اور وانگ لنگ جھنجھلا پڑتا تھا جب یہ نہ دیکھ کر کہ وہ

امیر ہو چکا ہے۔ اس کا باپ اب بھی پیالی میں چائے کی پتی دیکھ کر بڑبڑانے لگتا کہ" چائے اور چاندی میں کوئی فرق نہیں۔ گرم پانی کافی ہے ؟" اور بڈھے کو کچھ سمجھانا فضول تھا کیونکہ وہ فوراً بھول جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی بیتی ہوئی دنیا میں رہتا تھا اور اس خوش خوابی میں مبتلا تھا کہ وہ پھر سے جوان ہو گیا ہے۔ اپنے گرد و پیش کی اسے کچھ خبر نہ ہوتی تھی۔

بڑی بیٹی سارے وقت اپنے بوڑھے دادا کے پاس چپ چاپ بیٹھی کسی کپڑے میں بل ڈالتی اسے کھولتی اور اپنے کمال پر مسکرایا کرتی تھی۔ وانگ لنگ کی دولت اور محنت کی داد دینے کے لیے ان کے پاس الفاظ نہ تھے۔ جب وہ بڑے میاں کو چائے کی پیالی دے چلتا اور لڑکی کے گال پر ہاتھ پھیر کر اس کے عوض ایک شیریں مگر بے معنی تبسّم حاصل کر چکتا، تو پھر ان کا تعلّق ختم ہو جاتا تھا۔ لڑکی لمحہ بھر کے لیے اس پر اُداسی کا جو نشان ثبت کر دیتی اس سے متاثر ہو کر وانگ لنگ خاموش ہو جاتا اور پھر اپنے جڑواں بچّوں کو تاکنے لگتا جو دہلیز پر کھیلا کرتے تھے۔

لیکن کوئی مرد ننھّے بچّوں کی نادانیوں سے زیادہ عرصے کے لیے محظوظ نہیں ہو سکتا۔ کچھ دیر کی چھیڑ چھاڑ اور ہنسی کھیل کے بعد جب وہ چلے جاتے تو وانگ لنگ کو تنہائی کاٹنے لگتی تھی۔ اس وقت گھوم پھر کر وانگ لنگ کی نگاہ اپنی بیوی پر اٹکتی تھی۔ اور یہ نگاہ ایک مرد کی ہوتی تھی جو اپنی بیوی کو ایڑی سے لے کر چوٹی تک جانتا پہچانتا ہے، اتنے پاس سے کہ اب اس میں کوئی نئی

یا نرالی بات نہیں رہ گئی ہی۔
اب اُسے یہ محسوس ہوا کہ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ اسے دیکھ رہا ہی۔ پہلی بار اس نے دوسروں کی نگاہ سے دیکھا تو یہ ایک غیر دلچسپ اور معمولی عورت نکلی جو اس کی پروا کیے بغیر کہ غیروں کے سامنے کس صورت میں آتی ہی، بے زبان جانوروں کی طرح اپنا فرض ادا کیے جاتی تھی۔ پہلی بار مرد نے دیکھا کہ اس کے بال روکھے اور بھورے ہیں جس میں تیل نہیں ڈالا جاتا، اس کا چہرا چوڑا چکلا اور کھال موٹی ہی۔ خدوخال میں کسی قسم کی دل نشینی یا موہنی نہیں ہی۔ اس کی بھنویں چھتری ہوئی ہیں جن میں اِکّے دکّے بال ہوں گے اس کے ہونٹ بہت موٹے اور ہاتھ پانْو بھاری بھرکم تھے حیرت زدہ نگاہوں سے اس ہیولے کو دیکھ کر وہ چیخ اُٹھا:
"تمھیں دیکھ کر کوئی یہی کہے گا کہ کسی گھسیارے کی جورو ہی۔ ہرگز جو کوئی کہہ دے کہ ایک زمیندار کی بیوی ہی!"
یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اولان کی صورت شکل کا ذکر کیا ہو۔ جواب میں اس نے جو نگاہ اٹھائی اس میں درد تیر رہا تھا۔ اس وقت وہ ایک تخت پر بیٹھی جوتے کا تلا بنا رہی تھی۔ اپنے شوہر کی بات سنتے ہی اس کے ہاتھ ٹھٹک گئے اور منہ کھُلے کا کھلا رہ گیا جس میں سے کالے دانت دکھائی دے رہے تھے۔ جب وہ یہ سمجھی کہ وانگ لنگ نے اُسے اس طرح دیکھا ہی جس طرح مرد عورت کو دیکھتا ہی تو اس کا چہرا تمتما اُٹھا اور وہ آہستہ سے بولی:
ان جڑواں بچوں کی پیدائش کے بعد سے میری طبیعت خراب

رہتی ہی۔ معلوم ہوتا ہی کہ کلیجہ پھنکا جا رہا ہی۔"

وانگ لنگ بھانپ گیا کہ یہ بے وقوف اس خام خیالی میں مبتلا ہی کہ سات برس سے بچّے نہ جننے کی وجہ سے وہ اس پر الزام رکھ رہا ہی۔ اس لیے اس نے زیادہ درشتی سے دھمکایا:

میرا مطلب یہ ہی کہ کیا تم دوسری عورتوں کی طرح بالوں میں تیل نہیں لگا سکتیں اور نیا کالا کپڑا خرید کر اس کا شلوکہ نہیں بنا سکتیں؟ تمھاری یہ سڑی ہوئی جوتیاں کسی زمیندار کی بیوی کو زیب نہیں دیتیں۔"

اولان کچھ نہ بول سکی۔ عاجزی سے اس نے اپنے شوہر کو دیکھا اور اسے یاد نہ رہا کہ وہ کیا کر رہی ہی۔ تخت کے نیچے لٹکے ہوئے پانْو خود بخود ایک دوسرے کو چھپانے کی کوشش کرنے لگے۔ حالانکہ وانگ لنگ کا دل شرم سے خون ہو رہا تھا کہ آج اُس ہستی کو نام دھر رہا ہی جس نے ہمیشہ وفا دار کتّے کی طرح اس کا ساتھ دیا اور اسے یہ بھی یاد تھا کہ غربت کے زمانے میں بچّہ پیدا ہوتے ہی وہ اس کا ہاتھ بٹانے کے لیے بلا تامّل کھیت میں کام کرنے آگئی تھی۔ تاہم وہ اپنے غصّے کو ضبط نہ کر سکا۔ ضمیر کی آواز کو دبا کر وہ بیرحمی سے بولتا گیا:

"خون پسینہ ایک کر کے میں نے دولت جمع کی ہی اور مجھے یہ ہرگز گوارا نہیں کہ میری بیوی بھتنی معلوم ہو اور تمھارے یہ پانْو ——"

اس سے زیادہ وہ نہ کہہ سکا۔ اسے محسوس ہوا کہ یہ عورت کیا کالی دیوی ہی۔ لیکن اس کے جسم کے سب سے بدصورت عضو

اس کے بڑے بڑے پانو تھے جن میں اس وقت سوتی زیرپائی پڑی ہوئی تھی۔ وانگ لنگ نے ایسی غضبناک چتونوں سے انھیں گھورا کہ اولان نے انھیں اور بھی تخت کے اندر گھسیڑ لیا اور رُک رک کہا:

"میری ماں اس وجہ سے انھیں باندھ نہ سکی کہ میں چھٹ پن میں ہی بیچ دی گئی تھی۔ لیکن میں چھوٹی بیٹی کے پانو ضرور باندھ دوں گی۔"

وانگ لنگ کو اس احساس سے شرم آئی کہ وہ ناراض ہوگیا ہے اور اس بات پر زیادہ غصہ آیا کہ اولان ناراض ہونے کی بجائے خوف زدہ ہوگئی ہے۔ اس لیے اپنے کپڑے جھاڑ پونچھ کر جھنجھلاہٹ سے وہ یہ بولتا ہوا چل دیا:

"بہت اچھا۔ میں چائے خانے میں ہی جاکر دل بہلاؤں۔ میرے گھر میں تو ایک بڈھے پھونس، دو پلّوں اور چند احمقوں کے سوا کوئی نہیں۔"

شہر کی طرف جاتے جاتے جب اسے یہ خیال آیا کہ یہ سب نئے کھیت وہ سات جنم میں بھی نہ خرید سکتا اگر اس سیٹھ کے گھر سے اولان جواہرات نہ اڑا لاتی اور خوشی خوشی اسے نہ دے دیتی۔ تو اس کی بدمزاجی اور بھی بڑھ گئی۔ ان باتوں کو یاد کرکے اس کا غصہ بھڑکا اور وہ گویا اپنے ضمیر سے انتقام لینے کے لیے بولا:

"لیکن خود اُسے اپنے کیے کی خبر نہ تھی۔ جیسے کوئی بچہ رنگین مٹھائیوں پر ہاتھ ڈالے۔ اس نے جواہرات چرائے۔ اگر میرا ہاتھ نہ پڑتا تو وہ عمر بھر انھیں چھپائے رکھتی۔"

اُسے کرید ہوئی کہ جانے وہ دو موتی اب تک اولان اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہے یا نہیں۔ پہلے تو یہ امر اس کے لیے

کسی قدر تعجب کا باعث تھا اور کبھی کبھی وہ اس کے متعلق قیاس آرائی بھی کیا کرتا تھا۔ لیکن آج اسے اس خیال سے گھن آئی کیونکہ نیچے جن جن کر اولان کی چھاتیاں لٹک گئی تھیں اور اتنی بڑھ گئی تھیں کہ ان میں خوب صورتی کا کوئی پہلو باقی نہ رہا تھا۔ ان میں ان موتیوں کو رکھنا گوبر کی ڈھیری میں پھینک دینے کے برابر تھا۔

اگر وانگ لنگ اب تک غریب ہوتا یا اس کے کھیتوں میں سیلاب نہ آتا تو ان واقعات کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ لیکن اب تو وہ خدا رکھے مال دار تھا۔ گھر کی دیواروں میں چاندی چنی ہوئی تھی، نئے مکان کے فرش کے نیچے ریوں کا ایک بدرا دبا دیا گیا تھا۔ خواب گاہ کے ایک صندوق میں ریوں کی تھیلی تھی اور گدّے میں اشرفیاں سلی ہوئی تھیں۔ اس کی بسنی میں رُپے چھن چھنا رہے تھے غرض کہ ہر طرف چاندی ہی چاندی تھی۔ اب وہ دن نہ رہے تھے جب گرہ سے دام جاتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا کہ زخم سے خون بہ رہا ہو۔ اب تو جب جب وہ کمربند کو چھوتا تو چاندی اس کی انگلیوں کو جلانے اور باہر نکلنے کے لیے کلبلانے لگتی تھی۔ وانگ لنگ اب ریوں کی زیادہ پروا نہ کرتا تھا اور اپنی بچی کھچی جوانی کو عیش سے گزارنے کی فکر میں رہا کرتا تھا۔

اب پہلے کی طرح اُسے ہر چیز بھلی نہ جچتی تھی۔ جس چائے خانہ میں داخل ہوتے ہوئے اسے اس احساس سے جھجھک ہوتی تھی کہ وہ گنوار اور کسان ہے۔ آج وہی اسے تنگ اور گندا نظر آتا تھا۔ پرانے زمانے میں کوئی اس کی بات بھی نہ پوچھتا تھا اور چائے والے

لونڈے اس سے گستاخی سے پیش آتے تھے۔ لیکن اب تو اس کے آتے ہی سب کی نگاہیں اُٹھ جاتی تھیں اور وہ ایک آدمی کو دوسرے کے کان میں یہ کہتے ہوئے سن سکتا تھا:

"یہ وانگ گاؤں کا باشندہ وانگ لنگ ہے جس نے بڑے اکال کے زمانے میں بڑے نواب کی موت کے وقت ہوانگ گھرانے کی زمینیں خریدی تھیں۔ اب تو یہ مالا مال ہو گیا ہے۔"

یہ سن کر بظاہر تو وانگ لنگ اِدھر توجّہ نہ کرتا لیکن دراصل دل میں وہ پھول کر کُپّا ہو جاتا۔ لیکن آج بیوی سے جھگڑ کر آنے کی وجہ سے یہ تعظیم و تکریم بھی اس کے دل کی کلی نہ کھلا سکی۔ افسردگی سے چائے پیتے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ زندگی کتنی سونی ہے۔ اتنے میں یک بیک اسے خیال آیا:

"آخر میں اِس چائے خانے میں کیوں آتا ہوں جس کا مالک ایک کانا نیولا ہے اور جس کی آمدنی میرے مزدوروں سے بھی کم ہے ــــ میں جس کے بیٹے عالم ہیں اور جو زمیندار بھی ہے۔"

یہ سوچ کر وہ جھٹ سے اٹھا اور کسی کو بات کرنے کا موقع نہ دے کر پیسے پھینک کر باہر نکل آیا۔ شہر کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے وقت اسے کچھ نہ معلوم تھا کہ وہ چاہتا کیا ہے۔ ایک داستان گو کی دُکان کے آگے پہنچ کر کچھ دیر کے لیے وہ ایک چوکی کے کونے پر بیٹھ گیا اور ان تین بادشاہوں کا پرانا افسانہ سنتا رہا جب سورما بہادر اور عیّار ہوا کرتے تھے۔ لیکن وہ اتنا بے قرار تھا کہ دوسروں کی طرح قصہ گو کی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ بیچ بیچ میں یہ شخص گھنٹا پیٹتا

کرتا تھا۔ وانگ لنگ کو یہ سخت ناگوار گزرا اور وہ فوراً باہر نکل آیا۔

شہر میں ایک نیا چائے خانہ کسی دکنی نے کھولا تھا جو اس تجارت کے گروں سے واقف تھا۔ اس سے پہلے بھی وانگ لنگ اس کے سامنے سے گزرا تھا اور یہ سوچ کر کہ اندر آوارہ عورتوں اور قماربازی میں رُپے کس طرح لٹائے جاتے ہیں، اسے سخت وحشت ہوئی تھی، لیکن اب کاہلی کی کوفت کو کم کرنے اور ضمیر کی اس لعنت کو بھولنے کے لیے کہ اس نے اپنی بیوی سے بے انصافی کی ہے۔ وہ اسی مقام کی طرف چل کھڑا ہوا۔ بے قراری کا مطالبہ تھا کہ کوئی نئی بات سنی جائے، کوئی نئی چیز دیکھی جائے۔ اس جذبے کے ماتحت وہ نئے چائے خانے کا دروازہ کھول کر ایک شاندار کمرے میں داخل ہوگیا، جس میں سیکڑوں میزیں رکھی تھیں اور جولب سڑک تھا۔ اندر آکر اپنی جھجھک کو چھپانے کے لیے وہ اپنے بشرے پر دلیری اور دلداری کے آثار لے آیا کیونکہ اسے یاد آیا کہ ابھی کچھ ہی عرصے پہلے وہ بالکل محتاج تھا اور اس کی جیب میں کبھی روپیہ دو روپیہ سے زیادہ نہ ہوتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ دکن کے ایک شہر میں وہ رکشا کھینچا کرتا تھا۔

پہلے تو اس شاندار چائے خانے میں اسے منہ کھولنے کی جرات نہ ہوئی۔ خاموشی سے چائے پی کر وہ اچنبھے سے ہر طرف دیکھنے لگا۔ یہ ایک بہت بڑا ہال تھا جس کی چھت پر روپہلی روغن لگا تھا اور دیواروں میں سفید ریشم کے پردے ٹنگے تھے جن پر عورتوں کی تصویریں بنی تھیں۔ چور نگاہوں سے ٹک ٹکی باندھے

وانگ لنگ ان عورتوں کو دیکھتا رہا اور اسے یہ گمان ہونے لگا کہ یہ پریاں ہیں، کیونکہ زمین پر تو اس نے ان کا جواب نہ دیکھا تھا۔ پہلے دن انھیں دیکھ دا لکھ کر اور جلدی سے چائے پی کر وہ چلا آیا۔

جب تک اس کے کھیتوں میں پانی جما رہا وہ روز اس چائے خانے میں آتا اور اکیلے چائے پیتے ہوئے حسین عورتوں کی تصویروں کو سراہا کرتا۔ اس تفریح کی مدت دراز ہوتی گئی کیونکہ نہ اسے کھیت میں کچھ کرنا تھا نہ گھر میں۔ بہت ممکن ہے کہ وہ ابھی اور بھی اس نظارہ بازی کا سلسلہ جاری رکھتا، کیونکہ اپنے پوشیدہ خزانوں کے باوجود وہ اس امیرانہ چائے خانے میں تنہا دیہاتی تھا جو ریشم کی بجائے روئی پہنتا اور سر پر چوٹی رکھتا تھا جس کا متحمل کوئی شہری نہ ہو سکتا تھا لیکن ایک روز شام کو جب وہ کمرے کے پیچھے کی میز پر بیٹھا چائے پیتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ ایک تنگ سی سیڑھی سے کسی کا ورود ہوا۔ یہ سیڑھی سب سے پرے کی دیوار سے ہو کر اوپر کی منزل کو جاتی تھی۔

سارے شہر میں یہی ایک ایسی عمارت تھی جس میں دو منزلیں تھیں۔ یہاں اُس پچھمی پیگوڈا، کا ذکر نہیں جو پچھم دروازے کے پاس واقع تھا۔ اس میں تو پانچ منزلیں تھیں۔ لیکن پیگوڈا کی منزلیں یکے بعد دیگرے کوتاہ تر ہوتی گئی تھیں اور چائے خانے کی بالائی منزل اتنی ہی کشادہ تھی جتنا نیچے کا حصّہ۔ بالائی دریچوں سے رات کے وقت عورتوں کی خوش الحانی اور ہنسی کی آوازیں فضا میں گونج اٹھتیں اور ان کے ساتھ دُتارے کا شیریں ساز سنائی پڑتا

جیسے حسینوں کی نازک انگلیاں چھیڑا کرتی تھیں۔ خصوصاً آدھی رات کے بعد سڑک سے بھی کوئی یہ سب کچھ سن سکتا تھا۔ لیکن وانگ لنگ جہاں بیٹھتا تھا وہاں پیالیوں کی کھڑکھڑاہٹ اور پانسے کی وہ کھڑبڑ رہتی تھی کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ وانگ لنگ کو سیڑھی پر ایک عورت کے پانو کی چاپ نہ سنائی دی اور جب ایک دن غیر متوقع طور پر کسی نے پیچھے سے آکر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا تو وہ چونک پڑا۔ لوٹ کر کیا دیکھتا ہے کہ 'کویل بائی' کا حسین چہرا اس کے پیچھے جگمگا رہا ہے۔ یہ وہی عورت تھی جس کے ہاتھ میں اس نے زمین کے عوض جواہرات دے دیے تھے اور جس نے بڈھے نواب کے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو سہارا دے کر بیع نامے پر مہر لگوائی تھی۔ وانگ لنگ کو دیکھتے ہی وہ ہنس پڑی لیکن یہ ہنسی ایک تیز سرگوشی معلوم ہوئی۔

"کیوں جی وانگ لنگ کسان!" اس نے کہا اور 'کسان' کے لفظ پر شرارت سے خاص زور دیا: "کسی کو وہم بھی نہیں ہو سکتا کہ تم یہاں آؤگے!"

وانگ لنگ نے سوچا کہ بہر صورت اس عورت کو بتا دینا ہے کہ وہ کوئی معمولی دیہاتی نہیں۔ اس لیے اس نے زور کا قہقہہ لگا کر بلند آواز میں کہا:

"کیا میرے روپے دوسروں کے روپے سے خراب ہیں؟ آج کل میں مالا مال ہوں۔ قسمت میری یاوری کر رہی ہے۔"

یہ سن کر کوئی بائی ٹھٹک گئی۔ اس کی آنکھیں سانپ کے نینوں کی طرح چھوٹی مگر چمک دار تھیں اور اس کا لہجہ ایسا چکنا چپڑا تھا گویا مکھن ٹپک رہا ہو۔

"یہ تو سارے زمانے پر روشن ہی۔ اور اگر کسی کے پاس فاضل رُپے ہوں تو انھیں خرچ کرنے کے لیے اس سے بہتر کون سی جگہ ہو سکتی ہی جہاں امرا اور شرفا عیش و نشاط کے لیے جمع ہوتے ہیں؟۔ یہاں جیسی شراب کہیں نہیں ملتی، تم نے کبھی چکھی بھی ہی؟"

وانگ لنگ نے کچھ شرما کر کہا: "اب تک میں صرف چائے پیتا رہا ہوں۔ نہ میں نے شراب کو ہاتھ لگایا نہ پانسے کو۔"

"چائے!" عورت نے فرمائشی قہقہہ لگا کر کہا: "لیکن یہاں خوشبودار چاولوں کی شراب اور شیر کی ہڈّی کی شراب یا شبنمی دارو —— سب کچھ موجود ہی، پھر تم چائے کیوں پیا کرتے ہو؟" جب شرم سے وانگ لنگ کا سر جھک گیا تو اس نے شوخی سے اٹھلا کر کہا:

"کیا یہ بھی ممکن ہی کہ تم نے اور کچھ نہ دیکھا ہو؟ نازک کلائیوں اور گلابی رخساروں پر تمھاری نگاہ نہ گئی ہو؟"

وانگ لنگ کا سر اور بھی جھک گیا۔ اس کا چہرا لال گلال ہو گیا اور اسے ایسا لگا کہ سب اس پر ہنس رہے ہیں اور اس عورت کی باتیں سن رہے ہیں۔ لیکن جب اس نے کن انکھیوں سے دیکھا تو کسی کو اپنی طرف متوجہ نہ پایا۔ پانسا برابر کھڑک رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر کہا:

"نہیں نہیں۔ میں نے کچھ نہیں کیا —— صرف چائے۔"

یہ سن کر عورت پھر ہنسی اور دیوار کی تصویروں کو دکھا کر بولی:
"ان حسینوں کی یہ تصویریں ہیں۔ ان میں سے جس پر دل آئے مجھے دکھلاؤ اور رُپے نکالو، میں ابھی اسے تمھارے سامنے لا کر کھڑا کروں گی۔"
وانگ لنگ بھوچکّا رہ گیا۔"یہ ایسی تو انھیں پریوں یا دیویوں کی چھب سمجھتا تھا جن کا ذکر قصوں میں ہوتا ہے۔"
کویل بائی نے طنزاً مسکرا کر کہا: "یہ بیشک پریاں ہیں، لیکن رُپے کے درشن ہوتے ہی عالم شہود میں آجائیں گی۔" یہ کہہ کر وہ نوکروں سے چہل کرتی چلی گئی اور وانگ لنگ کی طرف اشارہ کر کے ان میں سے ایک سے کہا: "یہ ہے دیہاتی لٹھ مار!"
لیکن وانگ لنگ ایک نئی دلچسپی کے ساتھ تصویروں کو دیکھنے لگا تو یہ سمجھیے کہ اس سیڑھی کے اوپر بالائی منزل میں زندہ تصویریں موجود ہیں جن کے ساتھ دوسرے مرد —— وہ خود نہیں تو اس کے ہم جنس —— عیش کرتے ہیں۔ بفرض محال اگر وہ بال بچّوں والا پاکباز کسان نہ ہوتا، کچھ اور ہوتا، تو ان میں سے کس عورت کا انتخاب کرتا؟ بچّوں کی طرح وہ اس ادھیڑ بن میں پھنس گیا کہ اگر ایسا ہوتا تو کیا ہوتا۔ ہر رنگے ہوئے چہرے کا وہ اس غور سے معائنہ کرنے لگا گویا وہ نقلی نہیں اصلی ہیں۔ اس سے پہلے جب انتخاب کا سوال نہ تھا ان میں سے ہر چہرا یکساں حسین تھا۔ لیکن اب ان میں صاف فرق نظر آتا تھا۔ چنانچہ کوئی دو درجن میں سے اس نے تین سب سے خوب صورت عورتیں چنیں، اور ان میں سے بھی ایک کو منتخب کیا جو سب سے زیادہ دلآرام تھی۔ اس نازک اندام کا جسم بانس کا سا چھریرا اور مکھڑا بلّی کے بچّے کا سا

بھولا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کنول کی کلی تھی اور یہ ہاتھ کنول کے ڈنٹھل کا سا سچیلا تھا۔

ٹکٹکی باندھے وہ اسے دیکھنے لگا اور یک بیک اس کی رگوں میں بجلی سی تڑپنے لگی۔

آپ ہی آپ وہ بول اٹھا: "یہ تو گل مہر کا پھول ہے"۔ اپنی آواز سن کر وہ شرم سے کٹ گیا اور جھٹ اٹھ کر پیسے پھینکے اور اندھیرے میں اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

جل تھل میں چاندنی روپہلی جال کی مانند بچھی ہوئی تھی اور اس کے بدن میں گرم گرم خون چپکے چپکے رقص کر رہا تھا۔



باب ۱۹

اگراسی وقت سیلاب اتر جاتا اور وانگ لنگ کی گیلی اور دھوپ کھائی ہوئی زمین جتائی اور بوائی کے لیے تیار ہوگئی ہوتی تو وہ ہرگز اس نئے چائے خانے کا رُخ دوبارہ نہ کرتا یا اگر کوئی بچہ بیمار ہو جاتا یا بڑے میاں کا آخری وقت آپہنچتا تو وانگ لنگ کا دھیان بٹ جاتا اور اسے تصویر والی اس من موہنی کی یاد نہ ستاتی۔

لیکن شام کے وقت چلنے والی گرم ہوا کے باوجود پانی بدستور چڑھا رہا۔ بڑے میاں کی اونگھ جاری رہی اور دونوں لڑکے مدرسے آتے جاتے رہے۔ وانگ لنگ کی بے قراری بڑھتی گئی۔ اولان سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت اسے نہ ہوتی، لیکن وہ جو چائے انڈیلتی یا جو پائپ جلا کر دیتی اسے ہاتھ لگائے بغیر کبھی وہ اس کرسی پر بیٹھتا اور کبھی اس پر اُچک جاتا تھا۔ ساتویں مہینے کا ذکر ہے۔ دن ڈھلتے ہی ــــ اور یہ دن کتنا طویل ہوگیا تھا ــــ جب جھیل کی ہواؤں نے شفق کو زیادہ لالہ گوں اور پرفسوں بنا دیا تھا ؛ وہ مکان کے دروازے پر آکھڑا ہوا کچھ سوچ کر اچانک وہ اندر گیا اور اپنا نیا کوٹ پہن لیا۔ یہ کوٹ اولان نے تقریبوں کے لیے سیا تھا اور اس کا سیاہ کپڑا اتنا چمک دار تھا کہ اس پر ریشم کا گمان ہوتا تھا۔ کسی سے کچھ کہے بغیر وہ لبِ آب کی لیک سے ہو کر کھیتوں سے گزرتا ہوا اندھیرے میں شہر کے دروازے پر پہنچا اور مختلف سڑکوں سے ہو کر وہ اُسی

جائے خانے میں پہنچ گیا۔

وہاں چراغاں ہو رہا تھا۔ بڑی بڑی قندیلیں جو ساحل کے غیر ملکی شہروں میں لگا کرتی ہیں روشن تھیں اور وہاں لوگ پیتے پلاتے، گپ کرتے بیٹھے تھے۔ ہوا کھانے کے لیے انھوں نے بندِ قبا کھول دیے تھے، ہر طرف پنکھے جھلے جا رہے تھے اور ہنسی کا شور گیت کی طرح فضا میں گونج رہا تھا۔ وانگ لنگ کھیت کی محنت سے جو لطف حاصل کیا کرتا تھا وہ اس بند مکان میں میسر تھا۔ فرق یہ تھا کہ یہاں لوگ کام کرنے نہیں بلکہ وقت کاٹنے کے لیے جمع ہوتے تھے۔

وانگ لنگ ایک آن کے لیے چوکھٹ پر ٹھٹکا رہا۔ کھلے ہوئے دروازوں سے آتی ہوئی تیز روشنی اس پر پڑ رہی تھی۔ وہ یوں ہی کھڑا رہتا یا چلا جاتا کیونکہ اس کا دل سہما ہوا تھا، حالانکہ خون ایسے جوش میں تھا گویا رگوں کو پھاڑ کر باہر نکل آئے گا۔ لیکن ایک عورت اسی وقت سائے سے نکل کر روشنی میں آئی۔ یہ کویل بائی تھی جو دروازے کے پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔ کسی مرد کو دیکھتے ہی وہ لپکی کیونکہ چکلے کی عورتوں کے لیے گاہک مہیا کرنے پر وہ تعینات تھی۔ لیکن آنے والے کو پہچانتے ہی اس نے شانہ ہلا کر کہا:

"توبہ، یہ تو وہی کسان ہے!"

عورت کے اس گریز نے وانگ لنگ کے تن بدن کو جلا دیا اور غصّہ کے مارے اس کی زبان یوں کھل گئی کہ بحالت دگر ناممکن تھا۔ وہ بولا:

"کیا مجھے یہاں آنے اور وہی کرنے کا اختیار نہیں ہے جو دوسرے کیا کرتے ہیں ؟"

کوئل بائی نے پھر ہاتھ مٹکا کر اور ہنس کر کہا :

"کیوں نہیں ؟ جس کی جیب میں دام ہوں وہ یہ کر سکتا ہے"

وہ اس پر فیاضی اور ثروت کی دھونس جمانا چاہتا تھا ۔ اس لیے جیب میں ہاتھ ڈال کر مٹھی بھر رُپے نکالے اور انھیں کھنکا کر کہا :

" اتنے ہی یا اور بھی ؟ "

کوئل بائی چاندی دیکھتے ہی پھڑک اٹھی اور فوراً بولی :

" آؤ اور جس کے پاس جی چاہے جاؤ "

وانگ لنگ نے بے سوچے سمجھے کہا : مجھے خود نہیں معلوم کہ میں کیا چاہتا ہوں " مگر شہوت اس پر غالب آگئی اور اس نے آہستہ سے کہا :

" وہ ننھی مُنّی ــــ وہی جس کی ٹھڈّی نوکدار ہے اور جس کا چھوٹا سا چہرا گلاب کی طرح شگفتہ ہے اور جو ہاتھ میں کنول کی کلی لیے ہوئے ہے "

کوئل بائی نے جھٹ رضامندی ظاہر کی اور اسے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے بھیڑ کو چیرتی ہوئی آگے بڑھی ۔ وانگ لنگ زرا ہٹ کر اس کے پیچھے ہو لیا ۔ پہلے تو اسے یہ شبہ ہوا کہ سب کی نگاہیں اسی پر ہیں لیکن جی کڑا کر کے جب آنکھیں گھمائیں تو کسی کو اپنی طرف متوجہ نہ پایا بس کسی اکّے دکّے نے پکار کر کہا : "کیا عورتوں کے پاس جانے کا وقت آگیا ؟ " اور کسی نے جواب دیا : " اماں ، اس مسٹنڈے کو زرا جلدی ہی جانا چاہیے "

اب وہ تنگ سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے اور اس مہم میں وانگ لنگ کو

تھوڑی سی دقت پیش آئی کیونکہ کسی مکان کی سیڑھیاں چڑھنے کا یہ اس کے لیے پہلا موقع تھا۔ تاہم چوٹی پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ اس میں اور کسی مکان میں کوئی فرق نہیں، البتہ کھڑکی کھول کر آسمان کی طرف دیکھنے پر اس کی بلندی کا اندازہ ہوا۔ کویل بائی نے اسے ایک تنگ و تاریک دالان میں لے جا کر پکارا:

"آج کی رات کا پہلا مہمان آیا ہے!"

دالان کے تمام دروازے یکایک کھل گئے اور روشنی کی کرنوں میں یہاں وہاں عورتوں کے سر یوں جگمگانے لگے جیسے سورج نکلتے ہی کلیاں چٹخ جاتی ہیں لیکن کویل بائی نے حقارت سے کہا:

"تم نہیں، تم نہیں، تمھیں پوچھتا ہی کون ہے۔ یہ تو سوچو کی اس گلاب مکھی بوٹی 'کمل' کا خریدار ہے"۔

سارا دالان ایک طعن آمیز مگر غیر واضح شور سے گونج اٹھا۔ اور ایک لڑکی نے ـــــ جو انار کی طرح سرخ تھی ـــــ زور سے کہا:

"کمل اس مردوئے کے استقبال کے لیے تیار ہے ـــــ حالانکہ اس سے پیاز اور مٹی کی بو آتی ہے!"

یہ سن کر بھی وانگ لنگ نے جواب دینے کی زحمت گوارا نہ کی۔ حالانکہ یہ پھبتی تیر کی طرح اس کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ لیکن وہ ڈرا کہ اس کی شباہت اس کی اصلیت کا پردہ فاش کر رہی ہے۔ بہر حال اپنی تھیلی کی لمبائی کا خیال آتے ہی وہ لاپروائی سے آگے بڑھ گیا۔ گٹنی ایک بند دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہو گئی۔ وہاں ایک پلنگ پر جس پر ایک پھول دار چادر بچھی ہوئی، وہی پری چہرہ

رکھا اور آہستہ آہستہ اس کے بازو کو سہلانے لگی۔ آج تک اتنی ہلکی اور نرم چیز نے اسے نہ چھوا تھا اور اگر اس نے دیکھا نہ ہوتا تو اس کے مس کا احساس بھی نہ ہوتا۔ اس نے دیکھا کہ کنول کا ڈنٹھل اس کے بازو سے نیچے کلائی کی طرف جا رہا ہے اور گویا آگ کی سلائی اس کے عضوِ جسم کو جلاتی ہوئی گوشت کے اندر پیوست ہو گئی ہے۔ عورت کا ہاتھ اس کی آستین تک گیا اور پھر اس کی کلائی پر جنچی تلی جھجک کے ساتھ لمحہ بھر ٹھہر کر وانگ لنگ کی ہتیلی پر آ گرا اس کے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی اور سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کرے۔

اتنے میں وہ عورت ہنس پڑی اور ایسا معلوم ہوا کہ ہوا کے جھونکے کھا کر پیگوڈا کی نقرئی گھنٹی جلدی جلدی ہلکے سروں میں بج رہی ہے اور ایک خندہ زن آواز نے پوچھا:

"ایسے بھاری بھر کم ہو کر بھی تم ابھی بچے ہی ہو۔ کیا تم رات بھر یونہی بیٹھے ہوئے مجھے گھورا کرو گے؟"

اس پر وانگ لنگ نے کمال احتیاط سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا ــــ وہ جو ایک سوکھی ہوئی پتّی کی طرح نازک تھا۔ اور بے سوچے سمجھے گڑگڑانے لگا:

"میں کچھ نہیں جانتا ــــ مجھے بتلاؤ۔"

اور عورت نے اُسے بتلایا۔

اب وانگ لنگ ایسے مرض کا بیمار ہوا جس کے مارے زلیست حرام ہو جاتی ہے۔ لُو کے گرم جھونکوں اور برفانی طوفانوں کا دکھ اس نے جھیلا تھا۔ فاقے کا غم اس نے برداشت کیا تھا اور اُس

دکنی شہر میں لاچار و نامراد محنت کشی کا رنج سہا تھا۔لیکن ان میں سے
کوئی اُس دُکھ کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا جو اس چھوکری کے ہاتھوں کے
مس سے اسے ملتا تھا۔

ہر روز وہ چائے خانے کو جاتا اور شام کو اس وقت تک ٹھہرا رہتا
جب تک اس کے دیدار نہ ہو جاتے اور جب تک وصل کی لذّت
سے لطف اندوز نہ ہو لیتا۔حالانکہ وہ ہر رات کو اپنا سبق سیکھتا
لیکن ہر مرتبہ وہ ایک لاعلم دہقانی ہوتا جسے کچھ نہ معلوم تھا۔دہلیز پر
اس کے پانو کانپنے لگتے ،پلنگ کی پٹّی پر ٹکے ہوئے وہ اس لمحے کا
منتظر رہتا۔جب وہ ہنسے گی۔ایک اکتا دینے والی بھوک اسے
تڑپانے لگتی اور وہ بے بسی کے عالم میں یکے بعد دیگرے اس کے
رموز کے انکشاف کا تماشا کیا کرتا تاوقتیکہ تنت کا موقع نہ آپہنچتا، اور
کھلے کھلائے پھول کی طرح وہ تپاّ نہ ہو جاتی کہ اس کی گود میں ٹپک پڑے۔
مگر پھر بھی اس کی خواہش پوری طرح سیراب نہ ہوتی۔عورت
اپنے کو اگر تمام تر اس کے سپرد کر بھی دیتی ،تاہم اس کی بھوک پیاس
بدستور باقی رہتی تھی۔جب اولان نئی نئی اس کے گھر آئی تھی تو اس کی
قربت وانگ لنگ کے لیے صحت بخش تھی۔جیسے کوئی جانور اپنے
جوڑے کے پیچھے رہے　　وہ اپنی دُلہن کے ساتھ ساتھ رہتا۔
اس سے ہم بستر ہو کر اسے راحت ہوتی اور جب وہ اپنے کام میں
مصروف ہوتا تو اسے یاد بھی نہ کرتا تھا۔لیکن اسے چھوکری کمل کی محبت
نہ تو اسے سکون عطا کرتی تھی اور نہ اس کی سنگت صحت افزا تھی.
رات کو جب دام لے کر وہ یک بیک وانگ لنگ کے شانے کو ٹھیلتے ہوئے

بدمزاجی سے اُسے دروازے کے باہر کردیتی تو وہ اپنے کو بدستور بھوکا پاتا۔ یہ ویسی ہی بات تھی جیسے کوئی پیاسا سمندر کا نمکین پانی پیے اور یہ پانی اس کی پیاس کو برابر بڑھاتا جائے حتیٰ کہ وہ پیاس کے مارے پاگل ہوکر مرجائے۔ ہر بار کمل کے پاس جاکر اور لطف وصل سے دوچار ہوکر بھی اس کی خواہش میں کمی نہ ہوتی تھی۔

گرمی کا پورا موسم وانگ لنگ نے اسی چھوکری کے پیار میں گزار دیا۔ اسے کچھ نہ معلوم تھا کہ وہ کون ہی اور کہاں سے آئی ہی۔ جب وہ ساتھ ہوتے تو وہ بشکل تمام زبان کھولتا اور نہ اس متواتر تقریر پر کان دیتا جو پھول کی طرح عورت کے منہ سے جھڑا کرتی تھی۔ وہ صرف اس کے چہرے اور ہاتھوں کو، جسم کے حسن کو اور بڑی بڑی مسکراتی ہوئی آنکھوں کی ادا کو دیکھتے ہوئے اس کے حکم کا منتظر رہتا تھا۔ کبھی بھی اس کا جی نہ بھرتا تھا۔ اور صبح جب وہ گھر جاتا تو اس کی خواہش باقی رہتی تھی۔

دن کا کٹنا محال تھا۔ کمرے میں گرمی کا بہانہ کرکے وہ پلنگ پر نہ سوتا تھا۔ بانسوں کی جھرمٹ میں چٹائی ڈال کر وہ وہیں پڑا رہتا اور اگر نیند آتی بھی تو بالکل کچی ہوتی۔ بانس کی پتیوں کے نوکدار سایے کو تاکتے تاکتے اس کے دل میں ایک میٹھا سا درد اٹھتا جس کا سبب معلوم کرنے سے وہ اپنے کو قاصر پاتا۔

اگر کوئی اس سے کچھ کہتا، خواہ یہ اس کے بال بچے ہوں یا مختار چنگ — جو یہ پوچھنے آتا کہ "سیلاب جلد ٹل جائے گا، پھر ہم کس چیز کا بیج بوئیں؟" تو وانگ لنگ ڈانٹ دیتا:۔

"تم میرا سر کیوں کھا رہے ہو؟"

دن رات اس کے جسم میں کسک سی رہتی کیونکہ اس چھوکری سے اس کا جی سیر نہ ہوتا تھا۔

وقت اسی طور پر گزرتا گیا اور وہ ہمیشہ شام کی آمد کا منتظر رہتا تھا۔ اولان یا اپنے بچّوں کے اداس چہروں کی طرف اس کی آنکھ بھی نہ اٹھتی تھی۔ اگر وہ بھولے سے کھیلتے ہوئے بچّوں کے پاس چلا آتا تو ان کا دل بیٹھ جاتا تھا۔ نہ وہ اپنے بڈّھے باپ سے مخاطب ہوتا تھا جو اسے غور سے دیکھ کر بڑبڑانے لگتا:

تجھے ایسی کون سی بیماری لگ گئی ہے کہ روز بروز چڑچڑا ہوتا جاتا ہے اور تیرے بدن کا لہو سوکھتا جاتا ہے؟"

وہ لونڈیا کمل اس سے جو چاہتی کرا لیتی۔ ایک مرتبہ اس نے وانگ لنگ کی چوٹی کا مذاق اڑا کر کہا: "دکن کے لوگ بندر کی سی دُم نہیں رکھتے۔" حالانکہ وانگ لنگ گھنٹوں اپنی چوٹی کی صفائی میں لگایا کرتا تھا، لیکن یہ سنتے ہی وہ چپ چاپ اٹھا اور اسے کٹا آیا۔ یہ واقعہ ہے کہ اس سے پہلے سارے زمانے کی لعن طعن بھی اسے اس کے لیے آمادہ نہ کر سکے تھے۔

یہ دیکھتے ہی بے چاری اولان گھبرا کر چلّائی:

"ہائے تم نے تو زندگی کی زنجیر کاٹ ڈالی!"

مگر وانگ لنگ نے ڈپٹ کر جواب دیا:

"کیا میں تاعمر دقیانوسی دہقانی بنا رہوں؟ شہر کے سب جوان اپنے بال ترشواتے ہیں۔"

حالانکہ دل میں اپنی حرکت پر وہ نادم تھا۔ پر کیا تھا اگر کمل کی فرمائش ہوتی تو وہ بے چون وچرا اپنی جان نچھاور کر دیتا۔ کیونکہ اس کے ذہن میں نسوانی حسن کا جو تخیل تھا وہ اس کی مکمل ترین تصویر تھی۔

پہلے اپنے تندرست بھورے بدن کو وہ کبھی کبھار دھویا کرتا ورنہ معمولی اوقات میں محنت کے پسینے کے غسل کو کافی سمجھتا تھا۔ لیکن اب اسی جسم کا معاینہ وہ اس طرح کرنے لگا گویا یہ کسی غیر کا پنڈا ہو۔ اب وہ روز نہانے لگا۔ اس کی بیوی نے حیران ہوکر کہا:

"اتنا نہاؤ گے تو مرجاؤ گے۔"

بازار سے وہ دساور کا ایک سرخ اور خوشبودار صابن لایا اور اس سے اپنے کو صاف کرنے لگا۔ کوئی اسے لاکھ رُپے دیتا تو بھی وہ اب پیاز یا لہسن نہ کھاتا کہ کہیں کمل اس کی بدبو نہ سونگھ لے۔ اس سے پہلے اُسے یہ چیزیں بہت پسند تھیں۔

گھر میں کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کیا گورکھ دھندا ہے۔

وہ نئے نئے کپڑے خرید لایا۔ اس سے پہلے اولان اس کا لباس تیار کرتی اور اس کی کانٹ چھانٹ اچھی خاصی ہوتی تھی۔ لیکن وانگ کو اب اس کی سلائی یا کٹائی کا انداز پسند نہ تھا۔ لہذا اپنے کپڑے وہ ایک درزی کے ہاں لے گیا اور شہر کے بانکوں کے طریقہ پر ہلکے بھورے ریشم کا کرتہ جو اس کے جسم پر ٹھیک بیٹھتا تھا اور اس پر پہننے کے لیے سیاہ ساٹن کا ایک شلوکا بنوایا۔

زندگی میں پہلی بار اس نے دُکان سے جوتے خریدے۔ مخمل کی یہ چپل ویسی ہی تھی جیسی بوڑھا نواب پہنا کرتا تھا۔

لیکن بیوی بچوں کے آگے یہ فوق البھڑک کپڑے پہنتے اسے شرم آئی۔ بھورے کاغذ کے ایک تاؤ میں انھیں لپیٹ کر وہ چائے خانے کے ایک کارندے کے پاس چھوڑ آتا تھا۔ کچھ انعام لے کر وہ کارندہ وانگ لنگ کو پوشیدہ طور پر ایک کمرے میں تبدیلیٔ لباس کے لیے لے جاتا۔ انھیں پہن کر وہ بالا خانے میں داخل ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے سونا پلائی ہوئی چاندی کی انگوٹھی بھی مول لی تھی۔ اور جب مُنڈی ہوئی پیشانی پر بال آنے لگے تو وہ غیر ملکی تیل کی ایک بوتل ایک ر پے میں لایا اور اسے سر میں لگانے لگا۔

اولان متحیّر ہو کر اسے دیکھتی اور اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا کہ یہ کیا معمّا ہے۔ صرف ایک بار دوپہر کو چاول کھاتے ہوئے اس نے دیر تک اپنے شوہر کو سر سے پانو تک دیکھ کر اداسی سے کہا:

"تم میں کوئی ایسی بات آگئی ہے جو مجھے بڑی حویلی کے نواب زادوں کی یاد دلاتی ہے۔"

یہ سن کر وانگ لنگ زور سے ہنس پڑا اور بولا:

"اگر ہمیں خدا نے دولت دی ہے تو میں بھوتوں کی طرح کیوں رہوں؟"

دل ہی دل میں وہ باغ باغ ہو گیا اور اس دن اس سے پہلے کی نسبت کہیں زیادہ مہر و کرم سے پیش آیا۔

چاندی وہ پانی کی طرح بہا رہا تھا۔ کمل کو شب باشی کی قیمت ہی ادا نہیں کرتا تھا بلکہ اس کی مختلف فرمائشوں کی تکمیل بھی ضروری تھی۔

ایسے موقعوں پر وہ ایسی ٹھنڈی سانسیں اور لمبی آہیں بھرتی گویا کوئی دبی ہوئی خواہش اس کے سینے پر سانپ کی طرح لوٹ رہی ہے:

"اے کاش ـــــ اگر یہ ہو سکتا ـــــ"

اب وانگ لنگ کو اس سے باتیں کرنے کا ڈھب آگیا تھا۔ جھک کر جب وہ آہستہ سے پوچھتا: "میری جان، کچھ کہو تو سہی"۔ تو وہ جواب دیتی: "آج مجھے تمہاری صحبت میں مزہ نہیں آرہا ہے۔ کیونکہ میری پڑوسن نیلم کو اس کے یار نے سونے کی ہیر پن دی ہے اور مجھ مردار کے پاس وہی اماں حوّا کے زمانے کی چاندی کی پن ہے"۔

اب خواہ اس کی جان قربان ہو جائے، مگر وانگ لنگ کان کے پاس سے اس کی سیاہ زلفوں کو ہٹا کر یہ کہے بغیر ہرگز نہیں رہ سکتا تھا کہ

"اپنی پیاری کے لیے میں بھی سونے کی ہیئر پن خریدوں گا"۔

محبّت کے یہ سب القاب کمل نے اسے اسی طرح سکھائے تھے جس طرح کوئی بچّے کو نئے الفاظ سکھاتا ہے۔ جب وہ اُسے یہ پریم پاٹھ پڑھا چکی تو کبھی کبھی گڑبڑا جانے کے باوجود انھیں دہراتے اس کی زبان سوکھتی تھی۔ اور یہ حالت اُس آدمی کی تھی جو ساری عمر گرما و باراں، اور کاشت و اراضی کے سوا اور کسی قسم کی گفتگو سے واقف نہ ہوا تھا۔

دیوار اور صندوق سے روپیہ نکلتا رہا۔ اور وہ اولان جس نے پچھلے دنوں اس روپے پر یقیناً اسے ٹوکا ہوتا، اب دیکھ کر بھی کچھ نہ کہتی تھی۔ اسے دیکھ دیکھ کر اس کا دل خون ہوتا تھا کیونکہ وہ خوب جانتی تھی کہ اس کے شوہر کی زندگی میں کوئی ایسا پہلو پیدا ہو گیا ہے جس کا تعلّق نہ تو گھر بار سے ہے، نہ کھیتی باڑی سے۔ لیکن جس دن

سے وانگ لنگ کو اس کا احساس ہو گیا تھا کہ اولان کے جسم میں یا بالوں میں کوئی حسن نہیں ہے اور اس کے پانو بدنما ہیں، وہ اس سے ڈرنے لگی تھی۔ اس سے کچھ بھی پوچھتے ہوئے وہ خوف کھاتی کیونکہ وانگ لنگ ہمیشہ اس کی طرف سے بھرا رہتا تھا۔

ایک دن وہ بھی آیا جب اولان باؤلی میں کپڑے دھو رہی تھی اس کا شوہر کھیتوں سے ہو کر اس کی طرف آیا۔ کچھ دیر وہ چپ کھڑا رہا۔ پھر سختی سے بولا — اور سختی کی وجہ یہ تھی کہ اس کا ضمیر نادم تھا اور اس ندامت کو وہ دبانا چاہتا تھا — وہ بولا:

"تم نے وہ موتی کیا کیے؟"

جس چٹان پر کپڑے پٹک رہی تھی، اس سے سر اٹھا کر اولان نے خوف زدہ لہجے میں جواب دیا:

"موتی؟ میرے پاس ہیں۔"

وانگ لنگ نے اس کی جھری دار گیلے ہاتھوں کو تاکتے ہوئے زیرِ لب کہا:

"موتیوں کو یوں رکھ چھوڑنا بے کار ہے۔"

"میں نے سوچا تھا کہ کبھی ان کے کرن پھول بناؤں گی۔" پھر اپنے شوہر کی ہنسی کا خیال آتے ہی ڈر کے مارے بات کاٹ کر بولی: "اپنی بیٹی کے بیاہ کے لیے رکھ چھوڑے ہیں۔"

وانگ لنگ نے جی کڑا کر کے اسے دھمکایا:

"اس کالی کلوٹن کو موتیوں کی کیا ضرورت؟ موتی خوب صورت عورتوں کے لیے ہوتے ہیں۔" دم بھر چپ رہ کر وہ یک بیک گرج اٹھا:

"لاؤ مجھے دو — مجھے ان کی ضرورت ہی"
بڑی کشمکش کے بعد اولان کے گیلے جھرّی دار ہاتھ سینے میں گئے اور ایک چھوٹا سا بٹوا نکال کر مرد کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ وہ دیکھتی رہی کہ وہ کس طرح بٹوا کھول کر موتیوں کو ہتیلی پر رولتا ہی اور وہ سورج کی کرنوں میں دمک اٹھتے ہیں اور وانگ لنگ فرطِ مسرّت سے کھِل کھلانے لگتا ہی۔

اولان پھر کپڑوں کی دھلائی میں مشغول ہوگئی۔ اور جب اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی تو اس نے انھیں پونچھنے کی کوشش بھی نہ کی۔ وہ زیادہ زور سے ایک ڈنڈے سے کپڑوں کو پیٹنے لگی، جو پتھر پر پھیلے ہوئے تھے۔



باب ۲۰

یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا اور سارا مال و متاع ٹھکانے لگ جاتا، اگر اسی زمانے میں وانگ لنگ کا چچا بلا اطلاع آنہ دھمکتا ۔ کسی کو اس نے یہ بتانے کی زحمت گوارا نہ کی کہ کہاں رہا ہے یا کیا کرتا رہا ہے۔ دروازے پر وہ یوں آکھڑا ہوا گویا آسمان سے ٹپک پڑا ہے گریبان چاک اور قبا بے بند۔ چہرے میں اس کے سوا کوئی فرق واقع نہ ہوا تھا کہ دھوپ اور لو کی وجہ سے اس پر جھریاں اور سختی آگئی تھی ۔ گھر کے سب لوگ ناشتے کے لیے میز پر بیٹھے ہی تھے کہ چچا جان نے کھسیانی ہنسی ہنس کر گویا انھیں سلام کیا ۔ وانگ لنگ کے ہاتھ کے طوطے اڑ گئے کیونکہ اسے یاد بھی نہ رہا تھا کہ اس کا ایک چچا ہے جو ابھی زندہ ہے۔ گویا کوئی مردہ قبر سے اٹھ آیا ہو۔ بڑے میاں آنکھیں مچمچا کر اسے گھورنے لگے اور تب تک نہ پہچان سکے جب تک اس نے پکار کر نہ کہا:

"بھائی جان ۔ آپ کے بیٹے ،بہو اور پوتوں پر خدا کی رحمت!"

گو وانگ لنگ کا دل اندر سے بیٹھا جا رہا تھا مگر بظاہر اس نے خندہ پیشانی سے کہا:

"آداب چچا جان ۔ آپ ناشتہ تو کر چکے ہوں گے۔"

چچا نے اطمینان سے جواب دیا: "اللہ کا نام لو ۔ میں تمھارے ساتھ ہی کھا لوں گا۔"

ایک کرسی پر بیٹھ کر اس نے پیالی اور چمچے اپنے سامنے کھٹکائے

اور چاول، سوکھی ہوئی نمکین مچھلی، نمکیں گاجر اور سوکھی ہوئی سیموں پر خوب خوب ہاتھ مارے وہ ندیدوں کی طرح کھاتا گیا اور جب تک چاول کے تین پیالے صاف نہ کرچکا اور زور زور سے مچھلی کے کانٹے اور سیم کے بیج دانتوں کے نیچے نہ چبا چکا، کسی نے زبان کھولنے کی جرأت نہ کی۔ کھاپی کر اس نے اس انداز سے گویا یہ اس کا پیدائشی حق ہی، اعلان کیا:

"اب میں آرام کروں گا۔ کیونکہ تین راتوں سے میں سو نہ سکا۔"

وانگ لنگ تو سٹی بھول گیا اور اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ چچا کو وہ اپنے باپ کی خواب گاہ میں لے گیا۔ اس نے توشک اور دلائی کو چھوا، صاف چادروں پر ہاتھ پھیرا۔ مسہری کی لکڑی اور نئی میز کا معائنہ کیا، آرام کرسی پر نگاہ ڈالی اور کہا:

"یہ تو میں نے بھی سنا تھا کہ تم امیر ہو لیکن قیاس بھی نہ کرسکتا تھا کہ ماشاء اللہ ایسے مالدار ہوگئے ہوگے۔" یہ کہہ کر وہ جھٹ پلنگ پر اچک گیا اور کو گرمی کا زمانہ تھا مگر اس نے دلائی سر تک اوڑھ لی اور بے کچھ کہے سنے اس اطمینان سے سوگیا گویا یہ سب سامان اسی کا ہی۔

وانگ لنگ سخت پریشانی کے عالم میں باہر آیا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ اب جو چچا کو اپنے بھتیجے کی خوشحالی کا علم ہوگیا ہی تو دنیا کی کوئی طاقت اسے یہاں سے نہیں نکال سکتی۔ یہ سوچ کر اس کا ہراس ہزار گنا بڑھ گیا کہ اس کی چچی کا ورود بھی جلد ہوگا اور یہ بلا کسی طریقے سے نہیں ٹل سکتی۔

اس کا وسوسہ لفظ بلفظ صحیح نکلا۔ سورج سر چڑھتے تک چچا

خرّاٹے بھرتا رہا۔ پھر زور سے تین مرتبہ جمائی لے کر اپنی بیداری کا اعلان کرنے کے بعد کپڑوں کو جوں توں کر کے ٹھیک کرتے ہوئے وہ کمرے سے نکلا اور وانگ لنگ سے کہا:

"اب میں جا کر اپنی بیوی اور بیٹے کو بھی لے آؤں۔ اب ہم تین ہی رہ گئے ہیں۔ اور تمھاری حویلی میں ہمارے لیے مٹھی بھر اناج اور موٹے جھوٹے کپڑے کا کال کیوں کر ہو سکتا ہے؟"

وانگ لنگ لال پیلی آنکھیں دکھانے کے سوا کر ہی کیا سکتا تھا۔ کیونکہ کسی کھاتے پیتے کے لیے اس سے بُری بات کیا ہو سکتی ہے کہ اپنے چچا اور اس کے متعلقین کو گھر میں جگہ دینے سے انکار کر دے۔ وانگ لنگ جانتا تھا کہ دولت کی وجہ سے گاؤں میں آج جو اس کی عزّت ہے، وہ ایسا کرتے ہی ختم ہو جائے گی۔ اس لیے وہ کچھ کہنے کا حیاؤ نہ کر سکا۔ اپنے مزدوروں کو اس نے نئے گھر سے یک لخت اُٹھ جانے کا حکم دیا جس کی وجہ سے دروازے سے لگے ہوئے کمرے خالی ہو گئے۔ اسی شام کو چچا معہ اہل و عیال ان پر قابض ہو گیا۔ اب وانگ لنگ کے غصّے کا حد و حساب نہ تھا، کیونکہ زبان سے وہ خوش آمدید اور لبوں سے تبسّم کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکتا تھا اور غصّہ پی جانے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اپنی چچی کے گول مٹول چہرے کو دیکھ کر وہ قابو سے باہر ہو جاتا تھا اور اپنے چچا زاد بھائی کی گستاخ اور ذلیل ہیئت کو دیکھ کر وہ بشکل اپنے ہاتھ کو روک سکا جو اسے چپت رسید کرنے کے لیے آگے بڑھا تھا۔ اس کے غصّے کا یہ حال تھا کہ تین دن اس نے شہر کا رخ نہ کیا۔

جب وہ سب اس بلائے آسمانی کے عادی ہو گئے اور اولان نے کہا کہ "غصّے سے کیا حاصل، یہ مصیبت برداشت کرنی ہی ہے" تو وانگ لنگ نے محسوس کیا کہ وہ روٹی کپڑے کی خاطر یہ بے بلائے مہمان، اس سے جھک کر پیش آرہے ہیں۔ اب تو کمل بائی کی یاد نے اسے بُری طرح ستایا اور اس نے سوچا کہ "اگر کسی کے گھر پاگل کتوں نے ڈیرا ڈال دیا ہو تو اسے سکون باہر ہی مل سکتا ہے۔"

دیرینہ درد اور پرانی خواہشات ازسرِ نو جاگ اٹھیں اور اس کی محبت کو کسی طرح چین نہ آیا۔

جس چیز کو اولان کی سادگی، باپ کی نابینائی اور چنگ کی دوستی نہ دیکھ سکی تھی، اسے چچی ایک ہی نظر میں بھانپ گئی اور اس نے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو کر کہا:

"وانگ لنگ کہیں کوئی پھول سونگھنے کی فکر میں ہے" جب اولان کی سمجھ میں نہ آیا اور اس نے بیچارگی سے چچی کی طرف دیکھا تو چچی نے قہقہہ لگایا: "تم تو بیج گننے کے لیے خربوزہ کٹوانا چاہتی ہو! صاف الفاظ میں معاملہ یہ ہے کہ تمھارا شوہر کسی دوسری عورت کے پیچھے دیوانہ ہے۔"

محبت کا مارا وانگ لنگ اپنے کمرے میں ایک صبح تھکا ہارا غنودگی کی حالت میں لیٹا ہوا تھا کہ اس نے چچی کو دالان میں یہ باتیں کرتے سنا۔ اس عورت کی تیز نگہی پر وہ حیرت زدہ رہ گیا اور چوکنا ہو کر اس کی گفتگو سننے لگا۔ چچی کے بے ڈول گلے سے الفاظ یوں نکل رہے تھے جیسے مینہ ٹپک رہا ہو۔

"میں بھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکی ہوں۔ اگر کوئی مرد بیک کنگھی چوٹی کرنے لگے، نئے کپڑے خریدے اور مخمل جوتے پہنے تو یقین جانو کہ یہ سب کسی نئی عورت کے لیے ہے۔"

اولان کی زبان سے کوئی ٹوٹا ہوا جملہ نکلا جسے وانگ لنگ نہ سن سکا۔ مگر چچی کو جواب میں دیر نہ لگی:

نادان لڑکی۔ کیا تو سمجھتی ہے کہ کوئی مرد ایک ہی عورت کی مالا ساری عمر جپا کرے گا۔ خصوصاً اس حال میں کہ عورت نے اس کی خدمت میں اپنے تن بدن کا خیال نہ رکھا ہو، مرد کا دل اس سے نہیں لگ سکتا۔ ایسی حالت میں اس کا دھیان فوراً کہیں اور بٹ جاتا ہے۔ اور تو تو ایسی بیوقوف ہے کہ ہمیشہ جانوروں کی طرح مرد کی خدمت کرتی رہی اور اس قابل ہی نہیں کہ اسے اپنی طرف کھینچ سکے۔ اگر اس کے پاس دام ہیں اور وہ کوئی نئی نویلی گھر میں ڈالنا چاہتا ہے تو تیری توبہ تِلّا فضول ہے کیونکہ سبھی مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ تو خیر ہی ہوئی کہ میرے نکھٹو میاں کے پاس کبھی زیادہ رُپے نہیں ہوئے ورنہ وہ بھی یہی کرتے!"

چچی کی بکواس کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن وانگ لنگ کے خیالات کا تار ان الفاظ پر اٹک گیا اور اس نے اس کے بعد کچھ نہیں سنا۔ اچانک اسے معلوم ہو گیا کہ اپنی محبت کی بھوک پیاس کو کیوں کر رام کرے۔ بس اسے خرید کر گھر کیوں نہ لے آؤں۔ پھر وہ یکسر میری ہو جائے گی اور کوئی دوسرا مرد اس کے قریب پھٹک بھی نہ سکے گا۔ پھر میں جی بھر کر اس کا رس پی سکوں گا۔ جھٹ پٹ

بستر سے اُٹھ وہ باہر آیا اور چپکے سے اٹھ کر اپنی چچی کو اشارہ کیا۔ جب وہ دروازے سے نکل کر کھجور کے پیڑ کے تلے اس کے پیچھے پیچھے آگئی جہاں کوئی ان کی باتیں نہ سن سکتا تھا تو وانگ لنگ بولا:

"آپ دالان میں ابھی ابھی جو کچھ کہہ رہی تھیں وہ میں نے سنا۔ آپ کا فرمانا بالکل درست ہے۔ اور جب میرے کھانے بھر کو ہے تو میں ایسا کیوں نہ کروں؟"

چچی نے بلائیں لے کر چکنی چپڑی آواز میں کہا:

اس میں ہرج ہی کیا ہے؟ سبھی امیر یہ کرتے ہیں۔ صرف کنگال محتاج تا عمر ایک آب خورے سے پانی پینے پر مجبور ہیں"

وہ خوب سمجھتی تھی کہ جواب میں وانگ لنگ کیا کہے گا:

لیکن میری خاطر بیچ میں پڑ کر معاملہ کون پٹائے گا؟۔ مرد کسی عورت سے یہ جا کر کہنے سے رہا کہ آؤ میرے گھر کو آباد کرو۔"

چچی کو جواب دیتے دیر نہ لگی:

"یہ معاملہ تم میرے سپرد کر دو۔ بس مجھے اتنا بتا دو کہ یہ عورت کون ہے۔ پھر میں سب ٹھیک کر لوں گی۔"

وانگ لنگ کو اس کا نام لیتے ہوئے تامل ہوا کیونکہ آج تک اس نے زور سے اس کا ورد نہ کیا تھا:

" اس کا نام کمل بائی ہے۔"

اسے یقین کامل ہو گیا تھا کہ ساری دنیا اس نام سے واقف ہے، حالانکہ ابھی دو ماہ پہلے خود اسے اس کے وجود کا علم نہ تھا۔ لہذا جب چچی نے زیادہ تفصیل دریافت کی تو وہ کچھ کبیدہ خاطر ہوا۔

"وہ کہاں کی رہنے والی ہی؟"
وانگ لنگ نے تلخی سے کہا: "شہر کی صدر سڑک کے نئے چائے خانے کے سوا وہ کہاں رہ سکتی ہی۔"
"وہی چائے خانہ جس کا نام پھول گھر ہی؟"
"اور کیا؟" وانگ لنگ نے چڑچڑے پن سے جواب دیا۔
اپنے نچلے ہونٹ کو سہلاتی ہوئی وہ دم بھر کے لیے سوچ میں پڑ گئی اور پھر بولی: "وہاں میں کسی کو نہیں جانتی۔ کوئی ذریعہ تلاش کرنا ہوگا۔ اس گھر کی مالکن کا نام کیا ہی؟"
جب اسے معلوم ہوا کہ وہ بڑی حویلی کی باندی کویل بائی ہی تو چچی کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔
"ارے وہ چھیل چھبیلی! بوڑھے نواب کے مرتے ہی اس نے یہ پیشہ اختیار کیا۔ اس سے اسی کی توقع بھی تھی۔"
"ہی ہی۔ ہی ہی" کہہ کر وہ ہنس پڑی اور پھر اطمینان سے بولی:
"یہ معاملہ بہت آسانی سے طے ہو جائے گا۔ راستہ صاف ہی۔ وہ تو ایسی ہی کہ اگر اس کے ہاتھ میں چاندی رکھ دی جائے تو پہاڑ کو پانی کر دے۔"
یہ سنتے ہی وانگ لنگ کا حلق خشک پڑ گیا اور اس نے کان میں کہا:
"چاندی ہو یا سونا مجھے اس کی پروا نہیں! اس کی قیمت ادا کرنے کے لیے میں اپنی ساری زمین بیچنے کو تیار ہوں۔"
جب تک یہ معاملہ طے نہ پا جائے۔ وانگ لنگ نے

چائے خانے نہ جانے کا تہیہ کر لیا۔ جذبۂ محبت کا یہ ایک عجیب اور مختلف پہلو تھا۔ دل میں اس نے سوچا :

"لیکن اگر وہ آنے پر رضامند نہ ہوئی" —— یہ خیال آتے ہی اس کے قلب کی دھڑکن بند سی ہوگئی اور وہ بار بار چچی کے پاس بھاگا جاتا اور کہتا : " ریوں کی کمی کی وجہ سے وہ ہاتھ سے نہ نکل جائے "۔ پھر وہ پوچھتا : " آپ نے کویل بائی کو یہ جتا دیا یا نہیں کہ میرے پاس دھن مال کی کمی نہیں ..... کمل بائی سے کہہ دیجیے گا کہ یہاں اسے کوئی کام نہ کرنا ہوگا۔ وہ رانی بنی بیٹھی رہے گی، ریشم پہنے گی اور موتی چگے گی"۔ اس کی اس متواتر بکواس کو سنتے سنتے بڑی بی کا کلیجہ پک گیا اور اس نے دیدے نکال کر اسے ڈانٹ پلائی :

بس بھی کرو! کیا مجھے کوئی احمق گردانا ہے یا زندگی میں پہلی بار میں اس قسم کا معاملہ پٹا رہی ہوں؟ تم چپ رہو تو میں سب ٹھیک کر دوں گی۔ یہ سب میں بار بار اُن سے دُہرا چکی ہوں"۔

اب وانگ لنگ کو تارے گننے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ گھر کو وہ کمل بائی کی نظر سے دیکھنے لگا اور اولان کو جھاڑنے صاف کرنے اور میز کرسیوں کو یہاں سے وہاں رکھنے کی مہم پر دوڑانے لگا۔ اس بے چاری کے خوف وہراس میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا۔ کیونکہ گو کہ وہ کچھ نہ کہتا تھا لیکن اولان اب خوب جانتی اور سمجھتی تھی کہ اس پر عنقریب کیا بیتنے والی ہے۔

اب اولان کے ساتھ سونا وانگ لنگ کو گوارا نہ تھا۔

اس نے سوچا کہ گھر میں جب دو عورتیں ہوں تو نئے کمروں اور ایک دالان کی تعمیر ضروری ہی۔ اپنی محبوبہ کے ساتھ اسے تخلیے کی بھی ضرورت ہوگی۔ اس لیے اس دوران میں کہ چچی منزل مقصود کو سر کرے، اس نے اپنے مزدوروں کو حکم دیا کہ بچلے کمرے کے پیچھے ایک بڑا سا دالان اور آزو بازو ایک ایک بڑا اور دو چھوٹے چھوٹے کمرے بنائیں۔ مزدور اس کا منہ تکتے رہ گئے لیکن انھیں مزید دریافت کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ وانگ لنگ نے ان سے اور کچھ تو نہ کہا لیکن خود ان کے کام کی نگرانی کرنے لگا تاکہ چینگ سے بھی کچھ کہنا نہ پڑے۔ مزدوروں نے کھیتوں سے مٹی لا لا کر گارا تیار کیا اور اس سے دیواریں بنائیں اور وانگ لنگ نے شہر سے کھپریل منگوائی۔

جب کمرے بن گئے اور زمین فرش کے لیے ہموار کرلی گئی، تو آدمیوں نے اینٹوں کو چونے سے بٹھا کر مکمل بائی کے لیے پکّا فرش تیّار کیا۔ دروازے کے پردوں کے لیے وانگ لنگ نے سرخ کپڑا خریدا۔ ہر بازو کے لیے اس نے ایک ایک میز اور دو کام دار کرسیاں لیں۔ پہاڑیوں اور ندیوں کے منظر کی دو تصویریں لینا بھی وہ نہ بھولا تاکہ میز کے پیچھے دیوار پر ٹنگی رہیں۔ لاکھ کا کام کی ہوئی گول سی رکابی ایک سرپوش کے ساتھ مول لایا اور اس میں بھانت بھانت کی مٹھائیاں چن کر میز پر رکھدیں۔ ایک لمبا چوڑا مزیّن اور منقش پلنگ منگایا اور اس کے آس پاس پھول دار پردے لٹکائے گئے۔ لیکن اس انتظام میں

اولان سے مدد مانگتے اسے شرم آئی۔ اس لیے شام کو اس کی چچی آتی اور وہ سب کام کر دیتی جس کی توقع کسی مرد کے بھونڈے پن سے نہیں کی جا سکتی۔

یہ سب کچھ ہو گیا اور پورا ایک مہینہ بیت چکا مگر اب تک اصل مقصد کی تکمیل نہ ہو سکی۔ وانگ لنگ اکیلا اس نئے گھر میں چہل قدمی کیا کرتا تھا۔ اب اس نے دالان کے بیچوں بیچ چھوٹا سا حوض بنانے کا ارادہ کیا اور اس خدمت پر ایک مزدور کو مامور کیا جس نے تین مربع فیٹ زمین کھود کر اس میں پچّی کاری کی اور وانگ لنگ نے اس میں سنہری مچھلیاں چھوڑ دیں۔ اس کے بعد اس کے لیے کوئی کام باقی نہ رہا اور وہ بیتابی سے انتظار کرنے لگا۔

اس دوران میں اگر اس نے کبھی زبان کھولی بھی تو وہ بچّوں کو دھمکانے کے لیے اگر ان کی ناک میلی ہوتی، یا اولان کو دھمکانے کے لیے اگر وہ کئی کئی روز اپنے بال درست نہ کرتی۔ آخر کار ایک صبح کو اولان رو پڑی اور اس طرح زار زار روئی کہ وانگ لنگ نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ فاقہ کشی کے زمانے میں بھی کبھی وہ یوں نہ روئی تھی۔ اس لیے اس نے ڈانٹ کر پوچھا:

"تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ کیا تم اپنے جھنٹوروں کو اس ہائے پکار کے بغیر صاف نہیں رکھ سکتیں؟"

لیکن اولان سسکیاں بھر کر صرف یہی کہے جاتی تھی:

"میں تمھارے بیٹوں کی ماں ہوں ——— میں تمھارے بیٹوں کی ماں ہوں۔"

وانگ لنگ کی زبان پر تالا پڑ گیا اور وہ بےچین ہوکر آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا۔ اولان کے آگے اس کا سر ندامت سے جھک گیا اور وہ اس سے کترانے لگا۔ یہ سچ ہے کہ قانونًا اسے اپنی بیوی پر الزام رکھنے کا کوئی حق نہ تھا۔ کیونکہ اس نے اسے تین تین تندرست بیٹے دیئے تھے۔ اپنی خواہش کے علاوہ اس کے پاس اس رویے کا کوئی جواب نہ تھا۔

یہ حالت تھی کہ ایک روز چچی نے آکر مژدہ سنایا:

"معاملہ پٹ گیا۔ چائے خانے کے مالک کی طرف سے جو چودھراین مقرر ہے وہ سو رُپے لے گی۔ کمل بائی پتّے کے کرن پھول اور پنے اور سونے کی انگوٹھی، ساٹن اور ریشم کے دو دو جوڑے۔ ریشمی لحاف اور ایک درجن جوتے طلب کرتی ہے۔"

وانگ لنگ نے صرف یہ سنا کہ "معاملہ پٹ گیا"۔ اور اس نے خوشی سے اچھل کر کہا: "وہ جو مانگے دے دو ——— فوراً دے دو۔"
اندر جاکر وہ رُپے کی تھیلی لایا اور خفیہ طور پر اس کے ہاتھ میں گننے لگا۔ کیونکہ وہ یہ نہ چاہتا تھا کہ برسوں کی کمائی کے یوں ضائع ہونے کا تماشا لوگ دیکھیں۔ سب دے دلا کر چچی سے اس نے کہا:
"اس میں سے دس رُپے آپ کی نذر ہیں۔"

بڑی بی نے ظاہری انکار کرتے ہوئے توند پھیلا کر اور سر ہلا کر کہا:

"یہ ہرگز نہ ہوگا۔ ہم تم ایک ہی لڑی کے موتی ہیں اور تم میں مجھ میں تو ماں بیٹے کا رشتہ ہے۔ مجھے رُپے پیسے سے کیا مطلب،

محض تمھاری خاطر منظور ہی۔" لیکن وانگ لنگ نے جب دیکھا کہ اس ناہ نوہ کے ساتھ بڑی بی کا ہاتھ بھی پھیلا ہوا ہی تو اس نے فوراً یہ رقم اس کے ہاتھ پر رکھ دی اور اس کا اسے کوئی غم نہ ہوا۔

بازار جاکر وہ سور اور گائے کا گوشت، مچھلی، بانس کی جڑ اور میوہ لایا۔ دکنی پرندوں کے سوکھے ہوئے گھونسلے شوربے کے لیے اور سوکھی ہوئی شارک مچھلی کے پر —— غرض کہ تمام نعمتیں جن سے وہ واقف تھا خرید لایا اور اگر اس پُرسوز تپش انگیز بیتابی کو انتظار کہہ سکیں تو وہ انتظار میں محو ہو گیا۔

اور آخر گرما میں آٹھویں مہینے کے ایک روز روشن کو وہ اسکے گھر آئی۔ وانگ لنگ نے دور سے اس کے محمل کو دیکھا۔ بانس کی ایک آرام کرسی پر وہ دراز تھی اور کچھ مرد اسے اُٹھائے لا رہے تھے کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر یہ کرسی جھونکے کھا رہی تھی، اور اس کے پیچھے کویل بائی گامزن تھیں۔ لمحہ بھر کے لیے اس کا دل گھبرایا اور اس نے سوچا:

"اپنے گھر میں کسے لا رہا ہوں؟"

بے سمجھے بوجھے فوراً اس کمرے میں جاکر اس نے اپنے کو بند کر لیا جہاں اتنے عرصے سے اپنی بیوی کے ساتھ سویا کرتا تھا۔ اور اندھیرے میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے منتظر رہا۔ اتنے میں اس نے چچی کی آوازیں سنیں جو اسے پکار رہی تھی کہ دروازے پر کوئی مہمان کھڑا ہی۔

جب وہ نکلا تو بار ندامت سے یوں خم تھا گویا کمل کو پہلی بار

دیکھ رہا ہو۔ آہستہ قدم، شاندار لباس میں گردن جھکی ہوئی اور آنکھیں دائیں بائیں بھٹکتی ہوئیں۔ لیکن کوئل بائی نے ہنس کر اس سے کہا:

"کسے خبر تھی کہ ہم میں ایسا معاملہ بھی ہوگا!"

پالکی کے پاس جا کر اس نے چلمن اٹھائی اور آنکھ مار کر بولی:

"آؤ جی بیگم! یہ ہے تمھارا گھر اور یہ ہیں تمھارے آقا!"

کہاروں کے چہرے پر دانگ لنگ نے جب مسکراہٹ دیکھی تو وہ گویا انگاروں پر لوٹنے لگا: "یہ شہر کے غنڈے ہیں اور یقیناً نابکار ہیں۔" اپنے چہرے کی سرخی کو محسوس کر کے اسے اور بھی الجھن ہوئی اور اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔

جب چلمن اٹھی تو اس نے پالکی کے ایک کونے میں اپنی جانِ جاں کو کنول کے پھول کی طرح شگفتہ و نازک، بیٹھے دیکھا۔ وہ سب کچھ بھول گیا، ان شہری بدمعاشوں سے اس کا غصہ بھی ٹھنڈا پڑ گیا۔ صرف اتنا یاد رہا کہ اس عورت کو وہ خرید لایا ہے اور وہ ہمیشہ کے لیے اس کی ہے۔ بے حرکت و بے لرزاں وہ اسے دیکھنے لگا اور جب وہ ادائے خاص سے اٹھی تو محسوس ہوا کہ پھول پر سے ہوا کا جھونکا گزر گیا۔ وہ ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا کہ کس طرح کمل کوئل کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر نیچے اتری۔ چلتے وقت اس کا سر خم اور پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور کوئل بائی پر سہارا دے کر وہ ننھے ننھے پنجوں کے بل سنبھلتی لڑکھڑاتی آگے بڑھی۔ دانگ لنگ کے پاس سے گزرتے ہوئے بھی وہ اس سے ہم سخن نہ ہوئی۔ دبی زبان میں کوئل بائی سے بس اتنا پوچھا: "میری رہایش گاہ کدھر ہے؟"

اب چچی آگے آئی اور دونوں عورتیں اسے بیچ میں لے کر دالان

اور نئے کمروں میں لے گئیں جو وانگ لنگ نے اس کے لیے بنوایا تھا
یہ تماشا دیکھنے کے لیے وانگ لنگ کے گھر میں کوئی موجود نہ تھا کیونکہ چنگ
اور مزدوروں کو اس نے دن بھر کے لیے دور دراز کے کسی کھیت پر بھیج دیا
تھا۔ اپنے شیر خوار بچوں کو لے کر اولان معلوم نہیں کہاں چلی گئی تھی۔
دونوں لڑکے اسکول گئے ہوئے تھے اور بڈھا سر دیوار اونگھ رہا تھا نہ کچھ
دیکھ سکتا تھا نہ سن سکتا تھا۔ لے دے کر ایک پگلی لڑکی رہ گئی تھی جو اپنے
والدین کے علاوہ کسی کو نہ پہچانتی تھی اور جسے کسی کے آنے جانے کی خبر نہ
ہوتی تھی۔ تاہم کمل کے اندر داخل ہوتے ہی کویل بائی نے پردے کھینچ دیئے۔

تھوڑی دیر بعد چچی خفیف سا معاندانہ تبسم لیے ہوئے باہر آئی اور اس نے
اپنے ہاتھ یوں پونچھے گویا اس سے میل چھڑا رہی ہو۔ قہقہہ مار کر وہ بولی:
اس پر رنگ و روغن کے تودے چڑھے ہوئے ہیں۔ کسبیوں کی
سی بدبو دیتی ہے!" اب اس کے تیور اور بھی تیکھے ہو گئے:" میاں نہ وہ
ایسی کم عمر ہے! میں تو یہی کہوں گی کہ اگر اس کی عمر اتنی نہ ڈھل گئی ہوتی
کہ عنقریب مرد اسے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں گے تو دنیا کا سارا کپڑا لتّا
اور سونا روپا اسے کسی کسان کے گھرانے کے لیے آمادہ نہ کرتا خواہ
یہ کسان خوش حال ہی کیوں نہ ہو!" اس صاف گوئی سے وانگ لنگ
کے چہرے پر ناخوشی کے آثار دیکھ کر چچی نے فوراً پہلو بدل دیا:" لیکن
اس کی خوب صورتی میں کوئی شک نہیں۔ آج تک میں نے ایسی پیاری
شکل نہیں دیکھی۔ اور ہوانگ گھرانے کی اس بدصورت باندی کے ساتھ
ساری عمر بتانے کے بعد تو تمھیں اس کی صحبت میں وہی مزا ملے گا
جو تیوہار کے پلاؤ میں ہوتا ہے۔"

مگر وانگ لنگ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ مکان میں یہاں وہاں پھرکی کی طرح گھومتا رہا اور ایک جگہ بیٹھنا اس کے لیے محال ہو گیا۔ بالآخر ہمت باندھ کر اس نے لال پردہ ہٹایا اور کمل بائی کے پاس دن بھر پڑا رہا۔

سارے وقت اولان گھر کے قریب پھٹکی بھی نہیں۔ تڑکے ہی ایک بیلچہ اٹھا کر گوبھی کے پتوں میں کچھ کھانا لپیٹ کر بچوں کے ساتھ وہ باہر نکل گئی تھی۔ دن بھر وہ گھر نہ لوٹی۔ لیکن جب رات ہوئی تو تھکی ہاری مٹی میں اٹی ہوئی وہ بچوں کے ساتھ واپس آئی۔ وہ سب خاموش تھے اولان نے باورچی خانے میں جا کر کھانا پکایا اور حسب دستور اسے میز پر چن دیا۔ بڑے میاں کو بلا کر اس نے بانس کی تیلیاں ان کے سامنے رکھیں، پگلی لڑکی کو کھلایا، اور آخر میں بچوں کے ساتھ خود بھی کچھ زہر مار کیا۔ جب سب سو گئے اور وانگ لنگ اب بھی میز پر بیٹھا سپنوں کا تانا بانا بنتا رہا، تو اولان ہاتھ منہ دھو کر خوابگاہ میں چلی گئی اور تن تنہا بستر پر سو رہی۔

اب وانگ لنگ صبح و شام داد نشاط دینے لگا۔ ہر روز وہ کمل کے کمرے میں جاتا اور بیٹھا بیٹھا اس کی ہر ادا کا نظارہ کیا کرتا۔ اوائلِ خزاں کی گرمی میں وہ کبھی باہر نہ آئی۔ وہ ہمیشہ پلنگ پر سوار رہتی اور کویل بائی گنگنے پانی سے اس کے جسمِ نازنین کو نہلا کر اس پر ابٹن اور عطر لگاتی اور سر میں تیل پھلیل ڈالتی۔ کمل کی ضد تھی کہ کویل بائی اس کی خدمت پر رہے اور کیونکہ اسے منہ مانگی اجرت ملتی تھی اس لیے اسے بھی بیس کی بجائے ایک کی ٹہل زیادہ پسند آئی۔ چنانچہ یہ دونوں سب سے

الگ تھلگ نئے کمروں میں رہا کرتی تھیں۔

دن بھر وہ چھوکری کمرے کی خنک تاریکی میں پڑی پھل اور مٹھائیاں کھایا کرتی۔ ہلکے سبز ریشم کے کرتے پر تنگ سی انگیا اور ایک ڈھیلے پائجامے کے علاوہ وہ کچھ نہ پہنتی تھی۔ وانگ لنگ جب آتا اسے اسی دھج میں پاتا اور جی بھر کر اس کا رس پیا کرتا تھا۔

شام کو میٹھی سی جھڑکی دے کر وہ اسے باہر کر دیتی تھی۔ پھر کوئل بائی اسے نہلا دھلا کر نئے لباس میں آراستہ کرتی۔ نرم نرم سفید ریشم نیچے اور بسنتی رنگ کا ریشم باہر —— یہ سب وانگ لنگ کی دین تھی —— اور پانوں میں زرّین جوتیاں۔ اس سنگھار پٹار کے بعد وہ دالان میں خرامِ ناز سے آتی اور حوض کی مچھلیوں کا نظارہ کرتی۔ ادھر وانگ لنگ اس معجزے کو ٹکر ٹکر دیکھا کرتا وہ اپنے ننھے پانو پر جب جھولا سا جھولتی تو وانگ لنگ کو محسوس ہوتا کہ ساری دنیا میں ان سڈول پانو اور نازک کلائیوں سے زیادہ حسین کوئی چیز نہیں۔

اور وہ بلا شرکت غیرے وصل کے مزے لوٹتا تھا اور پہلے کی طرح غیر مطمئن نہ رہتا تھا۔



باب ۲۱

یہ کیسے ممکن تھا کہ وانگ لنگ کے گھر کمل اور اس کی باندی کوئل کا ڈیرا پڑ جائے اور کسی قسم کی حجت و تکرار کی نوبت نہ آئے۔ کیونکہ دو عورتوں کا ایک گھر میں جمع ہونا بدامنی کا پیش خیمہ ہے۔ لیکن وانگ لنگ کو اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ حالانکہ اولان کی تیکھی چتونوں اور کوئل کی جلی کٹی باتوں سے وہ تاڑ گیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے، مگر اس نے اِدھر توجہ نہ کی اور جب تک اس کی شہوت کی آگ بھڑکتی رہی وہ ان چھوٹی موٹی چیزوں کی پروا نہ کر سکا۔

پھر بھی جب صبح و شام گزرتے گئے اور ہر آن، ہر لمحہ کمل وہاں موجود ہوتی کہ آنکھ کا اشارہ ہوتے ہی اس کی آغوش شوق میں آ جائے تو اس کا جی کچھ جھکنے لگا اور اب ان معاملات پر بھی اس کی نظر پڑنے لگی جنھیں وہ پہلے نہ دیکھ سکتا تھا۔

پہلی ہی نظر میں وہ بھانپ گیا کہ اولان اور کوئل میں چلی ہوئی ہے۔ اس سے اسے سخت حیرت ہوئی۔ کمل کے تئیں اولان کے جلاپے کو وہ سمجھ سکتا تھا کیونکہ ایسے کئی واقعات اس کے علم میں آ چکے تھے۔ جب شوہر کوئی داشتہ گھر ڈال لیتا تو بعض عورتیں خودکشی کر لیتی تھیں اور بعض اس کی زندگی اجیرن کرنے کے درپے ہو جاتی تھیں۔ وانگ لنگ کو اس کا اطمینان تھا کہ اولان کم سخن ہے اور ایسی نہیں کہ اسے طعنے کوسنے دیا کرے۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کمل

کو تو کچھ کہتی نہیں لیکن دل کا سارا بخار کوئل پر اتارتی ہے۔

وانگ لنگ نے صرف کمل بائی کا انتظام کیا تھا۔ مگر اس نے آرزو منّت کی کہ "للّٰہ، اسے میری خدمت میں رکھ لو۔ میں دنیا میں بالکل اکیلی ہوں کیونکہ جب میں گھٹنوں چلتی تھی۔ میرے ماں باپ مر گئے تھے۔ اور مجھ پر جوبن آتے چچا نے مجھے بیچ کر ٹکے کھرے کر لیے تھے۔ اس کے بعد دنیا میں میرا کوئی نہ رہا۔"

یہ کہتے وقت اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کیونکہ ان حسین آنکھوں سے جب وہ چاہتی آنسو نکال لیتی تھی۔ جب وہ اس معصومیت سے اس سے کسی چیز کی طلب کرتی اور وہ یوں عاجزانہ اسے دیکھتی تو وانگ لنگ کے لیے انکار ناممکن تھا۔ پھر یہ بھی سچ تھا کہ اس کی خدمت کے لیے کسی نہ کسی کا ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اولان اس کی بات بھی نہ پوچھے گی، بولنا تو دور رہا یہ سن گن بھی نہ لے گی کہ وہ اسی گھر میں ہے یا کہیں اور۔ کمل کا چچا تھا سو وانگ لنگ کو یہ ہرگز پسند نہ آیا کہ وہ ہمیشہ تاک جھانک کرتا رہے اور کمل سے اس کی باتیں کیا کرے۔ لے دے کر ایک کوئل بائی رہ گئی تھی اور اس کے سوا کوئی عورت نہ تھی جو آنے کے لیے آمادہ ہو۔

لیکن کوئل کو دیکھتے ہی اولان کے غصّے کا طوفان اس زور شور سے اٹھا جیسے وانگ لنگ نے کبھی نہ دیکھا تھا اور جو اس کی فہم سے بالاتر تھا۔ کوئل میل جول کے لیے تیار تھی کیونکہ بہرحال وہ وانگ لنگ کی ملازمہ تھی۔ لیکن وہ یہ نہ بھول سکی کہ بڑی حویلی میں جب وہ بڈّھے نواب کی داشتہ تھی تو اولان کا درجہ ایک معمولی لونڈی

سے بڑا نہ تھا۔ اولان کو پہلی بار دیکھ کر اس نے کہا:

"اوہو، میری پُرانی سہیلی! ہم پھر ایک جگہ جمع ہو گئے ——— لیکن قسمت کی خوبی دیکھو کہ اب تم گھر کی مالکن اور بڑی بیگم ہو ——— میری ماں کی جگہ ہو۔ زمانہ بھی کس طرح بدلتا ہے۔"

اولان اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی اور جب اس کی سمجھ میں آیا کہ یہ کون ہے تو جواب دیے بغیر اس نے کاندھے سے پانی کی گگری اتار کر ایک طرف رکھ دی اور دیوان خانے کا رخ کیا۔ جہاں وانگ لنگ وہ گھڑیاں گزارتا تھا جن کی فرصت اسے محبت دیتی تھی۔ جاتے ہی اولان نے تڑاخ سے پوچھا:

یہ غلام زادی ہمارے گھر کیا کرنے آئی ہے؟"

وانگ لنگ بغلیں جھانکنے لگا۔ جی تو یہ چاہا کہ تحکمانہ انداز میں کہہ دے: "یہ میرا گھر ہے، جسے چاہے بلاؤں گا، تم دخل دینے والی ہوتی کون ہو؟" لیکن اولان کا سامنا ہوتے ہی وہ دل میں شرما جاتا تھا۔ پھر یہ بھی تھا کہ اس ندامت پر وہ ناراض بھی ہوتا تھا، کیونکہ اس کی عقل کہتی کہ شرمانے کی بات ہی کیا ہے۔ ہر روپے والا یہی کرتا ہے۔

اس کے باوجود اس سے بولتے نہ بنا۔ دائیں بائیں دیکھتے ہوئے وہ یوں بن گیا گویا پائپ کہیں رکھ کر بھول گیا ہے اور اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ لیکن اولان وہیں اٹل کھمبے کی طرح ڈٹی رہی اور منتظر رہی کہ وہ جواب دے۔ جب وہ کچھ نہ بولا تو اولان نے اسی لہجے میں دُہرایا:

"یہ غلام زادی ہمارے گھر کیا کرنے آئی ہی؟"

جب وانگ لنگ نے دیکھا کہ بے جواب لیے وہ نہ مانے گی، تو دھیرے سے کہا:

"اس سے تمھیں کیا غرض؟"

اولان بولی: "بڑی حویلی میں پوری جوانی میں نے اس کی ڈانٹ پھٹکار سنتے گزاری تھی۔ بار بار وہ باورچی خانے میں گھس کر سرکار کے لیے چائے بناؤ ــــ سرکار کے لیے کھانا لاؤ" کا شور مچایا کرتی تھی۔ ہمیشہ وہ بڑبڑایا کرتی کہ یہ چیز بہت گرم ہی، یہ بالکل ٹھنڈی ہی، یہ بدمزہ ہی۔ کبھی کہتی تو کاہل ہی، بدشکل ہی، یہ ہی وہ ہی ــــ"

وانگ لنگ کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے، وہ چپ رہا۔

اولان کھڑی رہی اور جب اس کے شوہر نے کچھ نہ کہا تو اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور وہ انھیں ضبط کرنے کی ہزار کوشش کرنے لگی۔ آخر کار سر دامن سے آنکھوں کو پونچھ کر اس نے کہا:

"اپنے گھر میں مجھ سے یہ ظلم نہیں سہا جاتا لیکن میرا کوئی میکا بھی نہیں کہ وہاں چلی جاؤں۔"

وانگ لنگ اب بھی خاموش رہا اور بیٹھ کر اپنا پائپ پینے لگا۔ اولان نے اپنی بیحس آنکھوں سے جو بے زبان حیوان کی آنکھوں کی طرح اداس اور مغموم تھیں دیر تک اسے تاکا اور پھر گرتی پڑتی باہر چلی گئی کیونکہ آنسوؤں کی جھڑی کے مارے اسے راہ نہ سجھائی دیتی تھی۔

جب وہ چلی گئی تو وانگ لنگ نے اطمینان کی ٹھنڈی سانس لی۔ پھر بھی اس کی شرمندگی نہ گئی اور اس شرم پر غصہ بھی آتا رہا۔ وہ اپنے

سے با آواز یوں باتیں کرنے لگا جیسے کسی دوسرے سے بحث کر رہا ہو:
"دوسرے بھی تو یہی کرتے ہیں اور وہ مجھ سے بدتر ہوتے ہیں میرا برتاؤ اولان سے کبھی برا نہ رہا۔" آخر میں اس نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ اولان کو یہ سب برداشت کرنا چاہیے۔

لیکن اولان اس قصے کو یوں ختم نہ کر سکتی تھی۔ خاموشی سے وہ اپنے ارادے پر عمل کرتی رہی۔ صبح پانی گرم کر کے وہ بڑے میاں کو دیتی اور اگر وانگ لنگ اندرونی دالان میں نہ ہوتا تو اس کے لیے چائے بناتی۔ البتہ اگر کوئل اپنی بیگم کے لیے گرم پانی لینے جاتی تو اسے بالٹی خالی ملتی اور تو تو میں میں کے باوجود اولان ٹس سے مس نہ ہوتی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا کہ کوئل اپنی مالکن کے لیے خود پانی گرم کرے۔ لیکن اب صبح کا دلیا پکنے کا وقت آ جاتا اور دیگچے میں زیادہ پانی کے لیے جگہ نہ تھی۔ کوئل لاکھ چلائے مگر اولان ناشتہ بنانے میں دیر نہ کر سکتی تھی:

"کیا میری پھول سی بیگم پانی بنا پلنگ پر کھانستی ہانپتی پڑی رہیں؟"

اولان کے پاس اس بکواس کا کوئی جواب نہ تھا۔ تنور میں وہ زیادہ ایندھن جھونک دیتی لیکن اس میں بھی پہلے جیسی احتیاط برتتی تھی جب ایک ایک چھپٹی قیمتی تھی۔ تب کوئل شکایت لے کر وانگ لنگ کے پاس جاتی اور وہ آگ بگولا ہو جاتا کہ اس کی معشوقہ چھوٹی چھوٹی سی باتوں کے لیے تنگ کی جا رہی ہے۔ اولان کے پاس جا کر وہ چلانے لگتا:

"دیگچے میں ایک لوٹا پانی زیادہ ڈالتے کیا تمھارے ہاتھ ٹوٹتے ہیں؟"

جواب میں اولان کا چہرا تمتما اٹھا:

"میں باندیوں کی باندی نہیں ہو سکتی۔"

اب وانگ لنگ آپے سے باہر ہو گیا اور اولان کا شانہ پکڑ کر اسے بری طرح ہلاتے ہوئے بولا:

"تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟ پانی باندی کے لیے نہیں بلکہ اس کی مالکن کے لیے چاہیے۔"

اس سرزنش کے باوجود اس نے مرد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بس اتنا کہا:

"اسی کو تم نے میرے دونوں موتی دیے تھے!"

وانگ لنگ کے ہاتھ گر پڑے، زبان بند ہو گئی، غصّہ کافور ہو گیا اور شرم سے کٹ کر وہ کویل کے پاس گیا اور کہا:

"ہم ایک نیا باورچی خانہ اور نیا تنور کیوں نہ بنا لیں۔ میری بیوی کو ان نفاستوں کی کوئی خبر نہیں جن کی ضرورت کمل کے پھول سے بدن کو ہے اور جس سے تم بھی واقف ہو۔ وہاں تم جو چاہے پکا سکو گی۔"

مزدوروں کو اس نے ایک چھوٹی سی کوٹھڑی اور اس میں مٹّی کا تنور بنانے کا حکم دیا اور اس پر ایک دیگ لا کر رکھ دی۔ کویل کی خوشی کی حد نہ تھی کیونکہ مالک نے کہہ دیا تھا کہ "من مانا کھانا پکاؤ اور کھاؤ۔"

وانگ لنگ نے سوچا کہ چلو یہ جھگڑا ابھی طے ہوا، اب سوتوں میں

لڑائی نہ ہوگی اور میں بے روک ٹوک مزے کیا کروں گا، اسے ازسرِ نو محسوس ہونے لگا کہ کمل سے اس کا دل کبھی نہ بھرے گا۔ اس کی دل فریب مسکراہٹ بڑی بڑی آنکھڑیوں پر پھول کی پنکھڑیوں کی سی پلکیں جھپکانے کا انداز اور وہ دل رُبا چتونیں جس سے وہ اسے دیکھا کرتی ہی، ان سب سے بھلا وہ کیونکر تھک سکتا تھا۔

لیکن یہ نیا باورچی خانہ اس کی جان کے لیے وبال ہو گیا۔ کیونکہ کوئل ہر روز شہر جا کر بھانت بھانت کے قیمتی پکوان خریدنے لگی۔ ان میں سے کئی کھانوں کے نام بھی وہ جانتا تھا — مثلاً لیچی، شہد میں سکھائے ہوئے کھجور، شہد اور میووں کی عجیب مٹھائیاں، سینگی مچھلی وغیرہ وغیرہ۔ اتنے دام اسے اکھرتے تھے اور طرفہ یہ کہ کوئل اپنی دلالی بھی وصول کرتی۔ لیکن وانگ لنگ کو یہ کہنے کی جرأت نہ ہوتی کہ "تم میری کھال تک بیچ کھاؤ گی!" کہ مبادا وہ برہم ہو جائے اور کمل کے دل پر میل آ جائے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ سیدھے سیدھے جیب میں ہاتھ ڈال کر دام گن دے۔ یہ کانٹا روز جگر میں کھٹکتا مگر وہ کسی کو اپنی بپتا نہ سنا سکتا تھا۔ اس لیے یہ کانٹا ناسور بن گیا اور اس کی آتش عشق رفتہ رفتہ سرد پڑنے لگی۔

اس کانٹے سے ایک دوسرا بس کا روکھ اگا اور یہ ذات والا صفات اس کی چچی کی تھی، یہ ایک ہی چٹوری تھی اور کھانے کے وقت اکثر نئے گھر کا دورہ کرنے آ جاتی تھی۔ دھیرے دھیرے اس نے بڑی پینگ بڑھائی اور وانگ لنگ کو یہ بات بالکل ناپسند آئی کہ کمل نے دوستی کے لیے اس عورت کا انتخاب کیا۔ تینوں عورتیں

خوب کھاتی اڑاتیں اور جب دیکھو کھسر پُھسر کرتی ہوتی تھیں۔ ان کی باتوں کا سلسلہ کبھی ختم ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔ چچی میں خدا جانے کیا خوبی تھی کہ کمل کی جان اس پر فدا تھی اور وہ تینوں ہمیشہ بڑے ملاپ سے رہتیں اور وانگ لنگ کا جی جلایا کرتی تھیں۔

لیکن اس کا کوئی علاج نہ تھا۔ کیونکہ جب وہ چمکار پچکار کر کہتا:

"کمل میری گڑیا! اپنی شیریں کلامی تم اس بڑھیا ٹھڈو پر ضائع نہ کیا کرو۔ اس کا حقدار تو تمہارا میں ہوں۔ پھر یہ ایک ہی پھپھڑ دلالن اور صبح سے شام تک اس کی تمہاری سنگت مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔" یہ سن کر کمل کا منہ پھول جاتا اور وہ ناک بھوں چڑھا کر منہ پھیر لیتی تھی۔

"تمہارے سوا میرا یہاں کون ہے۔ نہ کوئی یار نہ غمگسار۔ میری عمر ہنستے کھیلتے گزری ہے اور تمہارے ہاں بڑی بیگم کے سوا کوئی نہیں۔ وہ میری جان کی لاگو ہے اور بچے ہیں سو الگ وبال جان ہیں۔ آخر میرا یہاں کون ہے۔"

پھر وہ اس پر اپنے دوسرے حربے استعمال کرتی۔ رات کو اسے کمرے میں نہ آنے دیتی اور شکوہ کرتی کہ

"تم مجھے پیار نہیں کرتے اور نہ میری خوشی کا خیال کرتے ہو۔"

اب وانگ لنگ کی ساری اکڑفوں ہوا ہو جاتی۔ فرماں برداری اور افسوس سے وہ گھگھیا کر کہتا:

"میں تمہاری مرضی کا بندہ ہوں۔ بس اس بار درگزر کر دو۔"

تب وہ خندہ پیشانی سے اسے معاف کر دیتی اور آئندہ اس کی

رضی کے خلاف ورزی کرتے ہوئے وانگ لنگ کی نانی مرتی تھی۔
ب اگر کمل چچی کے ساتھ کھاتی پیتی یا ہنستی بولتی ہوتی اور اس دوران
یں وانگ لنگ آدھمکتا تو وہ اسے ٹھہرنے کا حکم دیتی اور اس کی
رف توجہ بھی نہ کرتی تھی۔ وہ غصّے کے مارے نیلا پیلا ہو کر باہر چلا
اتا کہ چچی کے ہوتے کمل اس کی بھی متحمل نہیں کہ وہ اندر آ جائے۔ اور
ا اسے خبر نہ ہوئی مگر ان واقعات نے بھی محبت کی گرمی کو کچھ ٹھنڈا کر دیا۔
اس کے اشتعال کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ اپنی
ائی سے کمل کے لیے وہ جو سامان منگواتا ہے اسے کھا کھا کر چچی کا
ل اور مٹاپا دن دُگنا رات چوگنا نکھر رہا ہے۔ لیکن کہنے کی کوئی جگہ بھی تو
نہ تھی کیونکہ چچی ایک ہی چالاک تھی۔ اس کے آتے ہی وہ ادب سے
اُٹھ کھڑی ہوتی۔ خوب باتیں بناتی اور اس کی تعظیم میں فرق نہ آنے دیتی۔
غرض یہ کہ کمل کے تئیں وانگ لنگ کی محبت میں پہلے کی سی
کیفیت نہ تھی جب دل وجان سے وہ اس کے خیال میں مستغرق
رہتا تھا اس میں چھوٹی موٹی شکایتوں کا رخنہ پڑنے لگا تھا اور کیونکہ
ان کے اظہار کا کوئی ذریعہ نہ تھا اس لیے ان کی چبھن وانگ لنگ کے
لیے اور بھی تکلیف دہ تھی۔ نہ وہ اولان سے صاف صاف کچھ کہہ سکتا تھا
کیونکہ ان کا رشتہ منقطع سا ہو گیا تھا۔

مصائب کا سلسلہ یہیں ختم نہ ہوا بلکہ یہ کانٹوں کے جھاڑ کی طرح
رسو پھیل گیا۔ اس کے باپ کو معلوم نہیں کیا سوجھی کہ یوں تو بڑھاپے
کی وجہ سے دن رات سویا کرتا تھا، لیکن ایک روز وہ لاٹھی ٹیکتے ہوئے
بیٹے نے ستّرویں سالگرہ کے موقع پر اُس کے نذر کی تھی، اس طرف

چل کھڑا ہوا جہاں دیوان خانے اور نئے دالان کی سرحدیں ملتی تھیں۔
آج تک اس نئے دروازہ پر اس کی نظر نہ گئی تھی۔ نہ کسی نے اس سے
کہا تھا کہ گھر میں کسی قسم کا اضافہ ہوا ہے۔ اور نہ وانگ لنگ نے
اسے یہ بتلانے کی زحمت گوارا کی تھی کہ "میں ایک نئی بیوی لایا ہوں"۔
کیونکہ بڑے میاں کے کان ایسے پٹ پڑ گئے تھے کہ ہر نئی چیز کا ذکر
ان کے لیے برابر تھا۔

لیکن آج خوامخواہ اس دروازے کی طرف وہ جا نکلا اور پردہ
جو کھینچا تو سوئے اتّفاق کہ شام کے وقت وانگ لنگ اپنی محبوبہ کے
ساتھ دالان میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ وہ دونوں حوض کے پاس
کھڑے مچھلیوں کو دیکھ رہے تھے اور واقعہ تو یہ ہے کہ وانگ لنگ کی
آنکھیں کمل پر ٹکی ہوئی تھیں۔ جیسے ہی بڑے میاں کی سمجھ میں آیا کہ
کہ ان کا بیٹا ایک بنی ٹھنی جوان عورت کے پاس کھڑا ہے انھوں نے
اپنی بھرّائی ہوئی گونج دار آواز میں نعرہ لگایا! "اس گھر میں کوئی رنڈی
گھس آئی ہے۔" اس ڈر سے کہ کہیں کمل ناراض نہ ہو جائے ——
کیونکہ روٹھ جانے پر یہ ننھی سی عورت وہ شور مچاتی اور سینہ کوٹتی تھی
کہ توبہ —— وانگ لنگ جھپٹا اور بڑے میاں کو باہر لے گیا۔ اس
دوران میں بڑے میاں کی ہڑبونگ جاری رہی اور وانگ لنگ نے
انھیں ٹھنڈا کرنے کے سب جتن کیے۔

"ابّا جان، ذرا سنیے تو سہی، یہ کوئی رنڈی نہیں بلکہ آپ کی
چھوٹی بہو ہے۔"

معلوم نہیں بڈھے کے کانوں میں یہ آواز پہنچی یا نہیں، کیونکہ

وہ کسی طرح چپ نہ ہوا۔ بس یہی کہے گیا کہ "یہاں کوئی رنڈی گھس آئی ہے!"
بیٹے کو پاس کھڑا دیکھتے ہی وہ بول اٹھا: "میری بیوی صرف ایک تھی،
اور میرے باپ نے بھی ایک ہی بیاہ کیا اور ہم نے کبھی کسائی سے
ہاتھ نہیں کھینچا۔" ذرا دیر بعد وہ پھر نعرہ زن ہوا: "میں کہتا ہوں کہ
وہ کسبی ہے!!"

اب بڑھاپے کی کچّی نیند سے یہ بڈّھا کمل کے خلاف ایک قسم
کی عیّارانہ نفرت کا جذبہ لیے ہوئے بیدار رہتا۔ چپکے چپکے اس کے دالان
کے در پر جاکر وہ یک بیک چیخ پڑتا: "رنڈی ــــــ رنڈی!"

یا اس کے دالان کا پردہ اٹھا کر وہ غضبناک طریقے سے فرش پر
تھوک دیتا۔ کنکر پتھر چن کر لاتا اور اپنے کمزور بازوؤں سے حوض میں پھینکتا
تاکہ مچھلیاں ڈر جائیں۔ غرض یہ کہ کسی شریر اور کمینے بچّے کی طرح وہ
اپنے غصّے کا اظہار کرنے لگا۔

وانگ لنگ کے گھر میں یہ ایک نئی وجہ مخاصمت پیدا ہوئی۔
کیونکہ ایک طرف تو وہ اپنے باپ کو ڈانٹتے ہوئے شرماتا تھا، دوسری
جانب کمل کے غصّے کا بھی خوف تھا۔ کیونکہ اب اسے معلوم ہو گیا تھا
کہ وہ کیسے چڑچڑے مزاج کی ہے۔ یہ فکر کہ باپ کی باتوں سے کہیں
کمل بگڑ نہ جائے، کس قدر جاں سوز تھی۔ اور یہ بھی ایک ایسا واقعہ تھا
جس نے اس کے بار محبت کو دوبالا کر دیا۔

ایک روز گھر کے اندر سے کمل کی چیخ سن کر وہ دوڑا تو کیا
دیکھتا ہے کہ دونوں چھوٹے بچّے اپنی پگلی بہن کو بیچ میں لیے وہاں
جا پہنچے ہیں۔ یہ فطری امر تھا کہ چاروں بچّوں کو اس عورت کی

ٹوہ اور کرید رہا کرتی جو اندر رہا کرتی تھی۔ لیکن دونوں بڑے بیٹے جانتے تھے کہ وہ وہاں کیوں ہے اور ابا سے اس کا رشتہ کیا ہے۔ کسی سے وہ اس کا ذکر نہ کرتے تھے، آپس میں بھی اگر اس کا نام لیتے تو بڑی احتیاط سے۔ وہ تو ادھر آتے کنیاتے کتراتے تھے۔ لیکن چھوٹے بچّوں کو محض تاک جھانک یا کمل کے لگائے ہوئے عطر کی مہک یا کوئل کے پیارے پیالیوں میں انگلیاں ڈبوئے بغیر صبر نہ ملتا تھا۔

کمل نے کئی بار وانگ لنگ سے شکایت کی کہ تمھارے بچّے میرے لیے وبالِ جان ہیں، براہ کرم انھیں کہیں بند کر کے رکھو کہ میرا پیچھا چھوڑیں۔ مگر یہ اس کے بس کی بات نہ تھی اور وہ ہنس کر ٹال دیا کرتا کہ

"اگر باپ کی طرح بچّے بھی تم جیسی پری چہرہ کو دیکھنا چاہیں تو کیا ہرج ہے!"

انھیں اِدھر آنے کی ممانعت کرنے کے سوا اس نے کچھ نہ کیا۔ اس کی موجودگی میں تو بچّے بیشک ادھر کا رُخ نہ کرتے لیکن اس کے آنکھ سے اوجھل ہوتے ہی وہ اس دالان میں ادھم مچانے لگتے تھے۔ مگر بڑی لڑکی کو ان امور کی کوئی خبر نہ تھی وہ باہر دھوپ میں بیٹھی خود بخود مسکراتی اور رسّی کے بل کھولا کرتی تھی۔

لیکن اس روز جب بڑے بھائی اسکول چلے گئے تو دونوں بچّوں نے یہ مشورہ کیا کہ اپنی پگلی بہن کو اُس پراسرار عورت سے ملائیں۔ چنانچہ اسے گھسیٹ کر وہ اندر لائے اور کمل کے سامنے

کھڑا کر دیا۔ اس نے آج تک پگلی کو نہ دیکھا تھا اور اسے گھورتی کی گھورتی رہ گئی۔ جب پگلی نے کمل کے زرنگار لباس اور تابناک جواہرات کو دیکھا تو اسے عجیب قسم کی مسرت ہوئی اور ان چمک دار رنگوں کو پکڑنے کے لیے ہاتھ پھیلا کر وہ زور سے ہنس پڑی۔ ہنسی تو بے معنی تھی، ایک بلبلاہٹ سی تھی۔ ڈر کے مارے کمل چیخ پڑی اور جب وانگ لنگ بھاگا ہوا آیا تو کمل غصے کے مارے کانپ رہی تھی۔ اور اچھل کود کر بیچاری پگلی کو دھمکا رہی تھی:

"اگر یہ پھر کبھی میرے قریب آئی تو میں اس گھر میں ہرگز نہ ٹھیروں گی۔ مجھ سے کسی نے نہ کہا تھا کہ یہاں جنم جلی دیوانیاں بھی ہیں۔ اگر یہ خبر ہوتی تو میری جوتی بھی یہاں نہ آتی —— خدا غارت کرے ان بچوں کو!"۔ ایک بچہ جو ھکا بکا اپنی مخبوط الحواس بہن کی انگلی پکڑے کھڑا تھا، اسے کمل نے دھکا بھی دیا۔

اب تو وانگ لنگ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا کیونکہ اپنے بچوں پر اس کی جان جاتی تھی اور اس نے سختی سے کہا:

میرے بچوں کو کوئی کوس نہیں سکتا اور نہ میری دیوانی بیٹی پر کوئی دیدے نکال سکتا ہے۔ تم جیسی بانجھ کو انھیں نام دھرنے کا کیا حق ہے۔" سب بچوں کو گود میں سمیٹ کر وہ اُن سے بولا:

"میرے بیٹے اور بیٹیو، اب کبھی اس عورت کے گھر قدم نہ رکھنا کیونکہ یہ تمھیں نہیں چاہتی۔ اور اگر وہ تمھیں نہیں چاہتی تو تمھارے باپ سے بھی محبت نہیں کرسکتی۔" بڑی بیٹی سے اس نے کمال ملایمت سے کہا: "آجا میری پگلی بٹیا، وہیں جہاں تو دھوپ میں

بیٹھا کرتی ہے۔" وہ مسکرا پڑی اور ہاتھ پکڑ کر باپ اسے باہر لے گیا۔
اسے سب سے زیادہ رنج اس امر کا تھا کہ کمل نے اس لڑکی کو کوسا تھا اور اسے دیوانی بتلایا تھا۔ اس کے لیے باپ کے دل میں جو درد تھا وہ از سرِ نو تازہ ہو گیا۔ دو دن تک وہ کمل کے یہاں نہیں گیا۔ بچوں کے ساتھ وہ کھیلتا رہا اور شہر جا کر مٹھائیاں لایا اور لڑکی کی طفلانہ خوشی میں شریک رہا۔
جب وہ کمل سے ملنے گیا تو اس نے یہ کچھ نہ پوچھا کہ دو روز کہاں رہے۔ لیکن اسے خوش کرنے کا ہر ممکن جتن اس نے کیا کیونکہ جب وہ آیا تو چچی چائے ڈھکوس رہی تھی۔ کمل اسے رخصت کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی: "معاف کیجیے میرے آقا آئے ہیں اور ان کی خوشنودی و فرماں برداری کے لیے میں سب کچھ کر سکتی ہوں کیونکہ ان کی خوشی میں میری خوشی ہے۔" اب چچی کو جاتے ہی بنی۔
وانگ لنگ کے پاس آ کر اس نے اس کا ہاتھ لیا اور اسے چوم کر طرح طرح کے غمزے کرنے لگی۔ وانگ لنگ اب بھی اس کا فدائی تھا لیکن پہلے کی سی محبت کرنا اس کے لیے ناممکن تھا۔
ایک دن وہ بھی آیا جب گرمی رخصت ہو گئی۔ صبح صبح آسمان سمندر کی طرح صاف و سرد اور نیل گوں ہو گیا۔ بادِ خزاں زمین سے الجھنے لگی اور اب وانگ لنگ گویا ایک طویل خواب سے چونک پڑا۔ دروازے پر جا کر اس نے کھیتوں پر نظر ڈالی۔ سیلاب کا پانی اتر چکا تھا اور زمین تیز و تند ہوا اور چمکتے ہوئے سورج میں جگمگا رہی تھی۔
اور اس کی روح نے ایک صدا دی، اور یہ صدا محبت کے

نغمے سے بھی زیادہ دور رس تھی، کیونکہ یہ اس کی زمین تھی جو اسے پاس بلارہی تھی۔ اس کی زندگی پر ہمیشہ یہی ایک صدا چھائی رہتی تھی۔ اور اسے سنتے ہی اس نے اپنی لمبی قبا کو پھاڑ دیا۔ مخملی جوتے پھینک دیئے۔ سفید موزے اتار ڈالے۔ اپنے پائجاموں کو گھٹنوں تک چڑھاکر اس نے فرط شوق سے پکار لگائی:

"کہاں ہے ہل، کدھر ہے کھرپی؟ گیہوں کے بیج بھی تو لے آنا۔ اے یار چینگ، چلو آجاؤ ــــ بلاؤ آدمیوں کو ــــ میں کھیت کو جارہا ہوں۔"



باب ۲۲

کھیتوں کی جس سیاہ خاکِ پاک نے دکن سے لوٹنے پر اس کے دکھے ہوئے دل پر مرہم رکھا تھا، اب اسی نے اس کے مرضِ عشق کا علاج کیا۔ گیلی مٹی پر وہ ننگے پانو چلنے لگا اور مٹی کی سوندھی مہک کو سونگھنے لگا۔ مزدوروں کو وہ یہاں وہاں دوڑانے لگا اور انھوں نے ہل چلا چلا کر دھرتی کا جگر چاک کر دیا۔ پہلے تو وانگ لنگ بیلوں کو کوڑا لے کر ہانکتا رہا اور دیکھتا رہا کہ ہل زمین میں کتنی گہری شکنیں ڈال دیتا ہے۔ پھر ان کی نکیل چنگ کو سونپ کر اس نے خود بیلچہ سنبھالا اور ڈھیلے توڑنے لگا۔ کالی شکر کی طرح وہ نرم تھے اور گیلے پن کی وجہ سے اب بھی سیاہی مائل تھے۔ یہ سب کسی ضرورت سے نہیں بلکہ محض حظ کے لیے کر رہا تھا۔ تھک کر وہ مٹی پر سو رہا اور زمین کی صحت اس کی رگ رگ میں پیوست ہو گئی اور اسے اپنی بیماری سے نجات مل گئی۔

جب رات آئی اور بے بادل کے آکاس میں سورج جگر مگر کرتے ہوئے ڈوب گیا تو وہ گھر لوٹا۔ گو اس کا جسم خستہ و سوختہ ہو رہا تھا لیکن اس میں جوش بھرا ہوا تھا۔ وانگ لنگ نے دالان کے پردے کو پھاڑ پھینکا اور دیکھا کہ وہاں کمل اپنے ریشمی لباسوں میں ٹہل رہی ہے۔ اس کے خاک آلود کپڑوں کو دیکھ کر کمل کے منہ سے چیخ نکل گئی اور جب وہ قریب آیا تو وہ سہم گئی۔

لیکن قہقہہ لگا کر وانگ لنگ نے اپنے میلے ہاتھوں میں اس کی نازک کلائیاں پکڑ لیں اور کہا:

"اب سمجھ میں آیا کہ تمھارا آقا ایک کسان ہی اور تم کسان کی بیوی ہو؟" تنک کر وہ بولی:

"نوج، میں کسان کی بیوی کیوں ہونے لگی۔ ہاں تم جو چاہو ہوا کرو۔"

وہ ہنستے ہوئے وہاں سے چلا آیا۔

مٹّی سے اٹے ہونے پر بھی اس نے بے نہائے دھوئے کھانا کھایا اور سونے سے پہلے بادلِ ناخواستہ غسل کیا۔ نہاتے نہاتے اسے اس بات پر ہنسی آئی کہ یہ صفائی کسی عورت کے لیے نہیں ہی اور اپنی آزادی پر وہ جی کھول کر ہنسا۔

وانگ لنگ کو ایسا معلوم ہوا کہ زمانۂ دراز سے وہ پردیس میں تھا اور کرنے کے ہزاروں کام رہ گئے ہیں۔ زمین کا تقاضا تھا کہ اسے جوتا بویا جائے اور اب ہر روز وہ اُس پر جان کھپانے لگا۔ عشق کی گرمی نے اس کے جسم کو کملا کر پیلا کر دیا تھا لیکن دھوپ کھا کر اب وہ بھورا پڑگیا تھا۔ اس کے ہاتھوں کے جو گھٹے محبّت کی کاہلی کی وجہ سے نرم پڑ گئے تھے، اب ہل اور بیلچے سے دب کر پھر ابھر آئے۔

دوپہر اور شام کو وہ اولان کا پکایا ہوا کھانا سیر ہو کر کھاتا — چاول گوبھی اور سیم، لہسن ملی ہوئی گیہوں کی روٹی۔ اس کے آتے ہی جب کمل اپنی ناک سکوڑ کر بدبو کی شکایت کرتی تو وانگ لنگ لاپروائی سے ہنس پڑتا اور اس کی طرف زور سے پھونک مارتا۔ کیونکہ

وہ چاہے یا نہ چاہے اب میں جو چاہوں گا سو کھاؤں گا۔ اب چونکہ وہ از سرِ نو صحت یاب ہو چکا تھا اور عشق کے روگ کو دھتا بتا چکا تھا اس لیے اس کی صحبت سے جلد فرصت پاکر دوسرے کام بھی کر سکتا تھا۔
اس کے گھر اب دو عورتیں رہا کرتی تھیں: کمل جو اس کے عیش و نشاط کا سامان مہیا کرتی اور اس کے ذوقِ حسن و نزاکت اور لطفِ جنسی کی تکمیل کرتی۔ اولان، جو اس کے بچوں کی ماں تھی۔ گھر کا کام کاج کرتی اور سب کے آرام کا انتظام کرتی تھی۔ یہ امر وانگ لنگ کے لیے باعث فخر تھا کہ گانو کے لوگ اس کی نئی نویلی کا ذکر رشک سے کرتے تھے۔ ان کی باتوں سے یہ ظاہر ہوتا کہ وہ کوئی انمول موتی یا قیمتی کھلونا ہے جس کا کوئی مصرف نہیں۔ لیکن وہ اس آدمی کی ثروت کا نشان ہے جو فکر معاش سے آزاد ہو چکا ہے اور حسب خواہش اپنے عیش پر دولت صرف کر سکتا ہے۔
اس کی خوش حالی کے تحسین کرنے والوں میں سب سے بلند آواز اس کا چچا تھا۔ اس کی مثال ایسے کتے کی سی تھی جو دم اٹھا کر لاڑ کرتا ہے اور انگلی سے بڑھ کر کلائی پکڑنا چاہتا ہے۔ وہ کہتا تھا:
"میرے بھتیجے کی داشتہ ایسی حسین نازنین ہے جس پر ہم جیسوں کی نگاہ نہیں ٹھہر سکتی۔ بڑی بڑی بیگموں کی طرح وہ کمخواب اور ریشم پہنتی ہے۔ میں نے بھی اسے نہیں دیکھا لیکن میری بیوی مجھے یہ سب بتلاتی ہے ..... میرے بھائی کا بیٹا ایک شاندار گھرانے کا بانی ہے۔ اس کے بیٹے رئیس زادے کہلائیں گے اور کبھی اپنے ہاتھ سے کام نہ کریں گے۔"

گانو والوں کی نگاہ میں وانگ لنگ کا رتبہ بڑھ گیا۔ اب وہ اسے کوئی ایسا ویسا نہیں بلکہ بڑا آدمی سمجھنے لگے وہ اس سے سود پر قرض لینے آتے اور بیٹے بیٹیوں کی شادی کے متعلق اس سے مشورہ کرتے۔ اگر زمین کے کسی ٹکڑے پر دو میں جھگڑا ہوتا تو دونوں وانگ لنگ کو پنچ بناتے اور اس کے فیصلے کو سر آنکھوں پر رکھتے۔

اب وانگ لنگ کی محبت کی پیاس بجھ گئی تھی اور وہ مختلف کاموں میں مصروف رہا کرتا تھا۔ وقت پر بارش ہوئی اور دھان کے کھیت لہلہائے۔ اور جب سردی کا سماں آیا تو وانگ لنگ اپنی فصل بازار لے گیا اور اپنے بڑے بیٹے کو ہمراہ لیا وہ تب تک فصل فروخت نہ کرتا تھا جب تک دام نہ چڑھ جاتے۔

کسی باپ کا کلیجہ خوشی سے کیسا پھولتا ہے جب اس کا بڑا بیٹا کاغذ کی تحریر پڑھنے لگے اور کوچی اور روشنائی اٹھا کر کاغذ پر ایسے اچھر لکھنے لگے کہ دوسرے بھی اسے آسانی سے پڑھ سکیں۔ وانگ لنگ کو بھی اب یہ فخر میسر تھا۔ سینہ تانے وہ اس معجزے کا نظارہ کیا کرتا، اور جو بابو پہلے اس کا مذاق اُڑایا کرتے تھے اب آفریں کہہ اٹھے:

"اس لڑکے کا خط کیسا بانکا ہے۔ اس کی ذہانت میں شک نہیں۔"

گو وانگ لنگ یہ دعویٰ نہ کر سکتا تھا کہ اس کا بیٹا یگانہ روزگار ہے، لیکن پڑھتے پڑھتے جب لڑکے نے سمجھایا کہ "اس حرف کا مصدر چوبی نہیں بلکہ آبی ہونا چاہیے۔" تو وانگ لنگ پھول کر کُپا ہو گیا اور جب لڑکے کی دانائی پر منشیوں نے تعریف کے پل باندھ دیے تو وانگ لنگ نے محض یہ کہا:

"اسے ٹھیک کردو! کسی غلط تحریر پر ہمارا نام نہیں لکھا جاسکتا!"
جب اس کا بیٹا کو بچی سے حرف غلط کی اصلاح کرنے لگا تو وہ گھمنڈ سے سب کو دیکھنے لگا۔

جب بیع نامے اور قیمت کی رسیدوں پر لڑکا اس کا نام ثبت کر چکا تو باپ بیٹے نے گھر کا رخ کیا۔ راستے میں باپ سوچنے لگا کہ میرا بیٹا اب جوان ہوگیا ہے اور مجھے باپ کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔ مجھے اس کے لیے ایک دلھن ڈھونڈنا ہے تاکہ اسے میری طرح کسی بڑی حویلی میں جاکر دستِ سوال نہ اٹھانا پڑے اور دوسروں کی جوٹھن پر قناعت نہ کرنا پڑے۔ میرا بیٹا کسی امیر کی اولاد ہے اور میری جائداد کا حقدار ہے۔

اس لیے اس نے شد و مد سے ایک بہو کی تلاش شروع کردی۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا کیونکہ کسی معمولی گھرانے کی لڑکی اسے پسند نہ تھی۔ ایک شب کو جب وہ چنگ سے آیندہ بہار کی بوائی اور کاشت پر باتیں کر رہا تھا تو اس معاملے کا ذکر بھی چھیڑا۔ وانگ لنگ کو اس سے زیادہ مدد کی امید تو نہ تھی کیونکہ اس کے سیدھے پن سے وہ واقف تھا۔ لیکن چنگ کی وفاداری کا وہ قایل تھا اور اس سے اپنے دل کا حال کہہ کر اسے اطمینان ہوتا تھا۔

وانگ لنگ کرسی پر بیٹھا تھا اور چنگ ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ کیونکہ مالک کے لاکھ کہنے پر بھی اب وہ پہلو بہ پہلو بیٹھنے سے انکار کرتا تھا۔ جب وانگ لنگ اپنے بیٹے کی شادی کا ذکر کرنے لگا تو چنگ ہمہ تن گوش ہوکر سنتا رہا۔ جب بات پوری ہوئی تو چنگ نے

ٹھنڈی سانس بھر کر بڑی رکاوٹ کے بعد جواب دیا۔

"اگر میری لڑکی حینِ حیات ہوتی تو میں بصد شکر بغیر کسی عوض کی طلب کے اسے آپ کی نذر کرتا۔ لیکن معلوم نہیں وہ کہاں ہی، زندہ ہی یا مردہ؟"

اس تقریر پر وانگ لنگ نے اس کا شکریہ ادا کیا مگر دل کی بات اس سے نہ کہی کہ چِنگ جیسوں کی بیٹی اس کے بیٹے کے لیے نہیں۔ کیونکہ چِنگ لاکھ شریف ہوا کرے لیکن وہ تھا تو ایک معمولی کسان، جو اب دوسرے کی زمین کا کارندہ تھا۔

اب وانگ لنگ اپنا مشیر آپ بنا۔ جب چائے خانے میں بیاہ جوگ کنواریوں یا شہر کی رئیس زادیوں کا بیان ہوتا تو وہ کان لگا کر سنا کرتا۔ اپنی چچی سے اس نے بھول کر اس کا چرچا نہ کیا۔ اپنا بھید اس سے چھپائے رکھا۔ وہ اسی کام کی تھی کہ ایسی ویسی عورتوں کے لیے کٹنا پا کیا کرے۔ لیکن اپنے بیٹے کے لیے وہ ہرگز اس کا مشورہ طلب نہ کرے گا کیونکہ اس کے لائق دلہنوں تک چچی کی رسائی ممکن نہ تھی

سال کے خاتمے پر سردی بڑھی اور برف گرنے لگی۔ پھر جب جشنِ نوروز ہوا تو نا و نوش کے جلسے منعقد ہوئے۔ وانگ لنگ کو مبارکباد دینے صرف دیہاتی ہی نہیں بلکہ شہر کے لوگ بھی آئے۔ اور انھوں نے کہا:

"ہم آپ کو کیا دعا دیں۔ خدا کا دیا آپ کے ہاں سب کچھ ہی — بیویاں، بیٹے، دھن دولت، کھیتی باڑی۔"

اس موقع پر وانگ لنگ ریشمی لباس پہنے اور زرق برق قباؤں میں ملبوس بیٹوں کو دائیں بائیں لیے یہ محسوس کر رہا تھا کہ قسمت اس پر مہربان ہے۔ میز پر مٹھائیاں، میوے اور تربوز کے بیج رکھے تھے اور لکشمی کو بلانے کے لیے ہر دروازے پر سرخ کاغذ کے نشان چسپاں تھے۔

بہار بھی آ گئی اور بیدِ مجنوں میں ہلکا ہلکا ہرا پن اور آڑو کے پیڑوں میں خفیف سی سرخی آنے لگی، لیکن وانگ لنگ ہنوز بیٹے کے لیے کوئی من بھاتی دلھن نہ ملی۔

جب بہار کا شباب آیا تو دن کچھ بڑھا اور گرم ہوا چلی۔ پھولوں نے سر نکالا، بید مجنوں ہرے بھرے ہوئے اور پتیوں سے سج گئے۔ پیڑوں نے سبز دوپٹے اوڑھے اور دھرتی میں سیلن آنے لگی، فصل کی حامل ہو کر وہ کہرا اُگلنے لگی۔ اتنے میں وانگ لنگ کیا دیکھتا ہے کہ بڑے بیٹے میں یک بیک تبدیلی ہو گئی ہے اور اس کا لڑکپن رخصت ہو گیا ہے۔ اب وہ چڑچڑا اور اداس ہو چلا۔ نہ اسے کھانا بھاتا تھا نہ پڑھنا۔ وانگ لنگ سخت پریشان ہوا اور سمجھ نہ سکا کہ یہ کیا مصیبت ہے اور ڈاکٹر بلانے کا ارادہ کرنے لگا۔

اس لڑکے کی اصلاح کا کوئی راستہ نہ رہا کیونکہ اگر باپ چمکار کر کہتا: "گوشت چاول کھا لو!" تو لڑکا روٹھ کر ہٹ کرنے لگتا۔ اور اگر وانگ لنگ اسے ڈانٹتا تو وہ روتے ہوئے باہر بھاگ جاتا۔

وانگ لنگ کے تعجب کی حد نہ رہی اور اس کی سمجھ میں خاک نہ آیا۔ انتہائی مہر و محبت سے اس نے پوچھا: "میں تمھارا باپ ہوں۔

مجھ سے نہ چھپاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو۔" مگر لڑکے نے سبکیاں بھرنے اور سر ہلانے کے سوا کوئی جواب نہ دیا۔

یہی نہیں بلکہ بڈھے مدرس سے اسے نفرت ہو چلی۔ جب تک وانگ لنگ اسے ڈانٹ نہ بتلاتا اور کبھی کبھی پٹائی نہ کرتا وہ اسکول نہ جاتا، اگر وہ جاتا بھی تو اس کا منہ توبڑے کا سا پھولا ہوتا اور بعض اوقات وہ دن دن بھر شہر کی سڑکوں پر سرگشت کیا کرتا۔ اس کی اطلاع وانگ لنگ کو رات کو جاکر ملتی جب چھوٹا بیٹا چغلی کھاتا کہ "آج بھائی جان اسکول نہیں آئے۔"

تب تو وانگ لنگ سخت برہم ہوتا اور بڑے بیٹے کو دھمکاتا کہ

"کیا میرا روپیہ یوں ناس ہونے کے لیے ہے؟"

اور غصے سے بے قابو ہو کر وہ بید سے اسے تابڑ توڑ پیٹتا تاوقتیکہ شور پکار سن کر اولان باورچی خانے سے نکل آتی اور دونوں کے درمیان کھڑی نہ ہو جاتی۔ اب باپ بیٹے میں آنکھ مچولی سی ہونے لگتی اور اس میں بیچاری اولان کو بھی ایک آدھ ہاتھ آ لگتا حیرت اس بات پر تھی کہ جو لڑکا باپ کی ایک دھمکی پر زار زار رونے لگتا تھا وہ اتنی مار کھا کر بھی اُف نہ کرتا۔ بس اس کا چہرا پتھر کی طرح سخت پڑ جاتا۔ یہ معمّا وانگ لنگ کی سمجھ میں نہ آتا تھا حالانکہ اسے شب و روز اسی کا خیال رہتا تھا۔

ایک مرتبہ دن کو اسکول نہ جانے کی خطا میں اسی طرح بیٹے کی مرمت کر کے رات کے کھانے کے بعد وانگ لنگ سوچ بچار میں غرق تھا کہ اولان کمرے میں آئی۔ اس کے آگے آکر وہ چپ چاپ کھڑی ہو گئی اور وہ تاڑ گیا کہ جس معاملے پر وہ غور کر رہا ہے اسی کے متعلق وہ

کچھ کہنا چاہتی ہے۔ اس لیے وہ بولا: "بیٹے کی اماں کیا بات ہے؟"
اولان نے کہا: "تم لڑکے پر ناحق مار دھاڑ کرتے ہو۔ میں نے بڑی حویلی میں جوان صاحبزادوں کو اسی کیفیت میں دیکھا ہے۔ جب ان پر ایسی اُداسی آتی تو بڑے نواب فوراً ان کے لیے لونڈیوں کا انتظام کرتے اور پھر یہ مصیبت فوراً ٹل جاتی تھی۔"
وانگ لنگ بحث کرنے لگا: "یہ کوئی ضروری امر نہیں۔ اس عمر میں نہ تو میں کبھی اتنا ہوا نہ اداس نہ چڑچڑا۔ نہ مجھے کوئی لونڈی باندی ملی۔"
تھوڑی دیر چپ رہ کر اولان نے کہا: "میں نے بھی صرف صاحبزادوں پر یہ کیفیت طاری ہوتے دیکھی تھی۔ تم محنت مزدوری کرنے پر مجبور تھے لیکن ہمارا بیٹا کسی نواب زادے سے کیا کم ہے۔ ٹامک ٹوئیاں مارنے کے سوا اسے کیا کام ہے؟"
وانگ لنگ بھوچکا رہ گیا اور جب کچھ سر کھپایا تو اس قول میں سراسر صداقت نظر آئی۔ یہ سچ ہے کہ جب وہ خود جوان ہو رہا تھا تو اسے افسردگی کی مہلت نہ تھی۔ نور کا تڑکا ہوا نہیں اور بیل کی دُم اور ہل کی مٹھ اس کے ہاتھ آیا نہیں۔ دھان کٹائی کے سمے تو اسے ایسی مشقت کرنی ہوتی کہ انجر پنجر ڈھیلے پڑ جاتے تھے۔ اگر وہ روتا بھی تھا تو اس کے آنسو پونچھنے والا کون تھا۔ جس طرح بیٹا اسکول سے بھاگ جاتا تھا، وہ کھیت سے بھاگ نہ سکتا تھا ورنہ روٹیاں کہاں سے ملتیں۔ محنت کے سوا اس کے لیے کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ سب یاد کر کے اس نے سوچا:
"لیکن مجھ میں اور میرے بیٹے میں فرق ہے۔ وہ نسبتاً کمزور ہے۔ میرا باپ غریب تھا لیکن اس کا باپ امیر ہے۔ اسے محنت کی ضرورت

نہیں کیونکہ میرے گھر مزدوروں کی کیا کمی۔ پھر یہ بھی تو ہی کہ ایسے پڑھے لکھے لڑکے کو میں ہل میں نہیں جوت سکتا۔"

اس تصور سے دل ہی دل میں مسرور ہو کر کہ اس کا بیٹا کسی نواب زادے سے کم نہیں، اس نے اولان سے کہا:

"اچھا، اگر یہ بھی رئیس زادہ ہی تو کیا کیا جائے۔ لیکن میں اس کے لیے کوئی لونڈی نہ خریدوں گا۔ میں جھٹ پٹ اس کا بیاہ کیے دیتا ہوں۔ یہی ایک صورت ہی۔"

یہ کہہ کر وہ کمل کے گھر چلا گیا۔



باب ۲۳

کمل نے جب دیکھا کہ اس کی موجودگی میں بھی وانگ لنگ بدحواس سا ہوتا اور اس کے عشق میں پہلے کی طرح محو نہیں رہتا تو منہ پھلا کر بولی:

"اگر میں یہ جانتی ہوتی کہ سال بھر میں تمہارا دل مجھ سے بھر جانے کا تو میں چائے خانے میں ہی رہتی۔ یہاں نہ آتی۔" منہ پھیر کر وہ اسے کن انکھیوں سے یوں تاکنے لگی کہ وانگ لنگ کو ہنسی آگئی اور اس کا عطر میں بسا ہوا ہاتھ چوم کر کہا: "اپنے کوٹ میں ٹکے ہوئے ہیرے کا خیال ہمیشہ نہیں کیا جاتا لیکن اگر وہ کھو جائے تو یہ غم بھی نہیں سہا جاتا۔ آج کل میں اپنے بڑے بیٹے کی وجہ سے فکرمند ہوں۔ کیونکہ اس کا خون جوشِ شباب سے اُبل رہا ہے۔ اس کی شادی فوراً کرنا ہے لیکن اب تک مجھے اس کے لائق لڑکی نہیں ملی۔ مجھے یہ پسند نہیں کہ وہ کسی کسان کی بیٹی کو بیاہے۔ یہ اس لیے بھی مناسب نہیں کہ ہم سب ایک ہی کنبے 'وانگ' کے فرد ہیں۔ لیکن شہر میں کسی سے میری اتنی بے تکلفی نہیں کہ کہہ سکوں کہ یہ ہے میرا بیٹا اور وہ ہے آپ کی بیٹی۔ کسی پیشہ ور نائی سے کہتے ڈر لگتا ہے کہ کہیں وہ کسی ایسی لڑکی سے بات نہ لگا دے جو بدصورت یا کم عقل ہو۔"

جب سے بڑے لڑکے پر نئی جوانی آئی تھی، کمل کے دانت اس پر گڑے ہوئے تھے۔ اس لیے وانگ لنگ کی گفتگو سے اسے دلچسپی ہوئی

کچھ سوچ کر اس نے کہا:

"بڑے چائے خانے میں میرا ایک ملاقاتی تھا جو اکثر اپنی بیٹی کا ذکر مجھ سے کرتا تھا۔ کیونکہ وہ مجھ جیسی ننھی منی اور گل بدن تھی۔ ایک کسر یہ تھی کہ وہ کم عمر تھی۔ وہ مجھ سے کہا کرتا تھا کہ تم سے محبت کرتے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنی بیٹی کے پاس ہوں۔ تم اس سے اتنی ملتی جلتی ہو کہ مجھے اپنے تعلق کے جواز پر شبہہ ہونے لگتا ہے۔ صرف اسی سبب سے اپنی اُلفت کے باوجود وہ لم تڑنگ سرخ رو عورت کے ساتھ شب باش ہوتا جسے لوگ انار دانہ کہا کرتے تھے۔

وانگ لنگ نے پوچھا: "وہ کس قسم کا آدمی تھا؟"

وہ نیک دل تھا۔ ہمیشہ نقد دام دیتا۔ اور کبھی جھوٹے وعدے نہ کرتا تھا۔ اپنی دریا دلی کی وجہ سے وہ ہم سب میں ہر دل عزیز تھا۔ اگر کبھی کسی لڑکی کی طبیعت خراب ہوتی تو دوسروں کی طرح وہ واویلا نہ مچایا کرتا بلکہ کسی شریف شہزادے کی طرح نرمی سے کہتا: کوئی ہرج نہیں۔ جانِ من یہ رُپے لو۔ خدا حافظ، جلد تمھارا جوبن بہار پر آئے۔ وہ ہم سب سے اچھا برتاؤ کیا کرتا تھا۔" یہ کہہ کر وہ گزشتہ زمانے کی یاد میں مستغرق ہوئی ہی تھی کہ وانگ لنگ نے فوراً یہ جملہ تراشا کیونکہ اسے پسند نہ تھا کہ کمل اپنی پرانی زندگی کو یاد کیا کرے۔

"آخر یہ سب دولت اسے کہاں سے حاصل ہوئی تھی؟"

"مجھے ٹھیک نہیں معلوم۔ غالباً وہ کسی اناج منڈی کا چودھری تھا۔ میں کوئل سے پوچھتی ہوں کیونکہ اسے سب مال دار مردوں کا حال معلوم ہے۔"

اس نے تالی بجائی اور کوئل باورچی خانے سے بھاگی ہوئی آئی۔

اس کے ابھرے ہوئے گال اور ناک آگ کی وجہ سے تمتما گئے تھے۔ کمل نے سوال کیا :

"کیوں بھئی، وہ اونچا پورا بھلا مانس کون تھا جو پہلے میرے پاس آکر پھر 'انار دانہ' کے پاس چلا جاتا تھا کیونکہ مجھ پر جان دینے کے باوجود صرف اس وجہ سے کہ میں اس کی بیٹی سے مشابہ تھی، وہ میرا مہمان نہ بنتا تھا ؟"

کویل نے تڑاخ سے جواب دیا: "وہ تو 'لیو' نامی اناج کا سوداگر ہے۔ بھئی فرشتہ ہے فرشتہ! مجھے دیکھتے ہی روپیہ نذر کرتا تھا۔"

وانگ لنگ نے لاپروائی سے پوچھا: "اس کی منڈی کہاں ہے؟" اصل میں اسے عورتوں کی گپ بازی پر کوئی بھروسا نہ تھا اور اس کا کوئی نتیجہ حاصل ہونے کی امید نہ تھی۔

"پتھر والے پل کی سڑک پر" کویل نے بتلایا۔

اس کے منہ سے یہ نام نکلتے ہی وانگ لنگ خوشی سے اچھل پڑا:

اسی منڈی میں سودا لے جاتا ہوں، یہ نیک شگون ہے اور عجب نہیں کہ وہاں رشتہ بیٹھ جائے۔" پہلی بار اسے اس معاملے سے دلچسپی ہوئی کیونکہ اس کے نزدیک یہ خوش نصیبی کی دلیل تھی کہ اس کا بیٹا کسی ایسے تاجر کی بیٹی کو بیاہ سکے جو اس کا اناج خریدا کرتا تھا۔

جب کوئی ایسا معاملہ آن پھنستا تو کویل کے لیے بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹنے کی مثال صادق آتی تھی۔ اس نے چٹ انگلیاں چٹخا کر کہا :

"میں تو اپنے آقا کی ہر خدمت کے لیے تیار ہوں۔"

وانگ لنگ کو اس کے کہے پر اعتبار نہ ہوا اور اس بے اعتباری سے

اس کی چالاک صورت کو دیکھا۔ مگر کمل نے بات بنا کر جتایا:
وہ سچ کہتی ہے۔ اسے 'لیو' سوداگر کے ہاں جانے دو۔ کیونکہ وہ اسے خوب جانتی ہے۔ پھر وہ ایک ہی چلتی رقم ہے اور بات پکّی کرا دے گی۔ اگر وہ اپنا فرض حسن و خوبی سے ادا کرے تو نائی کا محنتانہ اسے دے دینا۔"

"چٹکی بجاتے میں یہ کام کر دوں گی!" کویل نے گلا پھاڑ کر دہرایا۔ اور مٹھی میں محنتانہ کے ریلوں کا تصوّر کر کے وہ خوب ہنسی۔ کمر سے پیش جامہ (ایپرن) کھول کر وہ ہڑبڑاتی ہوئی بولی: میں لگے ہاتھوں وہاں ہو آؤں۔ کیونکہ گوشت کو بس بھوننا باقی ہے اور سبزی ڈھل ہی چکی ہے۔"

لیکن وانگ لنگ نے اس تجویز پر کافی غور و خوض نہیں کیا تھا۔ اور اتنی جلدی وہ فیصلہ کرنا نہ چاہتا تھا۔ لہذا وہ جھٹ سے بولا:
"نہیں ابھی میں نے تصفیہ نہیں کیا ہے۔ کچھ روز میں سوچ لوں تو تم سے کہوں گا۔"

عورتیں سخت بیقرار تھیں۔ کویل ریلوں کی خاطر اور کمل اس لیے کہ دل بہلانے کا نیا سامان ہاتھ آئے گا۔ تاہم وانگ لنگ یہ کہہ کر چل دیا:
"نہیں، یہ میرے بڑے بیٹے کا معاملہ ہے۔ مجھے ہر پہلو کو سوچ سمجھ لینا چاہیے۔"

شاید عرصے تک وہ اس تجویز پر سوچ بچار کرتا اور طرح طرح کی مین میکھ نکالتا۔ لیکن ایک روز اس کا بڑا بیٹا شراب کے نشے میں

چور صبح صبح گھر لوٹا۔ اس کا چہرا سرخ پڑ گیا تھا، منہ سے بدبو آرہی تھی، پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ لغزش کی آہٹ سن کر جب وانگ لنگ آنگن میں آیا تو دیکھا کہ اس کا بیٹا قے کر رہا ہے۔ گھر کی ہلکی سی چاول کی شراب کے سوا اس نے کبھی اور کسی دارو کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔ اب باپ کے سامنے زمین پر گر کر کتّے کی طرح وہ قے کر رہا تھا۔

وانگ لنگ نے گھبرا کر اولان کو آواز دی اور دونوں اسے اٹھا کر اندر لے گئے۔ ماں نے نہلا دھلا کر اسے اپنے کمرے میں سلا دیا اور اسے فوراً ایسی غفلت کی نیند آئی گویا چل بسا ہو۔ باپ کی پوچھ پاچھ اس کے کانوں تک بھی نہ پہنچی۔

تب وہ اس کمرے میں گیا جہاں دونوں لڑکے ایک ساتھ رہتے تھے۔ چھوٹا لڑکا جماہی پر جماہی لیتے ہوئے مدرسے جانے کے لیے اپنا بستہ باندھ رہا تھا۔ وانگ لنگ نے ڈپٹ کر پوچھا:

"رات کو تیرا بھائی یہیں سویا تھا یا نہیں؟"

لونڈے نے جبراً و قہراً جواب میں 'نہیں' کہا۔

اس کی گھبراہٹ دیکھ کر وانگ لنگ نے اور بھی زور سے پوچھا: رات کو وہ کہاں رہا؟" جب لڑکے نے منہ نہ کھولا تو باپ نے اس کی گردن پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا: "سور کہیں کے بولتا ہے یا نہیں!"

اب تو چھوٹے میاں کی گھگھی بندھ گئی۔ سسکیاں بھرتے ہوئے وہ بمشکل بولا:

بھائی جان نے مجھے منع کر دیا تھا کہ اگر آپ سے کچھ کہوں گا تو جلتے ہوئے لوہے سے مجھے داغ دیں گے اور جو کچھ نہ کہا تو اکنّی دیں گے

اب وانگ لنگ کے غصّے کا حد و حساب نہ رہا:
"کہنے کی کیا بات تھی؟ سچ سچ بتلا دے ورنہ گلا گھونٹ دوں گا۔"
لڑکے نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اس ڈر سے کہ کہیں باپ دراصل گلا نہ گھونٹ دے، جواب دیا:
"وہ لگاتار تین راتوں سے غایب رہتے ہیں۔ مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ وہ آپ کے چچا زاد بھائی کے ساتھ جاتے ہیں اور مجھے کچھ نہیں معلوم۔"
وانگ لنگ نے اس کی گردن چھوڑ کر ایک دھکّا دیا اور دندناتے ہوئے اپنے چچا کے کمرے میں پہنچا۔ وہاں چچا کا بیٹا اس کے بیٹے کی طرح مخمور اور مست پڑا ہوا تھا۔ البتّہ اس کے پاؤں میں لرزش نہ تھی۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ اس کی عمر کچھ نکلتی ہوئی تھی، پھر وہ نیا کھلاڑی نہ تھا۔
وانگ لنگ نے ڈانٹ کر پوچھا:
"تم میرے بیٹے کو کہاں لے گئے تھے؟"
اس شخص نے ناک بھوں چڑھا کر کہا:
"اُسے کسی رہبر کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنا راستہ خوب پہچانتا ہے۔"
اب وانگ لنگ کو ضبط کا یارا نہ رہا۔ اس کا جی چاہا کہ اس منہ پھٹ بدتمیز لونڈے کا سر قلم کر دے۔ گلا پھاڑ کر وہ چلاّ پڑا:
"میرا بیٹا پچھلی رات کہاں رہا؟"
اس دھونس کے آگے صاحبزادے کی سٹّی بھول گئی۔ اس کی آنکھیں جھک گئیں اور اسے یہ کہتے ہی بنا:
"بڑی حویلی کے برآمدے میں جو رنڈی رہتی ہے، یہ اسی کے ہاں رہا۔"
وانگ لنگ پر جیسے بجلی سی گری کیونکہ یہ ٹخیائی سارے قرب وجوار

میں بدنام تھی ۔گداگروں اور محتاجوں کے سوا کوئی اس کی بات بھی نہ
پوچھتا تھا کیونکہ اس کی جوانی گزر چکی تھی ۔کھانا پینا چھوڑ کر وہ باہر نکلا
اور کھیتوں سے ہوکر چلا بیٹے کے سبب سے اس پر جو نئی افتاد پڑی تھی
اس نے نہ تو اس کا دھیان فصل کی طرف جانے دیا۔ اور نہ کھیتوں کی
طرف۔ اسے تن بدن کا دھیان نہ تھا اور شہر دروازے سے ہوکر وہ اس
حویلی کی سمت گیا جسے کبھی بڑی حویلی کہتے تھے ۔

پھاٹک اب پاٹم پاٹ کھلے رہتے تھے اور کبھی بند نہ ہوتے تھے۔
جب جس کا جی چاہے بے کھٹکے وہاں داخل ہو سکتا تھا۔ وانگ لنگ
نے اندر جاکر دیکھا کہ در و دالان ایرے غیرے سے بھرے ہوئے ہیں
سب کمرے کرائے پر اُٹھ گئے تھے اور ایک ایک کمرے میں پورا کنبہ
رہتا تھا۔ گندگی کی انتہا نہ تھی ۔صنوبر کے کچھ پیڑ تو کٹ چکے تھے اور
کچھ مرجھائے ہوئے کھڑے تھے ۔حوضوں میں کوڑا کرکٹ اٹا ہوا تھا۔

لیکن اس افراتفری پر وانگ لنگ کی نگاہ نہ گئی ۔پہلے مکان کے دالان
میں جاکر اس نے آواز دی :

"نیگ، نامی رنڈی کہاں رہتی ہے؟"

تپائی پر بیٹھ کر ایک عورت جوتے کا تلا سی رہی تھی ۔سر اٹھا کر اس نے
ایک دروازے کی جانب اشارہ کیا اور پھر یوں اپنے کام میں لگ گئی جیسے
اسے اکثر اس سوال کا جواب دینا ہوتا ہے ۔

اس دروازے پر جاکر جب وانگ لنگ نے دستک دی تو اندر سے
کوئی بڑبڑانے لگا :

"نکل بھڑوے! رات بھر کماتے کماتے میں تھک کر چور ہوگئی ہوں"

لیکن جب اس نے پھر زنجیر ہلائی تو کوئی چلاّیا :

"تم کون ہو جی ؟"

زبان سے کچھ نہ کہہ کر وہ کواڑ پیٹے گیا کیونکہ وہ اس کسبی سے ملے بغیر نہ لوٹنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ بالآخر کپڑے پہننے کی سرسراہٹ ہوئی اور ایک عورت نے دروازہ کھولا۔ اس کی جوانی ڈھل چکی تھی، چہرے سے تکان کے آثار نمایاں تھے اور موٹے موٹے ہونٹ لٹک رہے تھے۔ ماتھے پر بھونڈے پن سے سفیدی مل رکھی تھی اور چہرے کا غازہ ابھی دھویا نہیں گیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ تیکھے پن سے بولی :

"رات سے پہلے میں کسی کو یہاں قدم رکھنے نہ دوں گی۔ جی چاہے تو تم چراغ جلتے ہی آ جانا لیکن ابھی تو میں سونے جا رہی ہوں۔"

مگر وانگ لنگ نے روکھے پن سے اس کی بات کاٹ دی کیونکہ اس کی شکل مکروہ تھی اور یہ تصور بھی گھنونا تھا کہ اس کا بیٹا یہاں رہ چکا ہے۔

"میں اپنے لیے نہیں آیا —— مجھے تم جیسی کی ضرورت نہیں۔ میں تو اپنے بیٹے کے لیے آیا ہوں۔"

یہ کہتے کہتے اس کا گلا رندھ آیا۔ عورت نے پوچھا:

"تمھارے بیٹے سے مجھے کیا غرض ؟"

وانگ لنگ نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا:

"وہ یہاں کل رات آیا تھا۔"

"کل رات کو یہاں کئی مردوے آئے تھے۔ میں کیا جانوں کہ ان میں سے کون تمھارا بیٹا تھا۔"

وانگ لنگ عاجزی پر اُتر آیا :

"زرا دماغ پر زور دو۔ یہ لڑکا چھریرے بدن کا ہے اور عمر کے لحاظ سے اونچا ہے۔ ابھی اسے مرد نہیں کہا جا سکتا اور یہ ممکن ہی نہیں کہ اس سے پہلے کسی عورت کے پاس گیا ہو۔

کچھ یاد کر کے وہ بولی : "دو نوجوان ساتھ آئے تھے۔ ان میں سے ایک کی ناک آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھی اور آنکھیں بتلاتی تھیں کہ بڑا سیانا ہے اور اس کا ٹوپ ایک سمت جھکا ہوا تھا۔ دوسرا ایک دراز قد لڑکا تھا جسے مرد بننے کا اشتیاق ہے۔"

"ہاں ہاں —— یہی ہے —— یہی میرا بیٹا تھا !"

"تو میں کیا کروں ؟" عورت نے پوچھا۔

وانگ لنگ جلدی سے بولا :

"یہ کرو کہ اگر وہ پھر کبھی تمہارے ہاں آئے تو صاف دھتا بتاؤ۔ کہ دو کہ مجھے لونڈے پسند نہیں۔ جو جی چاہے کہ دو۔ جتنی مرتبہ تم اسے چلتا کرو گی میں اصل اجرت کا دوگنا تمہیں دوں گا۔"

لاپروائی سے وہ عورت ہنس پڑی اور خوش ہو کر بولی :

بے کام کیے محنتانہ لیتے کسے خوشی نہ ہوگی ؟ لاؤ ہاتھ میں ہاتھ۔ یہ بھی سچ ہے کہ مجھے مرد پسند ہیں، لونڈوں کی صحبت میں بھلا کیا لطف۔"

وانگ لنگ کو آنکھ مار کر وہ سر ہلانے لگی۔ اس کے چہرے پر ایسی کمینگی تھی کہ وانگ لنگ کو متلی ہونے لگی اور وہ جلدی سے بولا :۔

"تو یہ طے پا گیا۔"

وہ الٹے قدم گھر لوٹ آیا اور جتنی بار اس عورت کا خیال آیا

تھوکتا رہا۔

آتے ہی اس نے کویل سے کہا:

"مجھے تمھاری تجویز پسند ہی۔ اس بیوپاری کے گھر جاؤ اور بیاہ کی بات پکّی کرو۔ اگر لڑکی اچھی ہو اور بہت زیادہ جہیز نہ ملے تو کوئی ہرج نہیں، بس کم نہ ہو۔"

کویل سے یہ کہہ کر وہ اپنی کوٹھری میں آیا اور سوتے ہوئے بیٹے کے سرھانے بیٹھ کر سوچ میں پڑ گیا۔ نیند میں لڑکے کے چہرے پر چڑھتی جوانی کا بھولاپن بہت سہانا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی جب اس موٹے ہونٹوں والی رنگی رنگائی رنڈی کا خیال آیا تو وانگ لنگ پر ناراضی اور کراہت کی کیفیت طاری ہوگئی اور وہ آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا۔

اسی وقت اولان بھی آئی اور جب اس نے دیکھا کہ بیٹا پسینے میں شرابور ہو رہا ہی تو اس نے گرم پانی میں سرکہ ملا کر ہولے ہولے اس کا جسم دھویا۔ بڑی حویلی میں جب صاحب زادے حد سے زیادہ پی جاتے تھے تو یہی نسخہ ان پر برتا جاتا تھا۔ اب جو وانگ لنگ نے اس بھولے چہرے کو اور پھر نشے کی اس غنودگی کو دیکھا جسے یہ نسخہ بھی نہ توڑ سکا تو اسے خود پر اختیار نہ رہا وہ اپنے چچا کے کمرے میں گھس پڑا اور یہ سب بھول گیا کہ وہ اس کا چچا ہی۔ اسے بس اتنا یاد رہا کہ وہ اس کاہل الوجود بدزبان آوارہ کا باپ ہی جس نے اس کے شکیل وجمیل بیٹے کو بدچلنی کی طرف راغب کیا ہی۔ اندر گھس کر وانگ لنگ زور سے بولا:

"میں نے آستین میں سانپ پالے ہیں اور انھوں نے مجھے ڈسنا شروع کر دیا ہی۔"

چچا میز پر جھک کر ناشتہ کر رہا تھا۔ کیونکہ کام کاج نہ ہونے کے کارن وہ اب دوپہر کو اٹھا کرتا تھا۔ سر اٹھا کر وہ غرّایا:

"کیا ہوا؟"

بمشکل گلا صاف کر کے وانگ لنگ نے جب ساری واردات سنائی تو چچا نے قہقہہ لگایا اور کہا:

"کیا تم لڑکے کو مرد بننے سے روک سکتے ہو؟ جوان کتّا بازارو کُتیا سے لگّا لگائے تو کیا تعجّب؟"

اس ہنسی نے پل بھر میں وانگ لنگ کو ان سب تکالیف کی یاد دلا دی جو اس چچا کی وجہ سے اسے سہنی پڑی تھیں۔ چچا نے کس طرح اسے زمین بیچنے پر مجبور کرنا چاہا تھا۔ یہ تینوں نِٹھلّے کس طرح کھاتے پیتے یہاں ڈیرا ڈال کر جم گئے تھے۔ چچی کیوں کر کمل کے ہاں بھانت بھانت کے پکوانوں پر ہاتھ صاف کیا کرتی تھی۔ اور اب ان کا بیٹا وانگ لنگ کے لڑکے کو بگاڑنے کے درپے ہو گیا تھا۔

دانت کٹکٹا کر وہ گرج پڑا:

"اسی وقت میرے گھر سے دفان ہو! آج سے میں تمھیں روٹی کا ٹکڑا نہ دوں گا۔ اسے گوارا کر لوں گا کہ گھر میں آگ لگ جائے، لیکن تمھیں یہاں نہ رہنے دوں گا۔ مفت کے ٹکڑے توڑنا اور اوپر سے یہ نمک حرامی!"

لیکن چچا کے ناشتے کا سلسلہ جاری رہا۔ اور جب وانگ لنگ نے دیکھا کہ اُس کی بکواس کا مطلق اثر نہ ہوا تو اس کا خون کھول اٹھا اور وہ مکّا تان کر لپکا۔ اس پر چچا نے پلٹ کر للکارا:

"کیا تم میں مجھے نکالنے کی جرأت ہے؟"

وانگ لنگ کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور وہ ہکلاتے ہوئے بولا:

"کیوں نہیں ——کیوں ——۔"

چچا نے اپنے کوٹ کا استر کھول کر اس میں سے چھپی ہوئی کوئی چیز دکھا دی۔ اسے دیکھتے ہی وانگ لنگ کے ہاتھ پاؤں سرد پڑ گئے کیونکہ یہ لال بالوں کی مصنوعی ڈاڑھی اور ایک لال ٹھکلی تھی۔ وانگ لنگ حیران و پریشان ان چیزوں کو دیکھتا رہ گیا، اس کا سارا غصّہ کافور ہو گیا اور وہ نڈھال پڑ گیا۔ کیونکہ یہ ڈاکوؤں کے ایک دل کے نشان تھے۔ یہ ڈاکو شمال مغرب میں لوٹ مار کیا کرتے تھے۔ صدہا مکانوں کو انھوں نے آگ لگا دی۔ عورتیں اٹھا لے گئے، کسانوں کو چوکھٹ سے باندھ دیا۔ دوسرے دن لوگوں نے انھیں اس حال میں پایا کہ اگر زندہ ہیں تو پاگل ہو گئے ہیں اور یا زندہ جلا دیے گئے ہیں۔ وانگ کے دیدے پھٹے کے پھٹے رہ گئے اور وہ بے کچھ کہے سنے الٹے پاؤں لوٹ آیا۔ جاتے جاتے اسے اپنے چچا کی دبی ہوئی ہنسی سنائی دی۔ وہ پھر ناشتے میں جُٹ گیا۔

وانگ لنگ نے خواب میں بھی تصور نہ کیا تھا کہ وہ ایسی مصیبت میں پھنس جائے گا۔ چچا کی آمد و رفت کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ چُگّی ڈاڑھی کے اِکّے دکّے سفید بالوں میں ایک ہولناک تبسّم چھپائے حسبِ عادت دامن چاک اور قبا بے بند۔ اسے دیکھتے ہی وانگ لنگ کا کلیجہ دھک سے رہ جاتا تھا مگر اس ڈر سے کہ خدا جانے چچا کیا کر بیٹھے وہ زبان پر سوا کورنش اور تسلیم کے کوئی لفظ نہ لاتا تھا۔ پھر یہ بھی سچ تھا

کہ اس خوشحالی کے زمانے میں اور خصوصاً اس قحط سالی کے زمانے میں جب دوسرے فاقے کر رہے تھے، ڈاکوؤں نے اس کے گھر کا رُخ نہ کیا تھا، حالانکہ وانگ لنگ کو اس امر کا کھٹکا رہتا۔ اور راتوں کو وہ دروازوں میں تالے ڈال دیتا تھا۔ دل لگنے سے پہلے وہ موٹا جھوٹا پہن کر رہتا اور اپنی دولت کا مظاہرہ نہ کرتا۔ جب کبھی دیہات میں لٹیروں کا چرچا ہوتا، اسے رات بھر نیند نہ آتی اور پتّا کھڑکتے ہی وہ بھڑک اٹھتا تھا۔

لیکن کبھی اس کے گھر ڈاکہ نہ پڑا۔ رفتہ رفتہ وہ بے دھڑک ہو چلا اور سوچنے لگا کہ مجھ پر رحمت کا سایہ ہے اور میں خدا کے منتخب بندوں میں سے ہوں۔ اب اسے کسی کی پروا نہ رہی اور اس نے دیوتاؤں کو اگر کی خوشبو دینا بھی بند کر دیا۔ کیونکہ اس کے بغیر بھی وہ اُس کی سرپرستی کر رہے تھے۔ اپنی کھیتی باڑی اور رُپے پیسوں کے سوا وہ کسی سے کوئی غرض نہ رکھتا تھا۔ اب اس کی آنکھ کھلی اور سمجھ میں آیا کہ اس عافیت کی اصل وجہ کیا تھی۔ اور جب تک چچا کے کنبے کی روٹی چلتی رہی اس کا بال بیکا نہ ہوگا۔ یہ سوچ سوچ کر اس کے بدن میں ٹھنڈا پسینہ آنے لگا اور اسے کسی سے یہ کہنے کی ہمت نہ ہوئی کہ چچا کے کوٹ میں کیا چھپا ہوا ہے۔

چچا سے اس نے آیندہ چل چلاؤ کا نام کبھی نہ لیا اور چچی سے وہ اب خوشامد کر کے کہتا:

"آپ اندر جا کر جو جی چاہے کھائیں۔ یہ تھوڑے رُپے آپ کے پاندان کے خرچ کے لیے ہیں۔"

چچازاد بھائی سے خون کے گھونٹ پی پی کر وہ کہتا :
"یہ تمھارا جیب خرچ ہے۔ کیونکہ جوان رنگین مزاج ہوا ہی کرتے ہیں"
لیکن اپنے بیٹے کی نگہداشت وہ سختی سے کرنے لگا اور اسے تاکید کردی کہ رات کو گھر سے باہر نہ نکلے۔ اس پابندی سے وہ سخت برہم ہوا، بہت اچھلا کودا اور دل کا غبار چھوٹے بچوں کو پیٹ کر نکالنے لگا۔
غرض وانگ لنگ پر مصائب کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا۔
ان سب فکروں کی وجہ سے وانگ لنگ سے کام نہ ہوتا تھا۔ کوئی ایک الجھن تو تھی نہیں کہ وہ اس کا جتن کرے۔ کبھی وہ سوچتا کہ چچا کو نکال کریں شہر پناہ کے اندر رہنے لگوں کیونکہ وہاں ڈاکوؤں سے بچاؤ کے لیے رات کو پھاٹک بند کردیئے جاتے ہیں۔ لیکن دن کو کھیتوں میں کام کرنے آنا ہی ہوگا اور واللہ اعلم تن تنہا کام کرتے ہوئے اس پر کیا کچھ نہ گزر جائے۔ پھر مکان میں بند اور شہر پناہ میں مقفل ہوکر کوئی زندہ کیسے رہ سکتا ہے۔ زمین سے دور رہ کر میں تو یقیناً گھٹ جاؤں گا۔ پھر یہ بھی ہے کہ کبھی نہ کبھی قحط بھی پڑے گا۔ اور تب ڈاکوؤں کے حملے سے شہر بھی محفوظ نہیں۔ ہوانگ کی حویلی پر یہی تو گزری تھی۔
یہ بھی ممکن تھا کہ شہر جاکر وہ عدالت میں رپٹ لکھا دے کہ "میرا چچا ڈاکو ہے"۔
لیکن اس کے الزام پر یقین کون کرے گا؟۔ اپنے سگے چچا کو یوں دشنام دینے والے پر بھلا کسے اعتبار آئے گا۔ زیادہ امکان تو اس امر کا تھا کہ اس ناخلفی کی اُلٹے اسے سزا ملے گی اور چچا پر آنچ بھی نہ آئے گی۔

ساری عمر زندگی کا کھٹکا رہے گا کیونکہ اگر ڈاکو یہ سن پائیں گے تو بغیر انتقام لیے نہ مانیں گے۔

اس پر طرفہ تازیانہ یہ کہ کوئیں نے لوٹ کر خبر سنائی کہ سوداگر شادی پر آمادہ تو ہے لیکن ابھی وہ لڑکی کا نکاح ہی کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ ابھی اس کی عمر صرف چودہ سال ہے اور تین سال سے پہلے لگن نہ ہو سکے گا۔ جب وانگ لنگ کو یہ خیال آیا کہ ابھی تین سال لونڈے کی کاہلی بدمزاجی اور اداسی برداشت کرنا ہے۔ کیونکہ ہفتے میں دو روز بھی وہ مدرسے نہ جاتا تھا ـــــ تو رات کو کھاتے وقت وہ اولان پر بگڑنے لگا۔

"سنو جی، جتنی جلدی ہو سکے دوسرے بچوں کو بھی ٹھکانے لگاؤ۔ کیونکہ اب میں گھر میں یہ تماشے دیکھنا نہیں چاہتا ـــ جیسے ہی یہ شادی کرنا چاہیں فوراً انتظام کر دو۔"

رات کو اسے نیند نہ آئی۔ اور گھر میں کوئی گڑبڑ ہونے پر جیسی کہ اس کی عادت تھی، صبح اٹھتے ہی اس نے کپڑا لتّا ایک طرف پھینکا اور کھرپا اٹھا کر کھیت چل دیا۔ برآمدے میں اس نے اپنی پگلی بٹیا کو دیکھا جو رسّی کے بل کھولتی ہوئی آپ ہی آپ مسکرا رہی تھی۔ وانگ لنگ سوچنے لگا: "سب لوگ مل کر بھی اتنا آرام نہیں پہنچاتے، اکیلی یہ دیوانی وہ کام کرتی ہے۔"

کئی دن لگاتار وہ کھیت پر کام کرتا رہا۔ خاک پاک نے پھر مسیحائی کی۔ دھوپ نے اسے صحت بخشی اور لُو کے جھونکوں نے سکون دیا۔ اتنے میں اس کی خود بینی کی بیخ کنی کے لیے ایک روز دکن سے بادل کا

ایک ٹکڑا اڑکر اِدھر آیا پہلے تو وہ اُفق پر کہر کی چادر کی طرح لٹکا رہا۔ ہَوا سے اڑائے ہوئے بادلوں کی طرح یہاں وہاں نہ جاکر ایک جگہ جما رہا اور پھر پنکھے کی طرح آسمان پر پھیل گیا۔

دیہات کے لوگوں کی نظر اسی پر گڑی تھی اور زبان پر اس کا ذکر تھا۔ کیونکہ ہراس سے ان کے دل بیٹھے جا رہے تھے۔ وہ ڈر رہے تھے کہ یہ ٹڈّی دل ہی جو فصل کا ناس کرنے آیا ہی۔ وانگ لنگ بھی یہ تماشا دیکھتا رہا۔ اسی وقت ان کے قریب کوئی چیز پٹ سے آکر گری۔ کسی نے جلدی سے اٹھا کر دیکھا کہ یہ ایک مردہ ٹڈّی تھی۔

اب تو وانگ لنگ کی اور سب پریشانیاں ہوا ہوگئیں۔ بیوی، بچّے یہاں تک کہ چچا کی بھی یاد نہ رہی۔ گھبرائے ہوئے دیہاتیوں کے پاس جاکر وہ چلّایا: "آؤ، اپنی دھرتی کے ان بیریوں کو ہم مار بھگائیں"۔

لیکن ان میں سے کچھ نے مایوسی سے سر ہلا کر کہا:

"نہیں اس سے فائدہ ہی کیا۔ جب قسمت کا نوشتہ آگیا کہ اس سال ہم بھوکے رہیں تو ہماری جدّوجہد سے کیا ہو سکتا ہی۔ انجام تو فاقہ ہی ہی"۔

عورتیں روتی ہوئی اگر خریدنے شہر گئیں اور اس کی دھونی اُس چھوٹے سے مندر کے دیوتاؤں کو دی۔ کچھ شہر کے بڑے مندر کو گئیں۔ جہاں آسمانی معبودوں کے بُت تھے اور اس طرح زمین و آسمان کے سب خداؤں سے دعا مانگی جانے لگی۔

اس کے باوجود زمین و آسمان پر ٹڈّی دل کی عملداری بڑھتی گئی۔ یہ حال دیکھ کر وانگ لنگ نے اپنے مزدوروں کو جمع کیا۔ چنگ اس کے پاس مستعد کھڑا ہی ہوا تھا۔ ان کے ساتھ کچھ جوان کسان

بھی مل گئے۔ دن رات کی محنت کے بعد انھوں نے کئی کھیتوں میں آگ لگا دی جہاں فصل تیار کھڑی تھی اور آس پاس نالی کھود کر اس میں پانی بھر دیا۔ اولان اور دوسری عورتیں ان کے لیے کھانا لائیں۔ حیوانوں کی طرح کھیت میں کھڑے کھڑے مردوں نے یہ چبینا چبایا اور پھر کام سے لگ گئے۔

یک بیک فضا پر تاریکی چھا گئی۔ لاتعداد پنکھوں کی پھڑپھڑاہٹ سے ایک گونج اور گرج سی پیدا ہوئی۔ ٹڈیاں زمین پر گرتیں، کبھی اس کھیت پر کبھی اُس کھیت پر بیٹھتیں اور انھیں چشم زدن میں چٹ کر جاتیں۔ کسان یہ منظر دیکھ کر سر ہلاتے اور کہتے۔ یہ مشیت ایزدی ہے۔ لیکن وانگ لنگ کے غصّے کا حال نہ پوچھو۔ وہ ٹڈیوں کو کچلتا روندتا رہا اور اس کے کارندے انھیں مشعلوں سے بھونتے رہے۔ اُدھر آگ اور پانی میں ہزارہا ٹڈیوں کا صفایا ہوگیا۔ اس طرح گو کروڑوں ٹڈیاں فنا ہوگئیں لیکن جو بچ رہیں وہ ان سے بھی زیادہ تھیں۔

بہرحال اس انتھک محنت کا وانگ لنگ کو یہ انعام ملا کہ اس کے سب سے زرخیز کھیت بچ گئے۔ جب یہ بلا ٹل گئی اور ان سب کو دم لینے کی مہلت ملی تو وانگ لنگ نے دیکھا کہ اب بھی اس کی زمین میں خاصا اناج باقی ہے۔ اب کئی کسان بھنی ہوئی ٹڈیوں کو مزے لے لے کر کھانے لگے۔ مگر وانگ لنگ نے انھیں ہاتھ بھی نہ لگایا کیونکہ اپنی بدخصلتی کی وجہ سے وہ جانور اس کے نزدیک قطعاً مکروہ تھا۔ البتہ جب اولان نے انھیں تیل میں تلا اور مزدوروں نے دال موٹھ کی طرح ان کا چبینا کیا یا جب بچوں نے ان کے پھٹے ہوئے دیدوں سے ڈرتے ڈرتے انھیں چکھا تو وانگ لنگ نے

منع نہ کیا۔ بس خود اسے ان کے کھانے سے انکار تھا۔

ایک طرح ٹڈی دل کے دھاوے سے اسے فائدہ ہی ہوا۔ متواتر سات روز کھیتی باڑی کی فکر کرتے کرتے وہ اپنی پریشانیوں کو بھول گیا۔ دل کو اس نے سمجھایا: "مصائب ہر آدمی کے ساتھ ہیں اور مجھے بھی انھیں سہنے کا سلیقہ سیکھنا چاہیے۔ چچا کی زندگی اب کتنی رہ گئی۔ خدا چاہے تو مجھ سے پہلے مر کھپ جائیں گے۔ رہ گیا اس لونڈے کا قصہ سو اسے جوں توں کرکے یہ تین سال تیر کرنے ہی ہیں۔"

جب تک گیہوں کی کٹائی ختم ہو برکھا رُت آگئی۔ آبی زمین میں چاول کے ہرے پودے بوئے گئے۔ اور پھر گرمیاں آگئیں۔



باب ۲۴

وانگ لنگ اب مگن تھا کہ سب ٹنٹے بکھیڑوں سے چھٹکارا ملا۔ مگر ایک دن دوپہر کو جب وہ کھیت سے گھر لوٹا تو اس کے بڑے لڑکے نے کہا:

"ابا، اگر مجھے علم ہی حاصل کرنا ہے تو اب وہ بڈّھا کھوسٹ مجھے اور کچھ نہیں سکھا سکتا۔"

وانگ لنگ نے باورچی خانے میں گرم پانی کی بالٹی میں تولیا بھگویا اور اس سے منہ دھوتے ہوئے پوچھا:

"تو تمھارا ارادہ کیا ہے؟"

کچھ ہچکچاہٹ کے بعد لڑکے نے کہا:

"اگر مجھے علم حاصل کرنا ہے تو دکن جاکر وہاں کسی بڑے اسکول میں داخل ہونا چاہیے کیونکہ وہاں اس کا باقاعدہ انتظام ہے۔"

وانگ لنگ نے تولیے سے ہاتھ منہ پونچھتے اور بھاپ کے بادل اڑاتے ہوئے درشتی سے کہا ــــ اس وجہ سے کہ دن بھر کی محنت نے اسے تھکا مارا تھا:

"تمھیں یہ کیا خبط سوجھا ہے؟ میں تمھیں دکن نہ جانے دوں گا، ایک بات کہہ دی اور قصہ ختم ہوا۔ یہاں علم ولم کی کمی نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر پھر اس نے تولیا پانی میں بھگویا اور اسے نچوڑنے لگا۔ لیکن وہ نوجوان وہیں کھڑا رہا اور نفرت آگیں نگاہوں سے اپنے

باپ کو گھورتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔ اسے نہ سن سکنے کی وجہ سے وانگ لنگ اور بھی بپھرا۔ ڈانٹ کر بولا:

"جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کیوں نہیں کہتا؟"

اس ڈانٹ نے جلے پر نمک کا کام کیا اور لڑکے نے بگڑ کر کہا:

چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے لیکن میں تو دکن جاؤں گا۔ اس بیہودہ مکان میں مجھ سے بچوں کا سا برتاؤ کیا جاتا ہے اور یہ شہر دیہات سے بھی بدتر ہے۔ میں دنیا دیکھنا اور کچھ سیکھنا چاہتا ہوں"

وانگ لنگ نے پہلے اس لڑکے کو اور پھر اپنے آپ کو دیکھا۔ نرم و سفید چکن کا ڈھیلا ڈھالا جامہ اس کے تن پر تھا اور گرمیوں میں اسے پہن کر راحت ہوتی تھی۔ سبزہ آغاز کا زمانہ تھا، اس کی جلد سنہری اور چکنی تھی، لمبی آستینوں میں چھپے ہوئے ہاتھ عورتوں کے ہاتھوں کے سے ملائم اور نازک تھے۔ وانگ لنگ کا بدن گٹھیلا اور اس وقت مٹی میں سنا ہوا تھا وہ روئی کا موٹا جھوٹا نیلا پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ جو گھٹنوں تک چڑھا ہوا تھا اور اوپر کا جسم ننگا تھا۔ دھوکا ہوتا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کا باپ نہیں بلکہ خادم ہے۔ یہ خیال آتے ہی وانگ لنگ کو اپنے بیٹے کی آن بان سے نفرت سی ہوئی اور اس نے تیکھے پن سے کہا:

"میاں صاحب زادے، اس روپ میں تم مرد نہیں عورت معلوم ہوتے ہو۔ زرا کھیتوں میں جاکر ہاتھ پانو چلاؤ اور روٹی کماؤ۔ باتیں بنانے سے کیا حاصل؟"

اس وقت وانگ لنگ کو مطلق یاد نہ رہا کہ اپنے بیٹے کی قابلیت

پر کبھی وہ فخر کرتا تھا۔ ننگے پانو پٹک کر اور جڈ پن سے تھوکتے ہوئے وہ باہر چلا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لڑکے کا ستھرا پن اسے دم بھر کے لیے سخت ناپسند ہوا۔ نوجوان وہیں بُت بنا کھڑا خشمگیں نگاہوں سے اپنے باپ کو دیکھتا رہا۔ لیکن باپ نے لوٹ کر بھی اس پر نگاہ نہ ڈالی۔

رات کو جب وانگ لنگ کمل کے پاس گیا تو وہ پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی اور کویل پنکھا جھل رہی تھی۔ کمل نے باتوں باتوں میں یہ ذکر چھیڑا:

"تمھارا بڑا بیٹا یہاں کی زندگی سے بیزار ہو گیا ہی اور باہر جانا چاہتا ہی۔"

ابھی وانگ لنگ کا غصہ تازہ تھا اور وہ بگڑ کر بولا:

"تمھیں ان باتوں سے کیا غرض؟ اب اس کی عمر اتنی ہو گئی ہی کہ اس کا یہاں آنا جانا مجھے پسند نہیں۔"

کمل نے جلدی سے کہا: "نہیں نہیں، یہ مجھے کویل سے معلوم ہوا۔"

اور کویل نے فوراً بات بنائی: "یہ کوئی چھپی ہوئی بات ہی! کوئی بھی آنکھوں والا دیکھ سکتا ہی کہ وہ خوب صورت ہی اور اس عمر میں کاہلی کی وجہ سے بیزار ہو جانا فطری امر ہی۔"

اس جواب نے وانگ لنگ کا خیال بٹا دیا۔ البتہ بیٹے کے تئیں اس کا غصہ باقی رہا اور وہ بولا: "نہیں وہ نہیں رہے گا۔ اپنی گاڑھی کمائی میں واہی تباہی کاموں میں نہیں لٹا سکتا۔" اس سے زیادہ وہ کچھ نہ بولا اور جب کمل نے دیکھا کہ اس پر کسی واقعے کے سبب سے اشتعال کا عالم ہی تو اس نے کویل کو چلتا کر کے وہاں تخلیہ کر لیا۔

کئی روز اس موضوع پر گفتگو نہ ہوئی اور یہ گمان ہونے لگا کہ لڑکے کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ البتہ اسکول جانے سے اسے انکار تھا اور اس معاملے میں وانگ لنگ نے بھی کوئی ضد نہ کی۔ کیونکہ لڑکا اب اٹھارہ سال کا تھا اور ماں کی طرح ہڈیاں دوہری تھیں۔ جب باپ گھر کو لوٹتا تو وہ کمرے میں مطالعے میں مصروف ملتا۔ اور باپ اطمینان سے سوچتا:

"یہ بھی جوانی کی ترنگ تھی کیونکہ خود وہ نہیں جانتا کہ چاہتا کیا ہے۔ صرف تین سال کی بات ہے۔ ممکن ہے کہ تھوڑی سی چاندی دکھانے پر یہ مدت دو یا ایک برس تک مختصر ہو جائے۔ ذرا یہ فصل کٹ جائے اور گیہوں بو دیے جائیں، سیموں کی بیل تیار ہو جائے تو میں ادھر توجّہ کروں۔"

وانگ لنگ کو بیٹے کا دھیان بھی نہ رہا کیونکہ ٹڈّی دل کے دھاوے کے باوجود فصل بالکل تباہ نہ ہوئی تھی اور کمل بائی کے چلتروں میں اس کا جو روپیہ اٹھا تھا، اب اس کی کمی پوری ہو گئی تھی۔ از سرِ نو اسے زر پیسے کا چسکا پڑ گیا اور تنہائی میں اکثر اسے حیرت ہوا کرتی کہ میں نے ایک عورت پر یوں اندھا دھند خرچ کیسے کر دیا۔

تاہم گاہے گاہے، یہ عورت اس کے جذبات میں ہیجان سا ڈال دیتی اور گو اس میں پرانا ولولہ نہ ہوتا لیکن ایک میٹھا سا درد ضرور تھا۔ حالانکہ اب چچی کے قول کی صداقت اسے نظر آنے لگی تھی کہ اپنی سیم تنی کے باوجود کمل کم عمر نہیں ہے اور اب تک وہ نری بانجھ تھی، پھر بھی وانگ لنگ کو اس کی ملکیت پر ناز تھا۔ اُس کے

بانجھ پن کا اسے افسوس نہ تھا کیونکہ گھر میں اولاد کی کمی نہ تھی۔ اس کی محبّت کا لطف ان تمام عیبوں کا بدل تھا۔

بھرپور جوانی پر پہنچ کر کمل کا رنگ روپ اور بھی نکھر آیا۔ کیونکہ اس میں اگر کوئی عیب تھا تو وہ یہ کہ وہ زرا دبلی تھی جس کی وجہ سے اس کے نکیلے چہرے کے خدوخال ضرورت سے زیادہ نمایاں ہو جاتے تھے اور کنپٹی پر گڑھے پڑ جاتے تھے۔ لیکن اب کویل کے پکائے ہوئے پکوان کھا کھا کر اور صرف ایک مرد کی چاکری کی وجہ سے جو اسے آرام ملا تو اس کا جسم گداز ہو چلا۔ چہرہ بھر آیا اور چھوٹے سے دہانے اور بڑی بڑی آنکھوں کی وجہ سے وہ ننھی سی گول مٹول بلّی معلوم ہونے لگی۔ وہ کھاتی اینڈتی پڑی رہتی تھی اور اس کے جسم پر نرم نرم گوشت کی تہیں چڑھتی جاتی تھیں۔ اب وہ پھول کی کلی نہیں گل شگفتہ تھی۔ نہ اس کی جوانی چڑھتی ہوئی تھی نہ اترتی ہوئی۔ اور واقعہ تو یہ ہے کہ اس کے لیے جوانی اور پیری یکساں تھی۔

اب جو زندگی پُرامن ہو گئی اور لڑکے کو قرار آگیا تو وانگ لنگ کو اطمینان ہونا چاہیے تھا۔ لیکن ایک رات جب وہ اکیلے بیٹھ کر فروختنی اناج کا حساب لگا رہا تھا تو اولان چپکے سے کمرے میں گھس آئی۔ اب وہ نحیف ہو گئی تھی، گالوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ اگر کوئی اس سے طبیعت کا حال پوچھے تو اس کے پاس بس ایک جواب تھا:

"میرے پیٹ میں آگ لگی رہتی ہے۔"

تین سال سے اس کا پیٹ اس قدر بڑھ گیا تھا جیسے اس میں

بچہ رکھا ہوا ہو، بس وہ پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن ہر صبح بلاناغہ وہ اٹھتی اور اپنا کام انجام دیتی ۔ وانگ لنگ کے لیے اس کی موجودگی اور کسی کرسی، میز یا پیڑ کے وجود میں کوئی فرق نہ تھا۔ اپنے مویشیوں پر اس کی توجہ کہیں زیادہ رہتی تھی ۔ وہ تن تنہا اپنا کام کرتی اور کوئل سے کبھی بات نہ کرتی، پچی تک سے وہ مجبوری کی حالت ہی میں بولتی تھی ۔ اندرون دالان میں آج تک اولان نے قدم بھی نہ رکھا تھا اور اگر کمل کبھی گھر کے دوسرے حصوں میں نکل آتی تو اولان اپنے کمرے میں بند ہو جاتی، اور جب تک وہ چلی نہ جاتی باہر نہ نکلتی تھی۔ وہ ہمیشہ چپ رہتی۔ کھانا پکاتے اور کپڑے دھوتے اس کا وقت گزرتا تھا۔ سردیوں میں بھی جب باولی کا پانی جم جاتا تھا وہ دھلائی سے باز نہ آتی تھی۔ لیکن وانگ لنگ نے جھوٹے منہ بھی کبھی یہ نہ کہا کہ جب گھر میں روپوں کی کمی نہیں تو تم کوئی ماما کیوں نہیں رکھ لیتیں یا باندی کیوں مقرر نہیں کر لیتیں ؟

حالانکہ کھیتوں میں مزدور اور مویشیوں پر نوکر رکھے جاتے تھے اور گرمیوں میں جب ندی امنڈ آتی تو بطخوں اور ہنسوں کی حفاظت کے لیے آدمی تعینات کیے جاتے تھے، مگر اولان کی مدد کے لیے کسی کو رکھنے کا اسے خیال بھی نہ آیا ۔

ذکر اس شام کا تھا جب وانگ لنگ سرخ قندیلوں کی روشنی میں تنہا بیٹھا ہوا تھا، اولان سامنے آ کھڑی ہوئی اور ادھر ادھر دیکھ کر بولی :

"مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔"

تعجّب سے اس کی طرف دیکھ کر وانگ لنگ نے کہا۔

"ہاں ہاں، شوق سے۔"

پھر وہ اس کے سوکھے چہرے کو دیکھ کر سوچنے لگا کہ اولان کتنی بے حس ہی اور اسی لیے برسوں سے میری طبیعت اس کی طرف راغب نہیں ہوئی۔

اولان نے آہستہ سے کہا:

"بڑا لڑکا اکثر کمل کے ہاں جایا کرتا ہی۔ جب تم گھر پر نہیں ہوتے تو وہ وہیں رہتا ہی۔"

پہلے تو وانگ لنگ کی سمجھ میں آیا ہی نہیں کہ وہ ہونٹوں ہونٹوں میں کیا بڑبڑا رہی ہی۔ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور جھک کر پوچھا:

"ایں، کیا کہا؟"

اولان نے پہلے بیٹے کی کوٹھری اور پھر کمل کے دالان کی جانب اشارہ کیا۔ لیکن وانگ لنگ تنا کا تنا رہا اور اسے خاک یقین نہ آیا۔

"یہ تمھاری خام خیالی ہی!" اس نے دیر کے بعد کہا۔

اولان نے سر ہلا کر وہ جملے ادا کیے جو بمشکل اس کے گلے سے نکل رہے تھے:

"اگر یہ سمجھتے ہو تو ایک دن اچانک آکر دیکھ لو۔" پھر ذرا دیر چپ رہ کر ——— "اس سے اچھا یہی ہی کہ وہ دکن چلا جائے۔" یہ کہہ کر وہ میز پر جھکی اور چائے کی پیالی کو چھو کر دیکھا۔ اس میں جو ٹھنڈی چائے تھی اسے نیچے پھینک کر پھر سے گرم چائے بھر دی۔ پھر اسے عالم حیرت میں چھوڑ کر وہ چپ چاپ اپنی راہ چلی گئی۔

وانگ لنگ نے سوچا کہ جلاپے کے مارے اولان نے یہ قصّہ گھڑا ہی۔ جب لڑکا اطمینان سے ہر شام کو اپنی کوٹھری میں مطالعے میں مصروف ہو تو وہ اس الزام پر یقین کیسے لے آئے۔ اٹھ کر وہ ہنسنے لگا اور اس وسوسے کو بالائے طاق رکھ کر سوچنے لگا کہ عورتیں بھی کتنی تنگ خیال ہوتی ہیں۔

لیکن رات کو جب وہ کمل کی آغوش میں لیٹا تو وہ بددماغی سے بڑبڑانے لگی اور اسے دھکّا دے کر بولی:

"توبہ، کیسی گرمی ہی اور تم سے یہ بو کیسی آرہی ہی۔ میرے پاس آنے سے پہلے خدارا نہا لیا کرو۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھ بیٹھی اور چڑچڑے پن سے اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارنے لگی۔ اس موقعے پر جب وہ اسے لپٹانا چاہتا تھا وہ شتر غمزے کرنے لگی اور اس کی لاکھ خوشامدوں کے باوجود ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اب وانگ لنگ دم سادھ کر پڑ رہا کیونکہ اسے یاد آیا کہ کئی راتوں سے یہ عورت کتنی بددلی سے اس کے آغوشِ شوق میں آئی تھی۔ اب تک وہ اس بیزاری کو اس کی ترنگ اور گرمی کی شدت پر محمول کیا کرتا تھا۔ لیکن اس وقت اولان کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے اور بھنّا کر وہ اٹھ بیٹھا۔

"یہ بات ہی تو اکیلی کھاٹ توڑو۔ میری جوتی کو بھی پروا نہیں۔"

پانو پٹکتے ہوئے وہ یہاں سے نکلا اور اپنے گھر کے دیوان خانے میں آکر دو کرسیاں جوڑیں اور ان پر پڑ رہا۔ لیکن جب کسی طرح نیند نہ آئی تو وہ سرِ دیوار بانسوں کے جھرمٹ میں ٹہلنے لگا۔ وہاں اس کے

تپتے ہوئے جسم کو نسیمِ شب نے سکون دیا۔ جس میں آنے والی بہار کی خنکی بھیگی ہوئی تھی۔

یک بیک وہ سوچنے لگا کہ کمل کو یہ کیوں کر معلوم ہوا کہ میرا بیٹا پردیس جانا چاہتا ہے۔ کچھ عرصے سے لڑکے نے بھی اس ارادے کا تذکرہ نہ کیا تھا اور بلا وجہ مطمئن نظر آنے لگا تھا، بھلا اس کا سبب کیا ہو سکتا تھا۔ وانگ لنگ نے طیش سے کہا:

"میں اپنی آنکھوں سے اس معاملے کی تصدیق کروں گا۔"

کھیتوں پر چھائی ہوئی کہر کو چیر کر صبح کی لالی نظر آنے لگی۔ جب پو پھٹ چکی اور سورج کی سنہری رتھ افق پر نمودار ہوئی تو گھر جا کر اس نے ناشتہ کیا۔ پھر اپنے کارندوں کے معائنے کے لیے چل پڑا۔ جیسا کہ کٹائی اور بوائی کے وقت اس کا دستور تھا۔ کھیتوں میں یہاں وہاں ٹہلنے کے بعد اس نے زور سے یہ صدا لگائی تاکہ گھر کے سب لوگ بھی سن سکیں:۔

"میں شہر پناہ والی کھائی کے کھیت کو دیکھنے جا رہا ہوں اور دن چڑھے لوٹوں گا۔" یہ کہہ کر وہ شہر کی جانب چل کھڑا ہوا۔

لیکن آدھی راہ جا کر دھرتی ماتا کے مندر کے مقابل وہ ایک ٹیلے پر بیٹھ گیا۔ دراصل یہ ایک بھولی بسری پرانی قبر تھی۔ گھاس کا ایک تنکا توڑ کر اسے انگلیوں میں لپیٹتے ہوئے وہ غور کرنے لگا۔ ٹھیک سامنے وہ چھوٹے چھوٹے دیوتا تھے جو اسے گھور رہے تھے۔ کسی زمانے میں وہ ان کا خوف کھاتا تھا لیکن اب خوش حالی نے اسے لاپروا بنا دیا تھا اور اسے ایسے دیوتاؤں کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لہٰذا اس نے

انھیں آنکھ اٹھا کر دیکھا تک نہیں، دل ہی دل میں وہ ادھیڑ بُن میں لگا رہا:

"واپس لوٹوں یا نہیں؟"

اتنے میں اسے پچھلی رات اور کمل کی بے التفاتی یاد آئی۔ اپنی مہربانی اور اس کی بے مہری کے خیال سے وہ برہم ہوا اور سوچنے لگا: "چائے خانے میں وہ زیادہ عرصے جیتی نہیں بچتی۔ یہاں میں اسے رانیوں کی طرح رکھتا ہوں۔"

طیش کے مارے وہ اٹھا اور دوسرے راستے سے گھر کی جانب لوٹا۔ پوشیدہ طور سے اندر داخل ہو کر وہ دیوان خانے اور اندرونی دالان کے مابین پردے کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ کان لگا کر سنا تو کسی مرد کے بولنے کی آواز آئی۔ یہ اس کے بیٹے کی آواز تھی۔

آج تک وانگ لنگ کو اس قسم کا غصہ نہ آیا ہوگا۔ یہ سچ ہے کہ دولت کے ساتھ اس میں وہ جھجک نہ رہی تھی جو کسانوں میں ہوتی ہے۔ بات بات پر اسے جوش آتا تھا اور شہر میں بھی وہ اپنی اکڑ سے باز نہ آتا تھا۔ لیکن یہ وہ غصہ تھا جو ایک مرد کے دل میں دوسرے مرد کے خلاف کسی محبوبہ کی خاطر بھڑکتا ہے۔ اور جب وانگ لنگ کو خیال آیا کہ یہ مرد اس کا سگا بیٹا ہے تو اسے روح فرسا وحشت ہونے لگی۔

دانت کٹکٹاتے ہوئے وہ باہر آیا اور ایک لپلپاتا ہوا بانس توڑ کر اس کی پتیاں صاف کیں۔ یہ بانس سبک اور سخت تھا اور اب اس میں کوئی پتی نہ تھی۔ پنجے دباتے ہوئے وہ آگے بڑھا اور یک بیک پردہ کھینچ کر الگ کر دیا۔ اس کا بیٹا کھڑے کھڑے کمل کو دیکھ رہا تھا جو حوض کے پاس ایک تپائی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ کمل ایک نظر افروز ریشمی لبادے

میں ملبوس تھی اور آج تک اس نے صبح کے وقت اُسے اس چھب میں نہ دیکھا تھا۔

وہ دونوں راز و نیاز کی باتیں کر رہے تھے۔ عورت مسکرا کر ٹیڑھی چتون سے نوجوان کو دیکھتی اور وہ دونوں ایسے مگن تھے کہ انھیں وانگ لنگ کی بھنک بھی نہ ملی۔ اس کا چہرہ بے رنگ ہو گیا تھا اور ہونٹ اور چڑھ آئے تھے۔ ہاتھ میں بانس تھرتھرا رہا تھا۔ پھر بھی ان دونوں کو اس کی آہٹ نہ ملی اور کبھی نہ ملتی اگر کوئل ناگہاں ادھر نہ آنکلتی اور اسے دیکھ کر چیخ نہ پڑتی۔

وانگ لنگ لڑکے پر جھپٹ پڑا اور اسے تابڑ توڑ پیٹنا شروع کر دیا۔ حالانکہ لڑکا دراز قد تھا۔ مگر باپ کا جسم محنت کی وجہ سے مضبوط اور گٹھیلا تھا۔ لڑکے کو اس نے پیٹتے پیٹتے لہو لہان کر دیا۔ کمل نے روتے ہوئے اس کے بازو تھام لیے۔ پہلے تو وانگ لنگ نے اسے دھکا دیا لیکن جب وہ پھر چیں چیں کرتی ہوئی اس سے لپٹ جھپٹ کرنے لگی تو اس نے اس کی بھی خوب مرمّت کی اور اسے بھاگتے ہی بنی۔ لڑکے کو اس نے اتنا پیٹا کہ وہ اپنے زخمی چہرے کو منہ میں چھپائے ہوئے زمین پر گر پڑا۔

جب وانگ لنگ کا ہاتھ رکا تو وہ بری طرح ہانپ رہا تھا اور پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ اسے ایسی کمزوری محسوس ہو رہی تھی گویا ابھی بیماری سے اٹھا ہو۔ بید پھینک کر اس نے ہانپتے ہوئے، اپنے بیٹے سے کہا:

اپنی کوٹھری میں جا اور تب تک وہاں سے نکلنے کا نام نہ لے جب تک میں تجھے یہاں سے دفان کرنے کا انتظام نہ کرلوں۔ ورنہ

تیری جان کی خیر نہیں ۔“

لڑکا چپ چاپ اٹھ کر چل دیا ۔

وانگ لنگ کمل کی تپائی پر بیٹھ گیا ۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سر ہاتھوں میں چھپا ہوا تھا اور سانس بالکل پھول گیا تھا ۔ کوئی اس کے قریب نہ آیا اور وہ تب تک اکیلے بیٹھا رہا جب تک دم میں دم نہ آگیا ۔ دیر کے بعد اس کا غصّہ ٹھنڈا پڑا اور وہ اپنے آپے میں آیا ۔

جب وہ اٹھا تو نڈھال ہو گیا تھا ۔ کمرے میں کمل پلنگ پر لیٹی ہوئی زار زار رو رہی تھی ۔ وانگ لنگ نے اس کا منہ اپنی طرف کیا تو اس پر بید کی اٹھی ہوئی بدّھیں جھلک رہی تھیں ۔

یہ کہتے ہوئے اس کا دل بھر آیا :

”تو کبھی اپنی آوارگی سے باز نہ آئے گی ، کیوں ؟ اب تو میرے بیٹوں کو بدمعاشی سکھا رہی ہے ۔“

یہ سن کر وہ بلک بلک کر رونے لگی :

”اس میں میرا کوئی قصور نہیں ۔ جب لڑکے کو تنہائی محسوس ہوتی تو وہ یہاں آجاتا ۔ اور تم کویل کو قسم دے کر پوچھ لو جو کبھی اس نے میرے پلنگ کی پٹی بھی چھوئی ہو ۔“

سہمتے ہوئے اسے کن انکھیوں سے تاک کر بڑی معصومیت سے وہ اس کے ہاتھ بھینچنے لگی اور اپنے چہرے پر رکھ کر بولی :

”دیکھو تم نے اپنی کمل کے ساتھ کیا کیا ! ۔ دنیا میں تمھارے سوا میں کسی مرد کو نہیں جانتی ۔ اگر وہ تمھارا بیٹا ہی تو ہوا کرے ، مجھے اس سے کیا غرض !“

کمل کی اشک بار آنکھیں اس کی طرف اٹھیں تو وانگ لنگ کراہ

پڑا کیونکہ اس عورت کے حسن کے آگے وہ بے بس تھا اور اس گھڑی بھی اس کی محبت کم نہ ہو سکی۔ طرفہ یہ کہ اسے افسوس ہونے لگا کہ یہ بھید مجھ پر کیوں کھلا، اگر مجھے اس کا علم نہ ہوتا تو اچھا تھا!!۔ ایک آہ بھر کر وہ باہر چل دیا، اور اپنے بیٹے کی کوٹھری کے آگے رک کر بولا:

"اپنا بوریا بدھنا باندھو اور کل دکن کی راہ لو۔ وہاں جو جی چاہے کرنا اور تب تک گھر کا رُخ نہ کرنا جب تک میں نہ بلاؤں۔"

باہر اولان اپنے شوہر کے کسی کپڑے میں پیوند لگا رہی تھی۔ اسے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھ کر بھی وہ کچھ نہ بولی اور یوں چپ رہی گویا اس مار دھاڑ اور ہائے پکار کی اسے کوئی خبر ہی نہ تھی۔ گو سورج سر پر آ گیا تھا لیکن وانگ لنگ نے اپنے کھیتوں میں جا کر دم لیا۔ لیکن وہ ایسا تھک گیا تھا گویا دن بھر کام کرتا رہا ہو۔



باب ۲۵

جب بڑا بیٹا جا چکا تو وانگ لنگ کو محسوس ہوا کہ گھر کی آب و ہوا اعتدال پر آگئی اور اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ دل میں وہ خوش ہوا کہ چلو ایک مصیبت ٹلی۔ اب مجھے اپنے دوسرے بچوں کی دیکھ ریکھ کی فرصت ملے گی۔ کیونکہ کھیتی باڑی کے جھگڑوں نے آج تک اسے اتنی مہلت ہی نہ دی تھی کہ دوسرے بچوں کی خبر گیری کرے۔ اب اس نے تہیہ کیا کہ چھوٹے بیٹے کو جلد مدرسے سے نکال کر کسی روزگار سے لگا دینا چاہیے۔ کیونکہ اگر اس پر بھی جوانی کا بھوت چڑھا تو گھر میں رہنا دوبھر ہو جائے گا۔

وانگ لنگ کے چھوٹے اور بڑے بیٹے میں بُعدِ مشرقین تھا۔ بڑا بیٹا اپنی ماں پر پڑا تھا اور اہل شمال کی طرح گٹھیلا اور لم تڑنگ تھا، اور اس کے چہرے پر سرخی تھی۔ لیکن چھوٹا پستہ قد، دبلا پتلا اور زرد رو تھا۔ اس میں کوئی بات ایسی تھی جو وانگ لنگ کو بڑے میاں کی یاد دلاتی تھی۔ یہ تیز چالاک اور شریر آنکھیں تھیں جن میں موقع موقع سے خبث کی جھلک بھی آجاتی تھی۔ وانگ لنگ نے سوچا:

یہ لڑکا کاروبار کے لیے پیدا ہوا ہے۔ میں اسے اسکول سے نکال کر اناج منڈی میں کہیں کام سے لگوا دوں۔ اس کے وہاں رہنے سے مجھے بھی فایدہ ہوگا کیونکہ جب میں اناج بیچنے لے جاؤں گا تو وہ ترازو پر نظر رکھ سکتا ہے اور تھوڑی سی ڈنڈی بھی مار سکتا ہے۔"

اس لیے ایک روز اس نے کویل سے کہا:

"میرے بڑے بیٹے کے سسرے سے جاکر کہو کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ جب ہم دونوں کا خون آگے چل کر ملنے والا ہے تو وہ میرے ساتھ شراب کا ایک پیالہ کیوں نہ پی لیں۔"

کویل نے لوٹ کر کہا:

جب بھی آپ چاہیں وہ بخوشی مل سکتے ہیں۔ آج دوپہر کو ہی آپ وہاں شراب پینے کیوں نہ چلے جائیں۔ یا آپ کہیں تو وہ خود یہاں تک چلے آئیں۔"

لیکن وانگ لنگ سوداگر کو اپنے گھر نہیں بلانا چاہتا تھا کیونکہ اس کے لیے ہر قسم کی تیاری درکار تھی۔ اس لیے نہا دھو کر اور ریشم کا لبادہ پہن کر وہ کھیتوں سے ہو کر اس کے ہاں چل پڑا۔ کویل کی ہدایت کے مطابق وہ پلوں والی سڑک سے گیا اور وہاں اس مکان کے سامنے رک گیا جس پر 'لیو' کا نام کندہ تھا۔ خود تو وہ نہ پڑھ سکا لیکن پل کے داہنے دو مکان چل کر وہ دروازے کو پہچان گیا اور راہ گیروں سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ 'لیو' کا نام ہے۔ یہ لکڑی کا دروازہ خاصا شاندار تھا۔ وانگ لنگ نے اس پر دستک دی۔

ایک نوکرانی نے ایپرن (پیش جامے) سے اپنے گیلے ہاتھ پونچھتے ہوئے آنے والے کا نام دریافت کیا۔ نام سنتے ہی اس کی آنکھیں کھل پڑیں اور ہاتھوں ہاتھ اسے پہلے دالان میں لائی جہاں مردانہ تھا۔ ایک کمرے میں لے جاکر اس نے بصد احترام اسے بٹھایا کیونکہ وہ سمجھ گئی کہ یہ بر کا باپ ہے۔ پھر وہ اپنے آقا کو خبر کرنے چلی گئی۔

وانگ لنگ نے غور سے ادھر اُدھر نظر ڈالی۔ کبھی پردوں کے کپڑے کو اور کبھی میز کی لکڑی کو چھو کر دیکھا وہ خوش ہوا کیونکہ سازوسامان سے دولت کی بہتات تو نہیں مگر خوشحالی عیاں تھی۔ اسے امیرزادی بہو پسند بھی نہ تھی مبادا وہ نافرماں بردار اور ناک چڑھی ہو، نئے نئے کپڑے لتے کے لیے ضد کرے اور بیٹے کو اپنے ماں باپ سے جدا کردے۔ اس کے بعد وانگ لنگ بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا۔

اتنے میں کسی کے بھاری بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور ایک معمر مگر مضبوط آدمی اندر داخل ہوا۔ وانگ لنگ نے اٹھ کر سلام کیا اور دونوں نے جھک کر کورنش کی۔ اس دوران میں کن انکھیوں سے دونوں ایک دوسرے کا جائزہ لیتے رہے اور ایک دوسرے کو پسند کیا۔ کیونکہ دونوں خوشحال اور شریف تھے۔ پھر بیٹھ کر وہ گرم شراب پینے لگے جو نوکرانی نے ان کے سامنے رکھ دی تھی پہلے تو ان میں ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، فصل، موسم اور بازار کا چرچا رہا۔ آخر میں وانگ لنگ نے کہا:

"اصل بات یہ ہے کہ میں ایک غرض سے آپ کے یہاں آیا ہوں۔ اگر آپ کو میری تجویز پسند نہ آئے تو کوئی ہرج نہیں۔ اگر آپ کو اپنی اناج منڈی میں کسی نوکر کی ضرورت ہے تو میرا چھوٹا بیٹا حاضر ہے۔ وہ بڑا سیانا اور سرتا ہے۔ لیکن اگر آپ کو اس کی ضرورت نہیں، تو پھر اس قصے کو چھوڑیے۔"

سوداگر نے ہنس کر جواب دیا:

"میں خود ایک ہوشیار نوجوان کی تلاش میں تھا، شرط بس یہ ہے

کہ وہ پڑھ لکھ سکتا ہو۔"

اب وانگ لنگ نے گھمنڈ سے کہا:

"میرے دونوں بیٹے عالم فاضل ہیں۔ کوئی عبارت غلط ہو تو وہ اس کی تصیح کر سکتے ہیں اور یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ وہ کس حرف کا مصدر چوبی ہے اور کس کا آبی۔"

لیو بولا: "یہ اچھی بات ہے۔ جب اس کا دل چاہے یہاں آجائے۔ جب تک وہ کاروبار کے گُر سے واقف نہ ہوجائے اسے محنتانے میں روٹی کپڑے کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ اگر وہ کام کا آدمی معلوم ہوا تو سال بھر بعد میں اسے ایک روپیہ ماہوار دوں گا۔ تین سال بعد اسے تین روپیہ ماہانہ ملے گا۔ اس کے بعد اسے کار آموزی کی ضرورت نہ رہے گی اور وہ اپنی قابلیت کے مطابق آگے بڑھ سکے گا۔ اس محنتانے کے علاوہ بیچنے اور خریدنے والوں سے وہ جو دلاّلی وصول کر سکے گا۔ وہ اسی کی ہوگی۔ اس کے ملنے نہ ملنے کا انحصار اس کی ہوشیاری پر ہے، میں ذمّہ نہیں لے سکتا۔ میں یہ کروں گا کہ اپنے رشتے کی خاطر اس لڑکے سے کوئی ضمانت طلب نہ کروں گا۔"

وانگ لنگ اس جواب سے بہت خوش ہوا اور ہنس کر بولا:

"اب ہماری دوستی مُسلّم ہے۔ یہ تو کہیے، میری چھوٹی بیٹی کے لیے آپ کے گھر کوئی لڑکا ہے یا نہیں؟"

سوداگر جی کھول کر ہنسا کیونکہ وہ خوش خور بھی تھا اور فربہ اندام بھی۔

"میرے دوسرے بیٹے کی عمر ابھی دس سال ہے۔ اس کی منگنی نہیں ہوئی۔ صاحب زادی کتنی بڑی ہیں؟"

وانگ لنگ نے شاد ہوکر جواب دیا: "اس کی دسویں سالگرہ ہونے والی ہے۔ غنچے کی سی حسین ہے۔"

اب دونوں ہنسے اور سوداگر نے پوچھا:

"کیا ہم دونوں دوہری رسّی سے بندھ جائیں گے؟"

وانگ لنگ نے اس سے زیادہ زبانی کہنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ ایسے معاملات میں یہیں تک گفتگو ہوسکتی تھی۔ سلام کرکے وہ خوش خوش یہ سوچتے ہوئے لوٹ آیا کہ یہ سودا بھی پٹ جائے گا۔ گھر آکر اس نے چھوٹی بیٹی کو دیکھا کہ وہ کیسی شکیل ہے اور ماں نے اس کے پانو شکنجے میں کس دیے تھے جس کی وجہ سے وہ ہولے ہولے اٹھلاتی پھرتی تھی۔

لیکن غور سے دیکھنے پر وانگ لنگ نے اس کے گالوں پر آنسوؤں کے نشان پائے۔ اس کا چہرہ عمر کے اعتبار سے بہت کملایا ہوا اور سنجیدہ تھا۔ اسے اپنی گود میں کھینچ کر باپ نے پوچھا:

"تم رو کیوں رہی تھیں؟"

لڑکی نے سر جھکا کر کوٹ کے ایک بٹن کو سہلاتے ہوئے شرمائی ہوئی آواز میں کہا:

"کیونکہ امّاں ہر روز میرے پانو میں ایک کپڑا اس زور سے کس دیتی ہیں کہ میں رات بھر نہیں سو سکتی۔"

وانگ لنگ کو تعجب ہوا: "میں نے آج تک تمھیں روتے نہ دیکھا تھا۔"

لڑکی نے سادہ لوحی سے جواب دیا: "جی نہیں۔ امّاں نے یہ کہہ کر مجھے زور سے رونے سے منع کر دیا تھا کہ تیرے ابّا بہت نرم دل ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تیرا درد ان سے دیکھا نہ جائے اور وہ پانو کھلوا دیں۔ پھر تیرا

شوہر تجھ سے محبّت نہ کرے گا جس طرح تیرے ابا مجھ سے نہیں کرتے۔
لڑکی نے اسی سادگی سے یہ بات دُہرائی جیسے کوئی بچہ قصّہ سنا رہا ہو۔ لیکن وانگ لنگ کے دل میں نشتر سا چبھا کہ اولان نے بیٹی سے یہ کہا کہ اس کی ماں کو اس کا باپ نہیں چاہتا۔ اس نے جلدی سے کہا۔
"آج ہی تمھارے لیے ایک چھیل چھبیلے بر پر میری نگاہ پڑی ہے۔ دیکھتا ہے کہ کویل یہ معاملہ طے کر سکتی ہے یا نہیں۔"
یہ سنتے ہی لڑکی نے مسکرا کر سر جھکا لیا اور ایک آنِ واحد میں بچپن اس پر سے گزر گیا اور شباب آگیا۔ اسی شام کو وانگ لنگ نے کویل سے کہا: "زرا جا کر دیکھو تو سہی کہ یہ معاملہ پٹ سکتا ہے یا نہیں۔"
لیکن رات کو کمل کے پاس اچھی نیند نہ آئی۔ جاگ کر وہ اپنی زندگی پر غور کرنے لگا۔ اور اسے اولان کا خیال آیا کہ یہی اس کی پہلی بیوی تھی اور کس وفاداری سے ہمیشہ اس کی خدمت کرتی رہی ہے۔ پھر بچی کا کہا یاد کر کے وہ اداس ہو گیا کیونکہ اپنی کم عقلی کے باوجود اولان اپنے شوہر کی فطرت سمجھ گئی تھی۔
کچھ دنوں کے اندر ہی اس نے چھوٹے بیٹے کو شہر بھیج دیا اور چھوٹی بیٹی کی منگنی کرادی۔ اس کی شادی کا جہیز اور گہنے کپڑے کی مقدار بھی طے پا گئی۔ اب وانگ لنگ کو اطمینان ہوا اور اس نے سوچا:
خدا خدا کر کے میری اولاد کا انتظام ہو گیا۔ پگلی بٹیا دھوپ میں بیٹھ کر اپنی رسی سے عمر بھر کھیل سکتی ہے۔ رہ گیا سب سے چھوٹا بیٹا سو اُسے میں کھیتی کی تعلیم دوں گا، ہرگز اسکول نہ بھیجوں گا۔ کیونکہ دو کی پڑھائی کنبے کے لیے کافی ہے۔"

اسے فخر تھا کہ وہ تین بیٹوں کا باپ ہے جس میں سے ایک عالم ہے دوسرا سوداگر اور تیسرا زمیندار ہوگا۔ اب وہ بالکل بے فکر ہوگیا اور اولاد کی وجہ سے اسے کوئی پریشانی نہ رہی۔ لیکن رہ رہ کر اولان کی ماں کا خیال اسے ستانے لگا۔

شادی کے بعد یہ پہلا اتفاق تھا کہ وانگ لنگ اپنی بیوی کے متعلق سوچ بچار کر رہا تھا۔ اُن دنوں بھی جب وہ دولھن بن کر اس کے گھر آئی تھی وانگ لنگ کے خیال کا دایرہ اس سے آگے نہ بڑھا تھا کہ وہ پہلی عورت ہے جسے وہ عورت کی حیثیت سے جانتا ہے۔ وہ اپنے کو سمجھانے لگا کہ ایک نہ ایک مصیبت پیچھے لگی رہی، مجھے تو آج تک مرنے کی فرصت بھی نہ ہوئی۔ اب اولاد کو ٹھکانے لگا کر اور زمین جایداد کا پکّا انتظام ہوکر، سب سے زیادہ یہ کہ اس دن کی پٹائی کے بعد کمل کی کورکسر نکل جانے کے بعد اسے اتنی مہلت ملی کہ اولان کے متعلّق اپنے خیالات کو یکجا کرے۔

اس مرتبہ اس نے اولان کو عورت کی حیثیت سے نہیں دیکھا اور نہ اس کی پیلی رنگت اور بری شکل پر اس کی نگاہ گئی۔ وانگ لنگ کی آنکھوں میں پشیمانی کے سوا کچھ نہ تھا کیونکہ اولان کمزور ہوگئی تھی اور اس کا جسم سوکھ کر زرد پڑگیا تھا۔ اس کی رنگت ہمیشہ سے سانولی تھی اور کھیتوں میں کام کرتے کرتے اب مٹیالی پڑتی جاتی تھی لیکن برسوں سے اس نے کھیت کی شکل بھی نہ دیکھی تھی، کٹائی کے وقت کبھی چلی بھی جاتی ہو لیکن دو تین برس سے تو اس نے اس جانب کا رخ بھی نہ کیا تھا۔ کیونکہ وانگ لنگ کو کھٹکا تھا کہ دنیا یہ نہ کہے کہ "تم جیسے مالدار کو بیوی سے

کام لینا کب زیب دیتا ہے۔"

وانگ لنگ یہ سوچنے کی زحمت کیوں کرنے لگا تھا کہ اولان خوشی خوشی گھر میں کیوں بیٹھنے لگی تھی اور اب اس کی چلت پھرت میں سستی کیوں آنے لگی تھی۔ سوچنے پر اسے یاد آیا کہ کبھی کبھی پلنگ سے اٹھ کر اور تنور میں آگ جلاتے وقت وہ کراہا کرتی اور جب وہ پوچھتا کہ تمھیں یہ کیا ہو رہا ہے تو وہ یک بیک چپ ہو جاتی۔ اسے اور اُس کے پیٹ کے عجیب سے گومڑے کو دیکھ کر وانگ لنگ کو معلوم نہیں کیوں افسوس ہونے لگا۔ اپنے آپ کو وہ سمجھانے لگا:

"بیوی سے کوئی مرد ویسی محبت نہیں کرتا جیسی داشتہ سے، اور اس میں میری کوئی خطا نہیں۔ میں نے کبھی اسے نہیں مارا اور جب کبھی اس نے کچھ مانگا میں نے بے دریغ رُپے دیئے۔"

پھر بھی بچی کا وہ بول اس کے دل میں چٹکی لیتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا سبب کیا ہے کیونکہ جب وہ اس معاملے پر غور کرتا تو یہی پاتا کہ اس نے بحسن وخوبی فرایض شوہریت ادا کیے ہیں اور وہ بہتیرے مردوں سے اچھا ہے۔

کیونکہ اپنی بیچینی کو وہ دبا نہ سکا، اس لیے جب کبھی وہ کھانا لے کر آتی یا سامنے سے نکلتی تھی وہ اسے دیکھے بغیر نہ رہ سکتا۔ ایک روز کھانے کے بعد جب وہ فرش کو جھاڑنے کے لیے جھکی تو وانگ لنگ نے دیکھا کہ کسی چھپے ہوئے درد کی وجہ سے اس کا چہرہ بے رنگ ہو گیا ہے۔ وہ اپنا پیٹ پکڑ کر زیرِ لب کراہنے لگی اور پھر بھی جھاڑو دیتی رہی۔ وانگ لنگ نے گھبرا کر پوچھا:

"تمھیں یہ کیا ہوا کرتا ہی؟"

اولان نے منہ پھیر کر بیچارگی سے کہا:

"یہ وہی پرانا درد ہی جو مجھے پیٹ میں ہوا کرتا تھا۔"

وانگ لنگ نے اسے نظر بھر دیکھ کر چھوٹی بیٹی کو حکم دیا:

"تمھاری اماں بیمار ہیں، ان کے بدلے تم جھاڑو دیا کرو۔" اولان سے وہ ایسی مہربانی سے بولا جو برسوں سے مفقود تھی: "تم جا کر لیٹ جاؤ۔ میں لڑکی سے کہ دوں گا کہ تمھارے لیے گرم پانی لا دے بستر سے نہ اٹھنا۔"

اس کے حکم کی تعمیل میں وہ آہستہ سے اٹھ کر چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے چلنے پھرنے کی آواز کچھ دیر آتی رہی اور لیٹ کر وہ کراہنے لگی۔ وانگ لنگ بیٹھے ہوئے اس کی کراہ کو سنتا رہا اور جب وہ ناقابل برداشت ہوگئی تو شہر پہنچا تاکہ کسی دواخانے کا پتا چلائے۔

جس اناج منڈی میں اس کا چھوٹا بیٹا کار آموز تھا، اس کے ایک کارندے نے کسی دواخانے کا پتا دیا اور وانگ لنگ وہاں پہنچا۔ ڈاکٹر چائے پیتے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ دیے بیٹھا تھا۔ اس بوڑھے کی ڈاڑھی لمبی اور سفید تھی۔ ناک پر دھرے ہوئے پیتل کے چشمے پر الو کی آنکھوں کا گمان ہوتا تھا۔ اس کی میلی کچیلی قبا کی لمبی آستینوں نے ہاتھوں کو بالکل چھپا لیا تھا۔ جب وانگ لنگ نے مریضہ کی کیفیت سنائی تو ڈاکٹر نے منہ بنا کر میز کی دراز کھولی اور سیاہ کپڑے میں لپٹا ہوا ایک پلندہ نکال کر کہا:

"میں چل کر اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اولان کے پلنگ کے قریب آ کر انھوں نے دیکھا کہ اس پر غنودگی

طاری ہے۔ لب پر اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں اوس کی طرح چمک رہی ہیں۔
ڈاکٹر نے مایوسی سے سر ہلایا اور اپنا ہاتھ ـــــ جو لنگور کے ہاتھ کی طرح کالا اور سوکھا ہوا تھا ـــــ اس کی نبض کی طرف بڑھایا۔ دیر تک اس کا جائزہ لے کر اس نے سنجیدگی سے دوبارہ سر کو جنبش دی:
تلّی بڑھ گئی ہے اور جگر پر ورم آگیا ہے اس کے رحم میں سر برابر گلٹی آگئی ہے اور آنتوں میں الٹ پلٹ ہوگئی ہے۔ دل بمشکل حرکت کرسکتا ہے اور اس میں یقیناً کیڑے پڑ گئے ہیں۔
یہ سنتے ہی وانگ لنگ کا دم رُک سا گیا۔ گھبراہٹ کے مارے اس نے بوکھلا کر پوچھا:
"بہرحال، تم اس کا علاج تو کرو۔ یا یہ ممکن نہیں ہے؟"
باتوں کی بھنک سن کر اولان نے آنکھیں کھولیں۔ درد کے مارے اسے نیند آرہی تھی اور وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ بڈھے ڈاکٹر نے جواب دیا:
"یہ معاملہ بہت نازک ہے۔ اگر تم تندرستی کی ضمانت نہ طلب کرو تو میں دس روپیہ فیس لوں گا۔ میں تمھیں جڑی بوٹی کا نسخہ لکھ دوں گا جس میں شیر کا دل اور کتے کا دانت حل کر کے ابالنا اور اسے پلا دینا۔ لیکن اگر تم کامل افاقے کی ضمانت چاہتے ہو تو میں پانچ سو روپیہ کلدار لوں گا۔"
جیسے ہی اولان نے یہ الفاظ سنے اس کے کان کھڑے ہوگئے اور بہزار دقت وہ بولی: "نہیں، میری زندگی اتنی قیمتی نہیں۔ اس رقم میں اچھا کھیت مل سکتا ہے۔"
یہ سن کر وانگ لنگ کا دل افسوس سے پسیج گیا اور اس نے کہا:
"میرے گھر میں موت داخل نہیں ہوسکتی۔ میں اتنی رقم ادا کرنے پر آمادہ ہوں۔"

اب تو ڈاکٹر کی آنکھیں لالچ سے چمک اٹھیں لیکن وہ جانتا تھا کہ علاج میں کامیابی نہ ہونے اور مریضہ کے مرجانے پر قانون کیا سزا دے گا اس لیے بچتا کر وہ بولا :

"اب جو میں اس کے ہپوٹوں کی سفیدی کو دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی جان کا ضامن میں پانچ ہزار نقد سے کم میں نہ ہوں گا"

وانگ لنگ معاملے کی نزاکت کو سمجھ کر مایوسی سے خاموش ہوگیا۔ اس کے پاس نقد اتنی بڑی رقم نہ تھی اور زمین بیچے بغیر کہیں سے نہ مل سکتی تھی لیکن وہ خوب سمجھ رہا تھا کہ زمین بیچ کر بھی کچھ حاصل نہیں۔ کیونکہ ڈاکٹر کا اصل مفہوم یہ تھا کہ عورت جیتی نہ بچے گی۔

اس لیے وہ ڈاکٹر کے ساتھ باہر نکل آیا اور اسے دس روپے دیے۔ جب وہ چلا گیا تو وانگ اس اندھیرے باورچی خانے میں گیا جس میں اولان نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ بتایا تھا۔ اب جو وہ وہاں نہ تھی تو وانگ لنگ پر کسی کی نظر نہ پڑ سکتی تھی۔ کالی دیوار میں منہ چھپا کر وانگ لنگ بے اختیار رونے لگا۔



باب ۲۶

لیکن اولان کی زندگی کا چراغ یک بیک گل نہ ہو سکتا تھا۔ ابھی وہ عمرِ طبعی کے وسط سے بھی نہ گزری تھی۔ جان جسم کو آسانی سے چھوڑنے پر رضامند نہ تھی اور وہ مہینوں بستر پر حیات و ممات کی کشمکش میں پڑی رہی۔ لا تعنا ہی موسم سرما میں وہ بے ہلے جلے صاحب فراش رہی۔ اب پہلی مرتبہ وانگ لنگ اور اس کی اولاد کو اولان کی کمی کا احساس ہوا۔ اب انھیں وہ بات معلوم ہوئی جس پر آج تک ان کی نگاہ نہ گئی تھی۔ وہ یہ کہ گھر بھر کو وہ کتنا آرام پہنچاتی تھی۔

نہ کسی کو تنور جلانا آتا تھا، نہ کسی کے لیے یہ ممکن تھا کہ تلتے وقت مچھلی جلا نہ دے یا توڑ نہ دے۔ کوئی نہ جانتا تھا کہ کس سبزی کے لیے کون سا تیل موزوں ہے۔ باسی کھانا یا میز سے گرے ہوئے ٹکڑے یوں ہی پڑے رہتے، کوئی انھیں صاف نہ کرتا، حتیٰ کہ بدبو وانگ لنگ کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتی اور اس کی صفائی کے لیے یا تو وہ کوئی کتا بلا لاتا یا چھوٹی لڑکی کو جھاڑنے کی تاکید کرتا۔

بڑے میاں کی خدمت ماں کی جگہ سب سے چھوٹے بیٹے کے سپرد ہوئی۔ بڑے میاں اب گود کے بچے سے زیادہ بے کس ہو گئے تھے اور وانگ لنگ کسی طرح انھیں نہ سمجھا سکا کہ اولان چائے یا گرم پانی لے کر کیوں نہیں آتی یا انھیں اٹھتے بیٹھتے سہارا کیوں نہیں دیتی۔ جب وہ اسے پکارتا اور وہ نہ آتی تو وہ چڑچڑا ہو جاتا اور کسی بدمزاج بچے کی طرح

چائے کی پیالی پھینک دیتا۔ بالآخر، وانگ لنگ بڈھے کو اولان کے کمرے میں لے گیا اور اپنی دھندلی آنکھوں سے اسے دیکھ کر وہ رونے لگا کیونکہ اب وہ سمجھا کہ گھر میں کوئی مصیبت آگئی ہے۔

صرف دیوانی لڑکی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور وہ حسب دستور رسّی کے کھیل میں مشغول رہی۔ تاہم یہ ضروری تھا کہ کوئی اس کی خبرگیری کرے، رات کو سلائے، کھلائے پلائے، دھوپ میں بٹھلائے اور بارش ہو تو اندر لے آئے۔

کسی نہ کسی کو ان سب باتوں کا خیال رکھنا تھا۔ لیکن خود وانگ لنگ کے لیے یہ ممکن نہ تھا۔ ایک بار رات بھر وہ باہر رہ گئی اور صبح وہ جاڑے میں کانپتی اور روتی بسورتی ہوئی ملی۔ وانگ لنگ کے غصّے کی انتہا نہ رہی اور اس نے دونوں چھوٹے بچّوں کو اس تغافل کی وجہ سے خوب کوسا۔ مگر پھر اس نے سوچا کہ بہرحال یہ بچے ہی ہیں اور ان سے یہ توقع عبث ہے کہ اپنی ماں کی جگہ لے لیں۔ پھر اس سے کچھ نہ کہا گیا۔ اُس دن کے بعد اس بیچاری کی نگہداشت اس نے اپنے ذمّے لی جب بارش یا برف باری ہوتی یا آندھی آتی تو وہ اسے اندر لاکر تنور کے پاس بٹھلا دیتا۔

سردیوں بھر اولان کی زندگی اور موت کا مرحلہ طے نہ ہوا اور اس اثنا میں وانگ لنگ نے زمین سے کوئی دلچسپی نہ لی۔ سارا کام اس نے چنگ کے سپرد کردیا۔ کمال ایمانداری سے وہ اپنی خدمت انجام دیا کرتا اور صبح شام اولان کی مزاج پرسی کے لیے آتا۔ آخر وانگ لنگ اس طریقے سے تنگ آگیا کیونکہ دن میں دو مرتبہ وہ اس کے سوا کیا

کہہ سکتا تھا کہ ُ آج اس نے چوزے کی یخنی پی ۔ یا ُ آج اس نے چاول کی لپسی کھائی ۔"

اس لیے اس نے چنگ کو آیندہ مزاج پرسی کے لیے نہ آنے کا حکم دیا اور کہا تم جی لگا کر کام کرو، یہی بہت ہے۔

تیز و تند سرما کی راتوں میں اکثر وانگ لنگ مریضہ کے پلنگ پر بیٹھا رہتا۔ اگر اسے سردی لگتی تو وہ انگیٹھی میں آگ بھر کر اس کے پاس رکھ دیتا۔ لیکن ہر مرتبہ وہ کمزور آواز میں بڑبڑاتی ۔

"کیوں فضول خرچی کرتے ہو۔"

یہ سنتے سنتے اس کے کان پک گئے اور ایک روز وہ گرج پڑا ۔

"میں یہ نہیں سن سکتا ! ۔ اگر ساری زمین بیچ کر بھی تمھیں بحال کر سکوں تو اس پر بھی آمادہ ہوں ۔"

یہ سن کر وہ مسکرائی اور ہانپتی ہوئی بولی:

"نہیں، میں تمھیں یہ نہ کرنے دوں گی ۔ مجھے تو کسی نہ کسی دن مرنا ہی ہے، مگر یہ زمین جاودانی ہے ۔"

وانگ لنگ اس کی زبان سے موت کا لفظ نہ سن سکتا تھا اور اس کا ذکر چھڑتے ہی اٹھ کر باہر چلا گیا ۔

تاہم وہ جانتا تھا کہ اولان کا آخری وقت قریب ہے اور اسے اپنے فرائض انجام دینے ہیں ۔ سو وہ ایک روز شہر تابوت گر کی دُکان میں گیا اور سیکڑوں تیار شدہ تابوتوں کو دیکھ بھال کر ایک کا انتخاب کیا جو سیاہ و سخت لکڑی کا بنا ہوا تھا ۔ تابوت گر نے کائیاں پن سے کہا:

"اگر دو خریدو تو قیمت میں تہائی کی تخفیف ہو جائے گی ۔ اپنے لیے

بھی آپ ایک کیوں نہ خرید لیں۔ آپ کو بھی اطمینان رہے گا کہ عاقبت کا رخت سفر درست ہو گیا ؟"

وانگ لنگ نے کہا: "نہیں، میرا انتظام میرے بیٹے کریں گے۔"

لیکن اسی وقت اسے اپنے باپ کا خیال آیا کہ دیر سویر ان حضرت کو بھی تابوت کی ضرورت ہوگی۔ اس لیے وہ بولا: "لیکن میرے ابّا بھی زیادہ نہ جئیں گے کیونکہ نہ وہ چل سکتے ہیں نہ دیکھ سکتے ہیں نہ سن سکتے ہیں۔ لہٰذا میں دو کیوں نہ خرید لوں۔"

دوکاندار نے دونوں تابوتوں کو از سر نو رنگ کر وانگ لنگ کے گھر بھیجنے کا وعدہ کیا۔ لوٹ کر وانگ لنگ نے اولان کو یہ خبر سنائی اور وہ خوش ہوئی کہ میاں نے تجہیز و تکفین کا اتنا اچھا انتظام کر دیا۔

روز وہ گھنٹوں اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ ان میں زیادہ بات چیت نہ ہوتی کیونکہ ایک تو وہ کمزور تھی، پھر یہ بھی تھا کہ آپس میں کبھی وہ دیر تک باتیں کرنے کے عادی نہ تھے۔ وانگ لنگ اس طرح دم سادھے رہتا کہ اولان کو بسا اوقات یاد نہ رہتا کہ وہ کہاں ہے۔ تب وہ زور زور سے اپنے بچپن کا ذکر کرتی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مرد نے اپنی عورت کے دل میں جھانکا ہو حالانکہ اولان کے جملے اکھڑے اکھڑے سے ہوتے تھے۔

"گوشت میں دروازے تک پہنچا جاؤں گی — کیا میں خود نہیں جانتی کہ میں کتنی بدصورت ہوں، پھر بھلا میں سرکار میں پیش ہونے کی ہمت کیسے کروں؟ —" وہ ہانپتے ہوئے کہنے لگتی — "مجھے نہ مارو۔ — میں کبھی کھانے میں ہاتھ نہ ڈالوں گی —" اتنے میں اس کی ہچکیاں بندھ جاتی تھیں: "ابّا — امّاں — مجھے معلوم ہے کہ مجھ جیسی صورت

حرام سے کوئی محبّت نہ کرے گا —"
جب وہ خواب میں یوں بڑابڑاتی تو وانگ لنگ کا کلیجہ پاش پاش ہوجاتا اور اس کے سخت ہاتھ کو سہلانے لگتا، جو ایسا سنگین ہوگیا تھا گویا کسی مردے کا ہاتھ ہو۔ اس کا دکھ بڑھ جاتا کیونکہ اولان جو کچھ کہہ رہی تھی وہ سب سچ تھا۔ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیتے وقت وانگ لنگ کی تمنا ہوتی کہ کاش اولان کو میرے اخلاص کا احساس ہوجائے۔ لیکن یہ دیکھ کر وہ آپ اپنے پر کتنا نادم ہوتا کہ کمل ایک معمولی سی ادا سے اس کے دل پر جتنا اثر کرسکتی ہے، اس کا عشر عشیر بھی اولان کو حاصل نہیں۔ اس بے حرکت اور سخت ہاتھ کو چھوتے وقت بھی اس کے دل میں کوئی چاہت نہ ہوتی، بلکہ رحم کا جو جذبہ پیدا ہوتا وہ بھی گھن سے دب سا جاتا تھا۔

اس سبب سے وہ اولان سے زیادہ مہربانی سے پیش آنے لگا۔ سفید مچھلی اور گوبھی کے پھول کا شوربہ بھانت بھانت کی مقویات کے ساتھ کھلانے لگا۔ یہی نہیں، بلکہ موت کے اس طویل نظارے سے اس کے دماغ پر جو خستگی چھا جاتی، اسے دور کرنے کے لیے جب وہ کمل کے ہاں جاتا تو اس کی صحبت کو بھی بے لطف پاتا۔ کیونکہ وہاں بھی اسے ہمیشہ اولان کا خیال رہتا اور کمل کو بازوؤں میں لینے کے بعد جب اس کی یاد آتی تو ان کی گرفت ڈھیلی ہوجاتی تھی۔

لیکن کبھی کبھار اولان کو اپنا اور اپنے گردوپیش کا ہوش آتا۔ اور ایسے ہی ایک موقع پر اس نے کویل کو آواز دی۔ انتہائی حیرت کے عالم میں وانگ لنگ نے اس عورت کو طلب کیا۔ جب وہ آئی تو اولان

نے کانپتے ہوئے بازوؤں کے سہارے اپنے کو اٹھایا اور ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی :

"یہ سچ ہی کہ تم بڈھے نواب کی داشتہ تھیں اور لوگوں میں تمھاری صورت شکل کا چرچا تھا۔ لیکن مجھے بیوی اور ماں ہونے کا فخر حاصل ہی۔ اور تم اب بھی نری باندی کی باندی ہی ہو۔"

کویل نے اس کا ترکی بہ ترکی جواب دینے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ وانگ لنگ نے اس کے ہتہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے باہر لا کر سمجھایا:

"اس بیچاری کو خود اپنے کہے کا ہوش نہیں۔"

جب وہ دوبارا کمرے میں گیا تو اب بھی اولان کا سر اس کے بازو پر جھکا ہوا تھا اور وہ بولی :

"میری موت کے بعد اس عورت یا اس کی مالکن کو میرے کمرے میں نہ آنے دیا جائے اور نہ وہ میرے سامان کو ہاتھ لگائیں۔ اگر ایسا ہوا تو میری روح بھوت بن کر سب کو ستائے گی۔" پھر اس کا سر تکیے پر گر پڑا اور اس پر غنودگی طاری ہوگئی۔

لیکن نوروز سے ایک دن پہلے یک بیک اس کی حالت سدھری جیسے بجھتے بجھتے چراغ کی لو بھڑک اٹھے۔ مدت سے اس کی طبیعت ایسی بحال نہ ہوئی تھی اور بستر پر بیٹھ کر وہ اپنے ہاتھ سے اپنی کنگھی چوٹی کرنے لگی۔ پینے کے لیے اس نے چائے مانگی اور جب وانگ لنگ آیا تو وہ بولی:

"لو، نوروز سر پر آگیا اور گھر میں نہ گوشت ہی نہ کیک۔ میرے دل میں ایک خیال آیا ہی۔ میں اُس لونڈی کو تو باورچی خانے میں گھسنے نہ دوں گی، مگر میں چاہتی ہوں کہ تم میری بڑی بہو کو بلا بھیجو۔ اب تک میں نے اسے

دیکھا تو نہیں ہی لیکن جب وہ آجائے تو میں سب سمجھا دوں گی۔"

حالانکہ اس سال وانگ لنگ کو تیوہاروں کا دھیان نہ تھا مگر اولان کی بحالی سے وہ خوش ہوا۔ کویل کو اس نے فوراً 'لیو' سوداگر کے پاس بھیجا کہ اسے مرض کی نزاکت کا واسطہ دے کر سمجھائے۔ بارے، جب سوداگر نے سنا کہ اولان کسی گھڑی کی مہمان ہی اور شاید سردیوں بھر بھی نہ جیے تو وہ راضی ہو گیا کیونکہ اب اس کی بیٹی کی عمر سولہ برس تھی اور اس سے بھی کم عمر لڑکیاں سسرال چلی جاتی تھیں۔

لیکن اولان کی وجہ سے جشن نہ ہوا۔ بہو چپ چاپ ایک پالکی میں آئی، اس کے ساتھ ماں اور بوڑھی دایہ کے سوا کوئی نہ تھا۔ بہو کا ہاتھ اولان کے ہاتھ میں دے کر اس کی ماں لوٹ گئی، بس اس کی خدمت کے لیے دایہ رہ گئی۔

بچوں نے اپنا کمرا بہو کے لیے خالی کر دیا اور سب ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ خلاف آداب ہونے کے سبب سے وانگ لنگ بہو سے ہم کلام تو نہ ہوا، لیکن اس کے سلام کا جواب وہ سنجیدگی سے دیتا اور دل میں خوش ہوتا کیونکہ وہ اپنے فرائض سے واقف تھی اور آنکھیں جھکا کر دبے پانو آتی جاتی تھی۔ علاوہ بریں صورت شکل کی خاصی اچھی تھی۔ ایسی بری جما بھی نہ تھی کہ اپنے حسن پر اترائے۔ وہ ادب قاعدے کا پاس رکھتی تھی۔ اولان کی تیمارداری میں وہ مصروف رہتی اور اس سے وانگ لنگ کو اطمینان ہوتا کہ اس کے پاس کوئی عورت تو ہی۔ سب سے زیادہ مسرت اولان کو تھی۔

تین چار روز اولان اس پر مگن رہی۔ پھر اسے ایک دوسری بات کا

خیال آیا۔ جب صبح وانگ لنگ پوچھنے آیا کہ رات کیسی بسر ہوئی تو وہ بولی:

" مرنے سے پہلے میری ایک اور آرزو ہے۔"

اس پر مرد نے بگڑ کر کہا:

"تم موت کے ذکر سے مجھے خوش کرنا چاہتی ہو، کیوں؟"

اولان مسکرائی، اور یہ وہی ہلکی سی مسکراہٹ تھی جو آنکھوں تک پہنچنے کے پہلے ختم ہو جاتی تھی۔

" موت یقینی ہے کیونکہ میں اسے رگ رگ میں محسوس کرتی ہوں ـــ۔ لیکن میں تب تک نہیں مرنا چاہتی جب تک میرا بڑا بیٹا گھر نہ لوٹ آئے اور اس لڑکی سے شادی نہ کرلے۔ کیسی سعادت مند بہو ہے کہ ہمیشہ میری تیمارداری میں رہتی ہے۔ جب شدت درد سے میں پسینے پسینے ہو جاتی ہوں تو لپک کر گرم پانی سے میرا منہ دھلاتی ہے۔ میری موت قریب ہے اور میں چاہتی ہوں کہ میرا لخت جگر گھر لوٹ کر اسے بیاہے۔ پھر خوشی خوشی میری جان نکل جائے گی کہ ہمارے پوتے اور بڑے میاں کے پڑپوتے کا سامان ہو گیا۔"

اولان کے لیے یہ تقریر لمبی تھی اور تندرستی کے زمانے میں بھی وہ ایک ساتھ اتنے الفاظ نہ بولا کرتی تھی۔ اور اس وقت اس کی آواز بھی ایسی پاٹ دار تھی کہ مہینوں سے نہ تھی۔ وانگ لنگ اس کے دم خم پر ایسا مسرور ہوا کہ کسی طرح انکار نہ کر سکا، گوکہ بڑے بیٹے کی شادی وہ دھوم دھام سے کرنا چاہتا تھا اور اس کی تیاری کے لیے وقت درکار تھا۔ چنانچہ اس نے تپاک سے کہا:

" تمھاری مرضی ہے تو مجھے بھی عذر نہیں۔ آج ہی میں دکن ایک ہرکارہ

روانہ کرتا ہوں کہ لڑکے کو ڈھونڈ کر گھر لائے۔ لیکن تمھیں وعدہ کرنا ہوگا کہ اب اپنے کو سنبھالوگی اور موت کے فضول خیال کو دماغ سے نکال کر جلد بھگی چنگی ہو جاؤ گی۔ کیونکہ تمھارے بغیر یہ گھر اصطبل بنا ہُوا ہے۔"

اس نے یہ بات اولان کو خوش کرنے کے لیے کہی تھی اور وہ خوش ہوئی بھی۔ مگر زبان سے اس نے اس کا اظہار نہ کیا۔ بس لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں اور مسکرانے لگی۔

چنانچہ وانگ لنگ نے ایک ہرکارہ بھیجا اور اسے سمجھایا کہ:

" صاحب زادے سے کہنا کہ ان کی والدہ بسترِ مرگ پر ہیں اور تب تک چین سے ان کی جان نہ نکلے گی جب تک وہ اپنے بیٹے کو دیکھ نہ لیں اور اس کا بیاہ نہ کردیں۔ اگر صاحب صاحبزادے کو اپنے والدین اور گھر بار کا خیال ہے تو انھیں فوراً یہاں پہنچ جانا چاہیے، کیونکہ آج سے تیسرے دن میں دعوت کا انتظار کروں گا اور شادی کی تقریب میں مہمان جمع ہوں گے۔"

وانگ لنگ نے اپنے قول پر عمل کرنے میں دیر نہ کی۔ کوئل کو اس نے حکم دیا کہ دعوت کا بہتر سے بہتر انتظام کرے اور اس کے لیے شہر کے چائے خانے سے باورچی لائے۔ اس کی مٹھی کو ریوں سے بھر کر اس نے کہا:

" بڑی حویلی میں شادی کے وقت جو ٹھاٹ ہوتے تھے وہی یہاں بھی ہوں۔ اور ریوں کی ضرورت ہو تو بے دریغ مانگ لینا۔"

گانو جاکر اس نے سب جان پہچان کے مرد و زن کو دعوت دی۔ شہر جاکر چائے خانے اور اناج منڈی کے ملاقاتیوں کو بلوا دینا بھی وہ نہ بھولا۔ پھر وہ چچا سے بولا:

"میرے بیٹے کی شادی پر آپ اور میرے بھائی اپنے سب دوستوں کو شوق سے مدعو کریں۔"

یہ کہتے وقت وانگ لنگ کو یاد تھا کہ اس کا چچا کون ہے۔ جب سے اُسے اُن ذات شریف کی اصلیت کا علم ہوا وہ اُن سے کسی معظّم مہمان کا سا سلوک کرتا اور بڑی سعادت مندی سے پیش آتا تھا۔

شادی سے ایک دن پہلے رات کو وانگ لنگ کا بڑا بیٹا گھر آیا۔ اسے دیکھتے ہی وانگ لنگ کا دل ڈھل گیا اور وہ بھول گیا کہ اس نے کیسے کیسے پاکھنڈ مچائے تھے۔ اس کی جدائی کو دو ڈھائی برس ہو گئے تھے۔ اس پر لڑکپن کے آثار باقی نہ رہے تھے۔ اب وہ دراز قد جوانِ رعنا تھا جس کا جسم بھرا بھرا، رنگ سرخ و سفید اور سیاہ بال کٹے چھنٹے تیل میں بسے ہوئے تھے۔ دکن کے دکانداروں کی طرح وہ ساٹن کا سرخ لبادہ اور اس پر بے آستین کا سیاہ مخملی شلوکا پہنے ہوئے تھا۔ اسے دیکھتے ہی فخر سے وانگ لنگ کی چھاتی پھول گئی۔ اسے اس کے سوا کچھ یاد نہ رہا کہ یہ اس کا بیٹا ہے اور وہ ہاتھوں ہاتھ اسے اولان کے پاس لے گیا۔

نوجوان اپنی ماں کے بازو سے پلنگ پر بیٹھ گیا اور اس کا یہ حال زار دیکھ کر اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ لیکن زبان پر وہ حوصلہ افزا جملوں کے سوا کوئی لفظ نہ لایا: "مجھے لوگوں نے یونہی ڈرایا تھا، آپ کی حالت خدانخواستہ ویسی خراب نہیں۔ موت کا کیا ذکر۔" مگر اولان نے سادگی سے جواب دیا: "تمھاری شادی دیکھ لوں تو میری جان خوشی خوشی نکل جائے۔"

لگن کی مہورت تک دُلھن پر دُولھا کی نگاہ پڑنا معیوب تھا۔ اس لیے کمل اسے شادی کا جوڑا پہنانے اپنے گھر لے گئی۔ اور سچ پوچھو تو کمل، کویل اور چچی سے بہتر یہ کام کون انجام دے سکتا تھا۔ شادی کے دن انھوں نے دُلھن کو نک سے سک تک نہلایا اور اس کے پانو کو دھلے دھلائے سفید فیتوں سے کسا۔ کمل نے اپنے استعمال کا خوشبودار بادام کا تیل اس کے جسم پر ملا۔ انھوں نے اسے اس جوڑے میں سجایا جو وہ اپنے گھر سے ساتھ لائی تھی: پھولدار ریشم کا زیر جامہ اور اس پر بھیڑ کے نرم نرم گھنگرالی اُون کا نفیس کوٹ اور پھر شادی کا سرخ ساٹن کا لبادہ۔ اس کے ماتھے پر انھوں نے چونے کی مالش کی اور بھنوؤں پر سے کنوارپن کے روئیں بڑی ہوشیاری سے چن دیئے۔ اور اس طرح اس کی پیشانی چاند سی نکل آئی۔ پھر اس کے سنگھار کو روغن اور غازے کی پُٹ دی گئی۔ اور اس کی ابرو پر سرمے کی سلائیاں کھینچ دی گئیں۔ دُلھن کا سر سہرے سے اور چہرہ پوتھ دار نقاب سے ڈھک دیا گیا۔ پانو مرصّع جوتوں سے آراستہ ہوئے اور انگلیوں کی پور پور مہندی سے رچا دی گئی اور اب جو عطر بیز ہو کر اٹھی تو شادی کا سنگھار مکمل ہو چکا تھا۔ منا طاؤں کو دُلھن نے یہ سب کرنے دیا لیکن خود شرم و حیا سے سُکڑی بیٹھی رہی جیسا کہ آداب کا تقاضا تھا۔

وانگ لنگ اپنے اقربا اور مہمانوں کے ساتھ دیوان خانے میں انتظار کر رہا تھا کہ دُلھن اپنی باندی اور وانگ لنگ کی چچی کا سہارا لیے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ شرم سے سمٹتی اور حیا سے کٹتی ہوئی وہ سر جھکائے یوں کشاں کشاں چل رہی تھی گویا کسی مرد سے جوڑا باندھنا اسے ناپسند ہو۔

اور وہ ایسا کرنے پر مجبور کی جا رہی ہو۔ یہ انداز اس کی انتہائی عفّت کی دلالت کرتا تھا۔ اور وانگ لنگ نے خوش ہو کر سوچا کہ دُلھن لاکھوں میں ایک ہی۔

اس کے بعد دُولھا اُسی طرح بنا ٹھنا آیا: یعنی لال کرتے پر کالا شلوکا، بال سنورے ہوئے ڈاڑھی گھٹی ہوئی، پیچھے پیچھے اس کے دونوں بھائی تھے۔ اور جب وانگ لنگ نے اپنے طرح دار بیٹوں کا یہ جلوس دیکھا تو گھمنڈ سے پھول کر باغ باغ ہو گیا کہ یہی سپوت رہتی دنیا تک اس کا نام چلائیں گے۔ اب تک تو بڑے میاں کی سمجھ میں خاک نہ آیا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہی۔ اور ان کے کان میں جو کچھ پکار کر کہا جاتا تھا وہ بھی پورا پورا پلّے نہیں پڑتا تھا۔ لیکن اب نہ جانے کیسے ان کی عقل کے پردے کھل گئے اور ایک ٹھٹھا کا لگا کر وہ اپنی ہنپنی آواز میں بس یہی دہرانے لگے کہ

"شادی کا مطلب ہی، بچّہ اور بچّے کا مطلب ہی پڑپوتا۔"

اور وہ کچھ یوں کھلکھلا کر ہنسے کہ دوسرے مہمانوں سے بھی ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ اور وانگ لنگ دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ کاش اولان بھلی چنگی ہوتی تو آج کا دن کیسے مزے میں گزرتا۔

تمام وقت وانگ لنگ کی آنکھیں پوشیدہ طور پر بیٹے پر لگی رہیں کہ وہ اپنی دلھن کی طرف دیکھتا ہی یا نہیں۔ گو دُولھا نے ایک آدھ ہی دفعہ کن انکھیوں سے لڑکی کو تاکا لیکن بس یہی کافی تھا کیونکہ اس کا چہرہ فرطِ شوق سے کھل اٹھا۔ اور وانگ لنگ نے فخر و انبساط کے ساتھ سوچا: "آفرین ہی مجھ پر! میں نے بھی وہ انتخاب کیا جو اسے دل و جان سے پسند ہی۔"

پھر دُولھا دُلھن بڑے میاں اور وانگ لنگ کو سلام کر کے اولان کے کمرے میں گئے۔ اس کی مرضی کے مطابق اس کا خوب صورت کالا کوٹ اسے پہنا دیا تھا۔ اور جب وہ اندر آئے تو وہ ٹیکا لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کے گال کچھ اس طرح تمتما رہے تھے کہ وانگ لنگ کو اس پر صحت کا دھوکا ہوا اور اس نے زور سے کہا: "اس کے صحت مند ہونے میں دیر نہیں"۔

بیٹے اور بہو نے پاس جا کر اس کے آگے سر جھکایا اور اس نے پلنگ کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہاں بیٹھو اور اپنی شادی کی شراب اور کباب کو چکھو۔ کیونکہ میں اپنی آنکھوں سے یہ سماں دیکھنا چاہتی ہوں۔ یہی پلنگ تمھار سکھ سیج ہو گا کیونکہ میں جلد مر جاؤں گی اور یہ تمھارے لیے خالی ہو جائے گا۔"

ایسی باتوں کا جواب ہی کیا ہو سکتا تھا۔ بنا بنی پاس پاس چپ چاپ ایک دوسرے سے لجاتے کنیاتے بیٹھے رہے۔ اتنے میں چچی گرم شراب کے دو ساغر لیے ہوئے آئی۔ اس تقریب میں وہ چودھرائن بنی پھر رہی تھی اور اس کے موٹاپے میں کچھ اضافہ ہی ہو گیا تھا۔ شراب پہلے تو دونوں نے الگ الگ پی اور پھر ایک پیالی سے باری باری سے پی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ اب دونوں دو تن ایک من ہیں۔ اسی طرح کھانا بھی انھوں نے ایک رکابی سے کھایا جس کا مطلب یہ تھا کہ ان کی زندگی اب ایک ہے۔ اس طرح شادی کی رسم مکمل ہو گئی۔ اولان اور وانگ لنگ کو دوبارہ آداب کر کے وہ باہر آئے اور مہمانوں کے آگے سر تسلیم خم کیا۔

اب دسترخوان چنا گیا اور در و دالان سے کھانوں کی مہک اور ہنسی

کی مہک آنے لگی ۔ دور دور سے مہمان آئے تھے ــــ جو مدعو تھے اور وہ جو بن بلائے آدھمکے تھے ۔ کیونکہ سب جانتے تھے کہ وانگ لنگ مالدار آدمی ہے اور ایسے موقع پر اس کے گھر کھانے کی کمی نہ ہوگی ۔ کویل شہر سے باورچی لائی تھی ۔ اور کیونکہ کسی کسان کے باورچی خانے میں بعض اقسام کی نعمتیں تیار نہ ہو سکتی تھیں اس لیے یہ باورچی اُنھیں پکا کر بڑے بڑے خوانوں میں لائے تھے ۔ اور انھیں صرف گرم کرتا تھا ۔ ان رکاب داروں کے دماغ آسمان پر تھے ۔ اور وہ اپنے گندے انگوچھوں کو ہلاتے ہوئے یہاں سے وہاں مٹکتے پھر رہے تھے ۔ سب نے رکابی پر رکابی، پیمانے پر پیمانے صاف کر دیئے اور امنگ کی ایک لہر تھی جو ہر طرف دوڑ گئی ۔

اولان نے سب دریچے کھلوا دیئے اور چلمنیں بندھوا دیں تاکہ ہنسی مذاق کی آواز سن سکے اور کھانوں کی مہک سونگھ سکے ۔ اس دوران میں وانگ لنگ بار بار مزاج پرسی کے لیے آیا اور ہر بار اولان یہی پوچھتی کہ " ہر ایک کے سامنے شراب تو ہے ؟ اور میٹھے چاول ٹھنڈے تو نہیں پڑے ۔ ان میں گھی، شکر اور میوے نسبت سے ڈالے گئے ہیں یا نہیں ۔"

جب وہ اسے یقین دلاتا کہ ہر چیز حسب خواہش ہے تو وہ مطمئن ہو کر باہر کی آوازیں سننے لگتی ۔

جب رات کی سبھا سجی تو یہ راگ رنگ ختم ہوا، سب مہمانوں نے اپنے اپنے گھر کا رستہ لیا ۔ نشاط و مسرت کا یہ دور ختم ہوتے ہی جب گھر پر خاموشی چھائی تو اولان کا سارا ولولہ سرد پڑ گیا اور وہ تھک کر بے سدھ سی ہو گئی ۔ دولھا دلھن کو بلا کر اس نے کہا: " اب مجھے قرار آ گیا

اور خدا کو جو کرنا ہی سو اب کرے ، بیٹے اپنے باپ دادا کا خیال رکھنا، اور بیٹی ، اپنے شوہر اور اس کے باپ دادا کے سوا میری دیوانی بیٹی کا بھی دھیان رکھنا۔ان کے علاوہ کسی اور کا تم پر کوئی حق نہیں ۔"

یہ اشارہ کمل کی طرف تھا جس سے اولان نے آج تک بات بھی نہ کی تھی ۔ سب منتظر تھے کہ وہ اور کچھ کہے گی لیکن اسی وقت اس کی آنکھ جھپک گئی ۔ زرا دیر بعد آنکھ کھول کر وہ پھر کچھ کہنے لگی لیکن اب کے اسے ان کی موجودگی کا احساس نہ رہا اور شاید یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ کہاں ہے۔ بیچینی سے سر اِدھر اُدھر موڑ کر وہ زیر لب بڑبڑانے لگی:

" میری شکل بری ہوا کرے لیکن میں ماں تو ہوں۔میں باندی ہوا کروں مگر اپنی کوکھ سے میں نے ایک لڑکے کو جنم دیا ہی...... وہ عورت اُن کے آرام کا خیال میری طرح کیوں کر سکتی ہی۔ خالی خولی حسن بچے پیدا نہیں کر سکتا ۔"

اولان کو کسی کی سدھ نہ رہی اور وہ یونہی بڑبڑاتی ہوئی پڑی رہی ۔ وانگ لنگ نے سب کو چلے جانے کا اشارہ کیا اور پاس بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا ۔ اسے اپنے آپ سے نفرت ہوئی کیونکہ اس وقت بھی وہ یہ دیکھنے سے اپنے کو نہ روک سکا کہ اس کے لٹکے ہوئے سرخ ہونٹھ کیسے بھیانک معلوم ہو رہے تھے ۔یک بیک اولان نے آنکھیں پھاڑ کر ہر طرف دیکھا، ان پر ایک عجیب سا دھندلکا چھا گیا اور اس کی نگاہیں وانگ لنگ پر ایسے حیرت واستعجاب سے جم گئیں گویا وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ اتنے میں اس کا سر اچانک تکیے پر ڈھلک گیا، جسم میں یک بارگی اینٹھن ہوئی اور وہ مر گئی ۔

جان نکلنے کی دیر تھی کہ وانگ لنگ کو وہاں کی تنہائی میں وحشت سی ہونے لگی۔ بچی کو بلاکر اس نے کہا کہ لاش کو نہلا دھلا کر کفن دفن کے لیے تیار کرے۔ اس کے بعد وہ اندر نہ جا سکا بلکہ بیٹے، بہو اور بچی نے لاش تابوت میں اتاری۔ ضمیر کے سکون کے لیے وہ شہر کے چکر کاٹنے لگا اور لوگوں کو دستور کے مطابق تابوت کو مہر بند کرنے کا حکم دیا اور نجومی سے تجہیز و تکفین کی تاریخ معلوم کرائی۔ اچھا دن تین مہینے پہلے نہ مل سکا، اور نجومی کو دے دلا کر وانگ لنگ مندر میں گیا۔ تین ماہ وہاں تابوت رکھنے کا کرایہ ٹھہرانے کے بعد اولان کی نعش یہاں لائی گئی۔ کیونکہ وانگ لنگ کے لیے لاش کے ساتھ گھر میں رہنا ناممکن تھا۔

اب وانگ لنگ نے سوگ کی ساری رسمیں ایک ایک کر کے ادا کیں۔ اپنے اور اپنے بچوں کے لیے اس نے ماتمی لباس سلوائے۔ سفید ماتمی رنگ ہے۔ اس لیے مردوں کے جوتے اور موزے سفید کپڑے کے بنے اور عورتوں نے چوٹی سفید فیتوں سے گوندھی۔

اولان کی خواب گاہ میں سونا وانگ لنگ کے لیے ممکن نہ تھا۔ اپنا سامان لے کر وہ کمل کے ہاں منتقل ہو گیا اور بڑے بیٹے سے بولا:

”جہاں تمھاری ماں نے زندگی تیر کی، تم سب کو جنم دیا اور اس دنیا کو خیرباد کہا، وہیں تم دونوں قیام کرو اور بچے پیدا کرو۔“

اس لیے یہ نیا جوڑا وہاں اٹھ گیا اور اسے یہ تحلیہ جی سے بھایا۔

موت نے وانگ لنگ کا گھر دیکھ لیا تھا۔ بڑے میاں نے جب سے اولان کی مردہ لاش تابوت میں دیکھی تھی، ان پر جینا حرام

ہو گیا تھا۔ ایک دن صبح جو چھوٹی لڑکی چائے لے کر ان کے کمرے میں گئی تو وہ بستر پر مرے ہوئے ملے۔ رات کو سونے کے بعد وہ پھر نہ جاگے اور ان کی ڈاڑھی ہوا میں لہراتی رہ گئی۔

یہ نظارہ دیکھتے ہی لڑکی کے منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ روتی ہوئی باپ کو بلانے دوڑی۔ وانگ لنگ نے آکر دیکھا کہ بڈھے کی لاش سوکھے ڈنڈ کی طرح اینٹھی اینٹھائی پڑی ہے اور معلوم ہوتا تھا کہ گھنٹوں پہلے شاید آنکھ لگتے ہی اس کا دم نکل گیا تھا۔ وانگ لنگ نے اپنے ہاتھوں سے اسے غسل دیا اور احتیاط سے تابوت میں اتار کر اس پر مہر لگائی اور کہا:

"ان دونوں کو ایک ہی روز دفن کیا جائے گا۔ اپنی پہاڑی زمین کا ایک قطعہ میں علٰحدہ کر دوں گا جہاں یہ پاس پاس رہیں گے اور جب میں مر جاؤں تو انھیں کے قریب دفنایا جاؤں۔"

اس نے اپنے کہے پر عمل کیا۔ بڑے میاں کا مہر بند تابوت دیوان خانے میں مقررہ تاریخ تک رکھا رہا۔ وانگ لنگ کو گمان ہوتا تھا کہ باپ کی روح وہیں رہ کر خوش ہے۔ خود اسے اس کی لاش تک سے قربت سی محسوس ہوتی کیونکہ وانگ لنگ کو اپنے باپ کی رحلت کا افسوس تھا۔ ساتھ ساتھ اس کی موت کا اسے خاص غم نہ تھا کیونکہ بڑے میاں برسوں سے ادھ مرے سے ہو گئے تھے اور اپنی عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے۔

جب موسم بہار کا وہ دن آیا جو نجومی نے چنا تھا تو وانگ لنگ نے تاؤ کے مندر کے پجاریوں کو بلوا بھیجا۔ وہ پیلے لباس پہنے ہوئے تھے

اور ان کی لمبی چوٹیوں کے جوڑے بندھے تھے۔ بودھ پجاری بھی آئے اور یہ سر گھٹائے، اس پر نوتلک لگائے، جوگیا کرتے پہنے ہوئے تھے۔ ڈھولک بجا بجا کر یہ پجاری رات بھر دونوں مرنے والوں کی ارواح کے ثواب کے لیے بھجن گاتے رہے جیسے ہی وہ رکتے وانگ لنگ ان کے کشکول میں رُپے ڈال دیتا اور پھر وہ دُگنی طاقت سے الاپنے لگتے، یہاں تک کہ صبح تک یہ تار نہ ٹوٹا۔

اپنی زمین میں ایک ٹیلے پر کھجور کے پیڑ تلے وانگ لنگ نے قبروں کے لیے ایک اچھا سا مقام تجویز کیا تھا۔ چنگ نے قبریں کھودوادیں۔ اور ان کے ارد گرد ایک دیوار بھی کھنچوادی۔ احاطہ اتنا بڑا تھا کہ اس میں یہ دو ہی نہیں بلکہ وانگ لنگ، اس کے بیٹے، بہو اور پوتوں کے پوتے تک سما جائیں۔ حالانکہ یہ قطعہ زرخیز اور گیہوں کے لیے بہت موزوں تھا، لیکن وانگ لنگ کو مطلق اس کا افسوس نہ ہُوا۔ یہ اقدام اس امر کا ثبوت تھا کہ گھرانا اپنی زمین میں ہمیشہ کے لیے گھر بنا رہا ہے۔ جیتے جی اور مرنے کے بعد بھی وہ اپنی زمین سے کبھی نہ بچھڑیں گے۔

جب پجاری صبح کے وقت اپنے بھجن ختم کر چکے تو وانگ لنگ نے سفید ٹاٹ کا لباس پہنا اور خاندان کے سب لوگوں کو یہی کپڑے پہننے پڑے۔ شہر سے ان سب کے لیے پالکیاں لائی گئیں کیونکہ ان کا محتاجوں کی طرح پا پیادہ قبرستان تک جانا نامناسب تھا۔ پہلی مرتبہ وانگ لنگ اپنی بیوی کے جنازے کے ساتھ جانے کے لیے پالکی پر سوار ہُوا۔ لیکن بڑے میاں کے تابوت کے

پیچھے ان کا بھائی سب کے آگے آگے رہا۔ وہ کمل جو اولان کی زندگی میں کبھی اس سے دوچار نہ ہوئی تھی، آج پالکی میں سب کے ہم رکاب تھی تاکہ لوگوں کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ پہلی بیوی سے عزت سے پیش نہ آتی تھی۔ اپنی چچی اور اس کے بیٹے تک کے لیے وانگ لنگ نے پالکیاں منگوائیں اور سب کو ٹاٹ کے کپڑے بانٹے۔ یہاں تک کہ اس کی پگلی بیٹی بھی ٹاٹ کا لبادہ اوڑھ کر پینس میں بیٹھی اور اسے ایسا اچنبھا ہوا کہ رونے کے بجاے کھلکھلا کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

باآواز بلند شیون و زاری کرتے ہوئے وہ قبرستان پہنچے۔ اس جلوس کے عقب میں چنگ اور سب مزدور سفید جوتیاں پہنے آئے۔ مندر سے اولان کا تابوت منگوالیا تھا اور زمین پر اس گھڑی کے انتظار میں رکھا ہوا تھا جب باپ کی تجہیز ختم ہو جائے۔ وانگ لنگ خاموش کھڑا یہ سب دیکھتا رہا، دوسروں کی طرح وہ نہ رویا نہ چلایا کیونکہ اس کا سوگ دل میں اتنا گہرا بیٹھ گیا تھا کہ اس کی آنکھیں بے نم تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ قسمت کے نوشتے کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ اور اس سے زیادہ کچھ کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔

جب قبریں ڈھک دی گئیں تو وانگ لنگ تن تنہا اور پاپیادہ ہولے ہولے گھر کی طرف لوٹا۔ اس پر دکھ کی جو بدلی چھائی ہوئی تھی اس میں سے صرف ایک دردانگیز خیال رہ رہ کر اس کے دل میں چٹکیاں لے رہا تھا: اور وہ خیال اور یہ تمنا تھی کہ کاش اولان سے

ہیں نے وہ دونوں موتی نہ لیے ہوتے ! اب میں کبھی کمل کو ان موتیوں کے پہننے کی اجازت نہ دوں گا۔

ان جگر خراش خیالات میں غلطاں و پیچاں اکیلے آتے ہوئے وہ یہ سوچنے لگا: "اس زمین میں میں نے اپنا بہتر نصف دفن کر دیا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اب میری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہونے والا ہے۔

اور یک بیک اس کی آنکھیں ڈب ڈبا آئیں جنھیں وہ بچوں کی طرح ہتھیلی سے پونچھنے لگا۔



باب ۲۷

شادی اور غمی کی وجہ سے گھر میں کچھ ایسی گھما گھمی رہی کہ اس دوران میں وانگ لنگ کا دھیان کھیتی باڑی کی طرف گیا ہی نہیں۔ لیکن ایک روز چنگ نے آکر یہ خبر سنائی: "اب دُکھ سکھ کے دن بیت گئے تو میں آپ کو کاشت کا حال سنانے آیا ہوں۔"

"کہو، جلدی کہو۔ اس مدت میں مردوں کی مٹی دینے میں میں ایسا مصروف رہا کہ زمین کا بھی ہوش نہ رہا۔"

جب وانگ لنگ نے یہ جواب دیا تو چنگ تعظیماً دم بھر خاموش رہا ور پھر آہستہ آہستہ بولا:

"خدا خیر کرے، ورنہ آثار تو ایسے ہیں کہ اس سال ایسا سیلاب آئے گا جس کے آگے طوفان نوح بھی ہیچ ہو۔ حالانکہ ابھی گرمی بھی نہیں آئی لیکن پانی ابھی سے چڑھ رہا ہے۔"

وانگ لنگ نے جھلا کر کہا:

"اللہ میاں سے مجھے نقصان کے علاوہ تو اب تک کچھ ملا نہیں۔ انھیں لوبان کی دھونی دو یا نہ دو، اگربتی جلاؤ یا نہ جلاؤ لیکن یہ حضرت ہمیشہ نقصان پہنچانے کے درپے رہتے ہیں۔ آؤ ذرا چل کر زمین کا رنگ دیکھیں۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ چنگ بیچارا سیدھا سادھا ڈرپوک قسم کا آدمی تھا۔ کیسی بھی بری حالت ہو مگر وانگ لنگ کی طرح اللہ میاں سے

الجھنے کی مجال اسے نہ ہوتی تھی۔ مشیت ایزدی کے نام پر وہ سیلاب اور خشک سالی کو صبر و شکر سے برداشت کر لیتا تھا۔ وانگ لنگ اُس کی ضد تھا۔ اس نے سب کھیتوں میں گھوم پھر کر چنگ کے کہے کو سچ پایا۔ شہر پناہ کی کھائی کے کنارے کی وہ زمینیں جو اس نے ہوانگ گھرانے سے خریدی تھیں، نہر سے نکلے ہوئے جھرنوں کے پانی میں ڈوب چلی تھیں، اور ان میں بویا ہوا گیہوں کمہلا کر پیلا پڑ گیا تھا۔

کھائی جھیل بن گئی تھی اور نہر ندی بن کر موج در موج بہی چلی جاتی تھی۔ کوئی اندھا بھی کہہ دیتا کہ برکھا سے پہلے جو یہ حال ہے تو اس سال سیلاب کا آنا یقینی ہے۔ ایک بار پھر مرد عورت، بچوں بوڑھوں کی فاقہ کشی کا زمانہ آرہا ہے۔ وانگ لنگ پھرکی کی طرح یہاں وہاں دوڑنے لگا اور چنگ سائے کی طرح اس کے پیچھے تھا۔ وہ دونوں حساب لگانے لگے کہ کس کھیت کی فصل پانی میں ڈوب جائے گی، اور کون سا کھیت بچ رہے گا۔ گلے گلے چڑھی ہوئی نہروں کو دیکھ کر وانگ لنگ کوسنے لگا:

"اب اللہ میاں کا کلیجہ ٹھنڈا پڑے گا کہ انسان کس طرح بھوکے مرتے اور ڈوبتے ہیں۔"

گلا پھاڑ اس نے ایسے غصّے میں یہ صلواتیں سنائیں کہ چنگ تھرتھرا گیا:

"مالک، پھر بھی وہ ہم سب پر حاوی ہے اور آپ کو ایسے کلمے زبان سے نہ نکالنا چاہیے۔"

لیکن خوشحالی نے وانگ لنگ کو لاپروا بنا دیا تھا۔ اس کی طبیعت میں خود پسندی آگئی تھی۔ اور گھر جاتے وقت جب اسے چڑھتے ہوئے پانی اور اپنی ڈوبتی ہوئی فصل کا خیال آیا تو وہ بے اختیار بڑبڑانے لگا۔

وہی ہوا جس کا کھٹکا وانگ لنگ کو پہلے سے تھا۔ شمالی دریا نے اپنا بعید ترین بندھ توڑ دیا اور لوگوں نے جب یہ غضب دیکھا تو اس کی مرمّت کے لیے چندہ جمع کرنے لگے۔ ہر ایک نے اپنی بساط سے زیادہ دیا کیونکہ دریا کے دور رہنے ہی میں سب کا بھلا تھا۔ چندہ کا روپیہ انھوں نے ضلع کے منصف کے پاس جمع کر دیا جو نیا نیا یہاں آیا تھا۔ سوء اتفاق یہ کہ یہ منصف قلّاش تھا اور اس سے پہلے ایک ساتھ کبھی اتنے رُپے نہ دیکھے تھے۔ اپنے باپ کی رشوت سے وہ اس عہدے کو پہنچ گیا تھا کیونکہ اس نے اپنی ساری دولت خرچ کر کے یہ عہدہ اپنے بیٹے کے لیے خریدا تھا تاکہ وہ کنبے کی پرورش کر سکے۔ جب ندی نے دوبارہ بند توڑ دیا تو لوگ شور مچاتے ہوئے منصف کے گھر پر چڑھ آئے کیونکہ اس نے اپنے دعوے کے مطابق بندھ کی مرمّت نہ کرائی بلکہ چندے کے پورے تین ہزار رُپے ہضم کر گیا۔ لوگوں کو دیکھتے ہی وہ گھر میں جا چھپا۔ مگر لوگ گھر کے اندر گھس پڑے اور اس فریب کی وجہ سے اس کی جان کے لاگو ہو گئے۔ جب منصف نے دیکھا کہ بچنے کا کوئی راستہ نہیں تو پانی میں کود کر جان دے دی۔ تب کہیں جا کر لوگوں کا غصّہ ٹھنڈا پڑا۔

مگر رُپے بھی ڈوب گئے۔ اور ادھر دریا رفتہ رفتہ تمام پشتوں کو توڑ پھوڑ کر بحرِ ذخّار کی طرح سارے علاقے میں موجیں مارنے لگا اور

فصلیں اس کی تہ میں غرق ہوگئیں۔

ہر گاؤں ایک جزیرہ بن گیا۔ لوگ پانی کے چڑھاؤ کو تاکتے رہتے اور جب وہ چوکھٹ سے دو فٹ نیچے تک آجاتا تو وہ کواڑ توڑ کر اس سے کشتی کا کام لیتے اور کرسی میز کپڑا لتّا جو کچھ بچ سکتا لے دے کر بال بچّوں سمیت اس پر بیٹھ جاتے۔ آن کی آن میں پانی مٹّی کے گھر میں گھس کر دیواروں کو کھوکھلا کر دیتا اور گھر پانی میں یوں گھل مل جاتے کہ ان کا نشان تک باقی نہ بچتا۔ پھر دھرتی کا جل آکاش سے جل مانگتا اور ایسی موسلا دھار بارش ہوئی گویا زمین مدّتوں کی پیاسی ہو۔ کئی روز تک جھڑی بندھی رہی۔

وانگ لنگ چوکھٹ پر بیٹھا پانی کو دیکھا کیا جو ابھی اس کے مکان کے پائے سے بہت نیچے تھا۔ کیونکہ اس کی تعمیر ایک وسیع ٹیلے پر ہوئی تھی۔ لیکن جب سیلاب اس کے کھیتوں پر امنڈ آیا تو وہ ڈرا کہ کہیں قبروں کو بھی نہ بہالے جائے۔ لیکن ایسا نہ ہوا ایس ٹٹیالا پانی مردوں کے آس پاس اپنی بھوکی زبان لپلپاتا رہا۔

اس سال کہیں کوئی فصل نہ ہوئی اور ہر جگہ لوگ بھوکے مرنے لگے اور اپنی بدبختی پر بوکھلانے لگے۔ کچھ تو دکن کو سدھارے اور کچھ بے جگرے اور من چلے تھے ان ڈاکوؤں کے دل میں شامل ہوگئے جو علاقے بھر میں اودھم مچا رہے تھے۔ انھوں نے شہر کو لوٹنے کی کوشش بھی کی اور شہر والے پچھمی آبی دروازے کو چھوڑ کر باقی سب دروازوں کو بند رکھنے لگے۔ اس دروازے پر بھی سپاہیوں کا پہرا رہتا اور رات کو اس میں تالا جڑ دیا جاتا۔ کام یا

بھیک یا لوٹ کی تلاش میں جنھوں نے اپنا دیس تج دیا ——
جیسا کہ وانگ لنگ اور اس کے گھر والوں کو بھی کرنا پڑا تھا ——
انھیں چھوڑ کر ایسے بہتیرے لوگ تھے جو یا تو بوڑھے تھے یا ڈرپوک یا زندگی سے بیزار۔ یہ سب اپنے گھروں میں فاقے کرتے پڑے رہتے گھاس پھوس یا بلند مقاموں میں بچی کھچی بتیوں پر ان کا گزارہ تھا اور ان میں بہتیرے جل تھل میں مر گئے۔

وانگ نے اپنی پوری عمر میں ایسا قحط نہ دیکھا تھا کیونکہ وقت پر پانی نہ اُترا کہ سردیوں کے لیے گیہوں بوئے جا سکیں اور اس طرح اگلے سال کی فصل بھی ماری گئی۔ اب وہ پھونک پھونک کر قدم رکھنے لگا۔ کوئل سے کئی بار اس کی تو تو میں میں ہوئی کیونکہ وہ گوشت خریدنے شہر جایا کرتی تھی۔ جب سیلاب آ ہی گیا تو وانگ لنگ کو ایک طرح کی خوشی ہوئی کہ گھر اور شہر کے بیچ پانی نے کوئی راستہ نہ چھوڑا تھا کہ کوئل بازار جا سکے۔ اس کے حکم کے بغیر ڈونگیا کہیں آ جا نہ سکتی تھیں اور کوئل کی ساری لنترانی کے باوجود چنگ صرف اپنے مالک کی بات سنتا تھا۔

سردیاں آتے ہی وانگ لنگ نے ہر قسم کی خرید فروخت بند کردی اور کھانے پینے کی چیزیں بڑے احتیاط سے برتنے لگا۔ گھر کے لیے دن بھر کی رسد وہ اپنی بہو کو دے دیتا اور کارندوں کا کھانا دانا وہ چنگ کے حوالے کرتا حالانکہ ان نٹھلّوں کو کھلانا اسے بہت اکھرتا تھا۔ اس حد تک جب سردی شروع ہوئی اور پانی جمنے لگا تو اس نے نوکروں کو حکم دیا کہ دکن جائیں اور محنت مزدوری یا بھیک

نگ کر پیٹ پالیں اور جی چاہے تو موسم بہار میں پھر لوٹ آئیں۔
رف کمل کو چوری چھپے وہ گھی شکر دیا کرتا کیونکہ اسے سختی جھیلنے کی
ادت نہ تھی۔ نوروز تک تو انھیں کھانے کے لیے ایک مچھلی اور
یک سور کے سوا کچھ نہ ملا۔ لیکن یہ مچھلی بھی وہیں کی جھیل کی پکڑی
وئی تھی اور سور بھی گھر ہی کا تھا۔

وانگ لنگ اپنے کو جتنا بتلاتا تھا اتنا غریب نہ تھا۔ کیونکہ
بس کمرے میں اب اس کا بیٹا بہو کے ساتھ رہا کرتا تھا اس کی
یواروں میں روپے چنے ہوئے تھے حالانکہ ان دونوں کو اس امر کا
لم نہ تھا۔ سامنے کے کھیت کی باؤلی میں ایک گھڑے کے اندر
س نے سونا روپا چھپا رکھا تھا۔ بانس کے پیڑوں کی جڑ تک
یں اس نے خزانے گاڑ رکھے تھے۔ پچھلے سال کی فصل بازار میں
فروخت کرنے کے بدلے اس نے گھر میں بچا رکھی تھی جس کی وجہ
سے اس طرف سے بھی وہ مطمئن تھا

لیکن اس کے پاس پڑوس میں فاقہ کشوں کا انبوہ لگا رہتا تھا۔
اور وانگ لنگ شکوہ و فریاد کا وہ منظر نہ بھولا تھا۔ جب بڑی
حویلی پر غریبوں کی بھیڑ چڑھ آئی تھی۔ وہ خوب جانتا تھا کہ اس سے
حسد و رشک کرنے والوں کی کمی نہیں ہے کیونکہ اب تک اس کے
ہاں کھانے پینے کا وافر سامان موجود تھا۔ اس لیے اس نے پھاٹک
اندر سے بند کر لیے اور بے جانے پہچانوں کو اندر نہ آنے دینے کا
حکم دیا۔ پھر بھی اسے اس امر کا احساس تھا کہ چچا نہ ہوتا تو اس بدامنی
اور افراتفری کے زمانے میں وہ کسی طرح محفوظ نہ رہ سکتا تھا۔ وہ خوب

سمجھتا تھا کہ دولت، عورتوں اور اناج کی وجہ سے یقیناً اس کا گھر لٹ لٹا کر آگ کے سپرد کر دیا جاتا، مگر ایک چچا کا دم تھا جو اس کے آڑے آیا۔ اس لیے چچا اور اس کی بیوی بیٹے سے وہ نہایت خندہ پیشانی سے ملتا اور ان سے معزز مہمانوں کا سا برتاؤ کرتا۔ سب سے پہلے ان کے آگے چائے اور کھانا پیش کیا جاتا۔

وہ تینوں بھی بھانپ گئے کہ وانگ لنگ ان کا لوہا مانتا ہے اور ان کی اکڑ کی حد نہ رہی۔ ان کے مطالبوں اور شکایتوں کی فہرست طویل ہونے لگی۔ خصوصاً چچی سب سے زیادہ چڑ چڑی کیونکہ اب اسے زنانے میں بھانت بھانت کے پکوان نہ ملتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنے شوہر سے وانگ لنگ کی بُرائی کرتی اور تینوں اس بیچارے کے پیچھے پڑ جاتے۔

چچا اب بڑھاپے کی وجہ سے زیادہ لاپروا اور کاہل ہو گیا تھا اور اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو وہ کبھی شکوہ شکایت نہ کرتا۔ مگر بیوی اور بیٹا اسے اکساتے رہتے تھے اور ایک روز وانگ لنگ نے دروازے کی آڑ سے ان دونوں کو بڈھے سے یہ کہتے سنا۔

"اس کے پاس اناج اور دولت کی کمی نہیں۔ ہم اس سے زیادہ کیوں نہ مانگیں۔" عورت نے یوں بات بنائی: "اس پر کبھی ہمیں ایسا قابو نہ ملے گا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ تم میں اس میں خون کا رشتہ نہ ہوتا تو یہ گھر لٹ کر برباد ہو جاتا اور یہاں تنکا بھی باقی نہ رہتا، کیونکہ تم تو ڈاکوؤں کے سردار کے نایب ہو۔"

وانگ لنگ نے آڑ سے جب یہ باتیں سنیں تو غصّے کے مارے

پیچ وتاب کھانے لگا۔ لیکن ضبط کے سوا چارہ ہی کیا تھا کیونکہ ان تینوں کی روک تھام کی کوئی تدبیر اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ دوسرے دن چچا اس کے سر پر آ کھڑا ہوا اور بولا: "عزیز من مجھے تمبا کو اور ایک نئے پائپ کی ضرورت ہے اور میری بیوی کے وہ پھٹے حال ہیں کہ اسے ایک نیا کوٹ بنوانا ہی ہوگا۔" وانگ لنگ دانت کٹکٹا کر رہ گیا مگر بٹوے میں سے پانچ روپے نکال کر اس کی نذر کرتے ہی بنی۔ پرانے زمانے میں بھی جب چاندی اس کے لیے بہت کمیاب تھی، اس کے جانے کا اسے ایسا غم نہ ہوا ہوگا۔

لیکن دو روز بعد چچا پھر روپوں کے لیے آیا اور اس مرتبہ وانگ لنگ سے چپ نہ رہا گیا:

"کیا آپ ہم سب کے کپڑے بھی اتار لینا چاہتے ہیں؟"

چچا نے ہنس کر لاپروائی سے کہا:

"میاں، ناشکری نہ کرو۔ جن کے پاس تمھارے جتنے روپے نہیں ہیں، وہ بھی اپنے مکانوں کی جلی ہوئی شہتیروں سے مردہ لٹک رہے ہیں!"

یہ سنتے ہی وانگ لنگ پسینے پسینے ہوگیا اور چپ چاپ اسے روپے دے دیے۔ خود اس کے گھر گوشت نہ پکتا تھا لیکن چچا کے ہاں صبح و شام پلاؤ قورمے کی بہار رہتی تھی اور وانگ لنگ کے لیے تمبا کو اب عنقا تھا مگر چچا کا پائپ لگاتار دھوئیں کے بادل اڑایا کرتا تھا۔

وانگ لنگ کا بڑا بیٹا اپنی دلہن میں ایسا مگن تھا کہ اور کسی چیز کا اسے دھیان ہی نہ تھا۔ لیکن بیوی کو وہ چچا کے لڑکے سے

الگ الگ رکھتا اور اس وجہ سے اب یہ دونوں دوست کٹّر دشمن ہوگئے تھے۔ دن بھر وہ بیوی کو کمرے میں بند رکھتا اور صرف شام کو اسے باہر آنے دیتا جب اس کا رقیب چچا کے ساتھ باہر چلا جاتا تھا۔

لیکن جب اس نے ان تینوں کو وانگ لنگ کو لوٹتے کھسوٹتے دیکھا تو اسے سخت ناگوار گزرا کیونکہ وہ یوں بھی تنک مزاج تھا اور باپ سے بولا:

"اگر آپ کو بیٹے بہو سے زیادہ ان تینوں بھیڑیوں کا خیال ہی تو صاف کہہ دیجیے تاکہ ہم الگ اپنا انتظام کریں۔"

وانگ لنگ نے اب تک جو بات کسی سے نہ کہی تھی وہ اپنے بیٹے سے آج کہی:

"میرا بس چلے تو ان تینوں کا گلا گھونٹ دوں لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میرا چچا ڈاکوؤں کا سردار ہی اور تب تک ہم خیریت سے ہیں جب تک اس کی دوزخ بھریں اور اسے خوش رکھیں۔"

یہ سن کر نوجوان کے ہوش وحواس جاتے رہے لیکن جب اس نے غور کیا تو غصہ اور بھی بھڑکا:

"ایک تجویز سنیے۔ ان تینوں کو ہم پانی میں کیوں نہ ڈھکیل دیں۔ عورت سے موٹاپے کے مارے ہلا جلا نہیں جاتا اور چنگ اس کے لیے کافی ہی، میں اس کے بیٹے کا گلا ناپوں گا کیونکہ وہ ہمیشہ میری بیوی کو گھورا کرتا ہی اور آپ بڈّھے سے نبٹ لیجیے گا۔"

لیکن وانگ لنگ کسی پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ یہ سچ ہی کہ کسی حیوان کی بہ نسبت وہ اپنے چچا کو زیادہ آسانی سے قتل کرسکتا تھا مگر اس نفرت کے باوجود یہ اس کی فطرت کے خلاف تھا۔

" یہ تو نہ ہوگا ۔ اگر اپنے باپ کے سگے بھائی کو اپنے ہاتھوں سے ڈُبا مارنے کے لیے میں تیار بھی ہوگیا تو ڈاکوؤں سے یہ خبر چھپی نہ رہے گی ۔ پھر ہم کیا کریں گے ۔ اس کی حیات ہی میں ہماری عافیت ہے ۔ کیونکہ اس کے مرنے کے بعد ہماری حالت بھی دوسروں کی سی ہو جائے گی جن کی جان اس پر آشوب زمانے میں ہمیشہ خطرے میں ہے ۔"

اب دونوں خاموش ہوکر اپنے اپنے طریقے سے اس مصیبت پر غور کرنے لگے ۔ نوجوان کو بھی اپنے باپ کی رائے سے اتّفاق ہوا کہ خون خرابے سے یہ گُتھّی نہ سلجھے گی اور کوئی دوسری تدبیر سوچنا چاہیے۔ بہت سوچ بچار کر وانگ لنگ نے کہا:

" کاش کوئی ایسی صورت ہوتی کہ یہ کمبخت یہاں رہتے بھی اور ہمیں تکلیف بھی نہ پہنچاتے۔ یہ کتنا اچھا ہوتا! مگر یہ تو کوئی جادوگر بھی نہ کر سکے گا ۔"

نوجوان نے خوشی سے تالی بجاکر جواب دیا:

" آپ نے بھی مجھے کیا بات سمجھائی! ہم انھیں افیون کا عادی بنا دیں اور یہ جتنی افیم مانگیں انھیں دیئے جائیں ۔ میں چچی کے بیٹے سے دوستی گانٹھ کر اسے چائے خانے لے جاؤں جہاں افیون ملا کرتی ہے ، اسے بھی پلاؤں اور اس کے ماں باپ کے لیے بھی خریدوں ۔"

وانگ لنگ کو اتنی دور کی کبھی نہ سوجھی تھی، وہ ہچر مچر کرنے لگا:

" اس سے تو میرا دیوالہ نکل جائے گا ۔ کیونکہ افیون جواہرات سے کم قیمتی نہیں ۔"

مگر نوجوان اپنی ضد پر قایم رہا:

"لیکن ان کی ذات جواہرات سے کم خرچ طلب نہیں۔ اور اس کے علاوہ دانتا کِلکِل اور تاک جھانک ہی سوا الگ۔"

وانگ لنگ ایک بیک اس تدبیر پر عمل پیرا نہ ہوا کیونکہ دوسری رکاوٹوں کے علاوہ سب سے بڑا سوال روپلوں کا تھا۔

بہت ممکن ہے کہ معاملہ کھٹائی میں پڑا رہتا اور سیلاب کے اتار تک کچھ نہ کیا جاتا، لیکن اسی زمانے میں ایک نیا واقعہ ہوا۔

چچا کے بیٹے کی آنکھ وانگ لنگ کی چھوٹی لڑکی پر پڑی حالانکہ ان دونوں میں بھائی بہن کا رشتہ تھا۔ یہ لڑکی ہزاروں حسینوں میں ایک تھی۔ اپنے بیوپاری بھائی سے وہ ملتی جلتی تھی۔ مگر ایک تو ویسی زرد رو نہ تھی اور پھر نازک اندامی میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی۔ اس کا رنگ بادام کے پھولوں کا سا ہلکا پیلا تھا، ناک چھوٹی سی، ہونٹ گلاب کی پنکھڑی سے اور پانو سڈول تھے۔

ایک رات کو جب وہ باورچی خانے سے نکل کر دالان سے اکیلی گزر رہی تھی اس بدمعاش نے اسے پکڑ لیا اور بری طرح جکڑ کر اس کا سینہ مسکنے لگا۔ لڑکی کی چیخ سن کر وانگ لنگ دوڑا اور اس نے اس پاجی کے ایک چپت رسید کی۔ لیکن کتا چرائے ہوئے گوشت کو یوں [illegible] سے نہیں گرنے دیتا اور وانگ لنگ بمشکل لڑکی کو اس کے شکنجے سے چھڑا سکا۔ مگر وہ چھوٹی ہنسی ہنس کر بولا:

"میں تو کھیل رہا تھا۔ کیا یہ میری بہن نہیں ہے اور کہیں کوئی اپنی بہن پر بری نگاہ ڈالتا ہے؟" لیکن یہ کہتے وقت بھی اس کی آنکھیں شہوت سے چمک رہی تھیں اور وانگ لنگ اسے گالیاں دیتے ہوئے

لڑکی کو اندر لے گیا۔

رات ہی کو اس نے اپنے بیٹے سے یہ ماجرا سنایا اور بیٹا فکرمند ہوکر بولا:

ہمیں لڑکی کو فوراً اس کی سسرال بھیج دینا چاہیے۔ 'لیو' سوداگر عذر کرے گا کہ اس قحط سالی میں شادی بیاہ کا کیا ذکر۔ مگر ہمیں اسے بھیج دینا ہی ہے کیونکہ گھر میں اس سانڈ کے رہتے وہ کنواری نہ رہ سکے گی"

وانگ لنگ نے یہی کیا۔ دوسرے دن وہ شہر اس سوداگر کے گھر پہنچ کر بولا:

"میری بیٹی اب تیرہ سال کی ہوگئی ہے۔ اس کا بچپن بیت گیا اور اب وہ سسرال میں رہنے کے قابل ہے"

'لیو' نے بڑی حیص بیص کے بعد کہا:

"اس سال میری آمدنی اتنی نہیں کہ ایک نیا کنبہ گھر میں بسا سکوں"

وانگ لنگ شرم کے مارے یہ تو نہ کہہ سکتا تھا کہ میرا چچازاد بھائی چھوٹا ہوا سانڈ ہے، مگر اس نے اس طرح بات سمجھائی:

میں لڑکی کی خبرگیری کا ذمہ نہیں لے سکتا۔ اس کی ماں اب حیات نہیں، اور قبول صورت ہونے کے علاوہ وہ بالغ ہوچکی ہے۔ میرے گھر میں ہر قسم کے آدمیوں کا آنا جانا رہتا ہے اور میں ہمیشہ اس کی دیکھ ریکھ نہیں کرسکتا۔ اب وہ آپ کی بہو ہے اور آپ کا فرض ہے کہ اس کی دوشیزگی کی حفاظت خود کریں۔ شادی جب آپ مناسب سمجھیں ہوسکتی ہے"

سوداگر طبعاً شریف اور رحم دل تھا، چنانچہ وہ رضامند ہوگیا:

اگر یہ بات ہے تو آپ اسے فوراً بھیج دیجیے، میں اپنی بیوی سے

کہ دوں گا اور وہ اُن کے ساتھ اندرونِ خانہ رہ سکتی ہے۔ اگلی فصل کے زمانے میں اس کی شادی کر دی جائے گی۔"

یہ انتظام کر کے وانگ لنگ کی جان میں جان آئی اور خوش خوش گھر چلا۔

اس شہر دروازے کو لوٹتے ہوئے جہاں چنگ ڈونگی لیے اس کا انتظار کر رہا تھا، وانگ لنگ کی نظر تمباکو اور افیون کی ایک دکان پر پڑی۔ اپنے حقّے کے لیے تمباکو خریدتے ہوئے اس نے رُکتے رُکتے دکاندار سے پوچھا:

"آج کل آپ کے یہاں افیون کا کیا بھاؤ ہے؟"

"قانوناً ہم افیون کھلے خزانے نہیں بیچ سکتے۔ لیکن اگر گرہ میں دام ہیں تو اندر چلیے، ہم آپ کو دو رُپے چھٹانک کے حساب سے دیں گے۔"

وانگ لنگ نے زیادہ حجت نہ کر کے جلدی سے کہا:

"فی الحال تین چھٹانک تو تول ہی دیجیے۔"



باب ۲۸

چھوٹی بیٹی کو سسرال بھیج کر وانگ لنگ محسوس کرنے لگا کہ کوئی بڑا بوجھ کندھے سے اتر گیا۔ ایک دن اس نے چچا سے کہا:

"آپ میرے باپ کے بھائی ہیں، لیجیے یہ عمدہ تمباکو نوش فرمائیے۔"

اس نے افیون کا ڈبہ کھولا تو اس میں کوئی مہک دار لجلجی چیز رکھی تھی اور اسے سونگھتے ہی چچا کی روح پھڑک اٹھی اور وہ بولا:

"بھئی، پہلے بھی میں نے اسے چکھا ہے اور یہ مجھے بہت پسند ہے، لیکن مہنگی اتنی ہے کہ ہمیشہ پی نہیں سکتا۔"

وانگ لنگ نے جھوٹ موٹ لاپروائی سے جواب دیا:

جب ابّا بہت بوڑھے ہو گئے تھے اور راتوں کو سو نہ سکتے تھے تو میں نے تھوڑی سی ان کے لیے خریدی تھی۔ لیکن یہ یونہی پڑی رہ گئی اور میں نے سوچا کہ لاؤ اپنے چچا کو پلا دوں کیونکہ آخر میں آپ کا چھوٹا ہوں اور مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ اسے رکھیے اور جب کہیں درد ہو یا یوں بھی جی چاہے تو شوق سے نوش جان فرمائیے۔"

چچا نے لالچ کے مارے جھٹ اس کی طرف ہاتھ بڑھایا کیونکہ دل پسند خوشبو کے علاوہ یہ چیز صرف امرا کے استعمال میں آتی تھی۔ چنانچہ ایک چلم خرید کر دن بھر بستر پر لیٹے ہوئے وہ افیون پیتا رہا۔ اب وانگ لنگ کئی چلمیں خرید لایا اور انھیں یہاں وہاں رکھ کر ایسا ڈھونگ رچایا گویا خود بھی افیون پیتا ہے۔ لیکن اس کے کمرے میں

صرف ایک چلم تھی اور وہ بھی ٹھنڈی رہا کرتی تھی۔ لیکن کمل بائی اور اپنے بیٹوں کو وہ افیم چھونے بھی نہ دیتا، یہ کہہ کر ٹال دیتا کہ مہنگی ہے۔ اس کے برعکس چچا اور اس کے بیوی بیٹے کو وہ اس کی رغبت دلاتا۔ جس کی وجہ سے دروِ دالان افیون کی میٹھی میٹھی مہک میں بسے رہتے تھے۔ اس کے لیے رُپے اُٹھاتے اسے کوئی افسوس نہ ہوتا کیونکہ وہ اس طریقے سے امن خرید رہا تھا۔

جاڑوں کے چل چلاؤ کے ساتھ پانی بھی اترنے لگا اور وانگ لنگ اپنے کھیتوں کا دورہ کرنے لگا۔ ایسے ہی موقع پر ایک دفعہ بڑے بیٹے نے پیچھے پیچھے آکر اسے یہ مژدہ سنایا:

"گھر میں جلد ایک نیا مہمان آنے والا ہے اور یہ آپ کا پوتا ہوگا!"

یہ سنتے ہی وانگ لنگ مڑ کر ہاتھ ملتے ہوئے خوشی کے مارے ہنسنے لگا: "آج کا روز بھی کیسا مبارک ہے!"

چنگ کو شہر بھیج کر اس نے مچھلیاں اور بھانت بھانت کے کھاجے منگوائے اور اپنی بہو کے ہاں پیغام کہلا بھیجا:

"خوب کھاؤ اور دیو جیسا بیٹا پیدا کرو۔"

سارے موسم اُسے یہ خیال تسکین پہنچاتا رہا۔ طرح طرح کی مصروفیتوں میں بھی اسے یہ بات یاد آتی اور جب کوئی تکلیف یاد آتی تو اس واقعے کی یاد اسے سہارا دیتی تھی۔

گرمیوں کے ساتھ پردیس سے قحط زدہ باشندوں کی واپسی شروع ہوئی۔ ایک ایک کر کے یا غول باندھ کر جاڑے کی مار کھائے ہوئے یہ سب امنگ میں بھرے ہوئے دیس لوٹے تو اپنے مکانوں کی

جگہ انھیں پیلی مٹّی کی ڈھیریوں کے علاوہ کچھ نہ ملا۔ لیکن اسی مٹّی سے گھر بن سکتا تھا اور اس پر چھپر پڑ سکتا تھا۔ کئی آدمی وانگ لنگ سے قرض لینے آئے اور رُپےؔ کی مانگ دیکھ کر اس نے سود کی شرح بڑھا دی اور زمین کے سوا ہر قسم کی ضمانت نامنظور کرنے لگا۔ اس رقم سے بیج خرید کر انھوں نے کھیت جوتے جواب جی بھر پانی پی کر نہال ہو گئے تھے۔ لیکن جب انھیں بیج کے ساتھ ہل اور بیل کی بھی ضرورت ہوئی اور ان سب کے لیے یک مشت رقم نہ مل سکی تو انھوں نے تھوڑی تھوڑی زمین بیچ دی تاکہ کم از کم باقی ہی کو جوت سکیں۔ اس میں سے بہت سی زمین وانگ لنگ کے حصے میں آئی اور لوگوں کو رپیوں کی ایسی اشد ضرورت تھی کہ انھوں نے کوڑیوں کے مول اپنے کھیت دے ڈالے۔

لیکن ان میں سے کچھ کسی مول پر زمین علیٰحدہ کرنے کو تیار نہ ہوئے اور جب ان کے پاس کھیتی باڑی کا کوئی سامان نہ رہا تو وہ اپنی بیٹیاں بیچنے لگے۔ ان میں سے کچھ یہ مال وانگ لنگ کے یہاں بھی لائے کیونکہ سب جانتے تھے کہ وہ مال دار اور با اثر ہونے کے ساتھ نیک دل بھی ہے۔

اپنے پوتے اور آیندہ پیدا ہونے والے دوسرے بچوں کے خیال سے اس نے پانچ باندیاں خریدلیں۔ ان میں سے دو بارہ بارہ برس کی قوی ہیکل چھوکریاں تھیں اور دو اس لیے تھیں کہ گھر بھر کی چھوٹی موٹی خدمت انجام دے سکیں۔ پانچویں باندی کمل بائی کے لیے تھی کیونکہ اب کوِیل بوڑھی ہو چلی تھی اور جب سے چھوٹی بیٹی

سسرال چلی گئی تھی، گھر کی دیکھ ریکھ کرنے والا کوئی نہ تھا۔ پانچوں کو اس نے ایک ہی دن خرید لیا، کیونکہ اس جیسے امیر کے لیے ارادہ کرنے کی دیر تھی کہ ہر چیز موجود ہو جاتی۔

کئی روز بعد چھ سات برس کی ایک لاغر اندام لڑکی گود میں لیے ہوئے کوئی مرد بیچنے لایا۔ وہ اتنی دبلی پتلی تھی کہ پہلے تو وانگ لنگ نے لینے سے انکار کر دیا۔ لیکن نہ معلوم اس کی کون سی ادا کمل کو بھائی کہ اس نے اٹھلا کر کہا:

"میں تو اسی کو رکھوں گی کیونکہ اس کا چہرہ بھولا ہے۔ دوسری تو موئی سانڈنی لگتی ہے اور اس سے بھیڑ کی سی بو آتی ہے۔ مجھے تو وہ ایک آنکھ نہیں بھاتی۔"

جب وانگ لنگ نے بچی کی سہمی ہوئی بڑی بڑی آنکھوں اور پسلی کی ہڈیوں کو دیکھا تو اس کا جی چاہا کہ اسے پال لیا جائے۔ پھر کمل کی مرضی کا بھی پاس تھا، اس لیے اس نے کہا:

"تمھاری خواہش ہے تو اسے بھی رکھ لو!"

بیس رُپے میں یہ لڑکی خرید لی گئی۔ وہ اندرونی دالان میں رہتی اور کمل کے پائنتی سویا کرتی تھی۔

اب وانگ لنگ کو یقین ہو چلا کہ خدا خدا کر کے گھر میں امن ہو گیا۔ سیلاب اتر جانے اور گرمی آ جانے کے بعد جب جتائی کا زمانہ آیا تو وانگ لنگ نے اپنی چپا چپا زمین کا معائنہ شروع کیا۔ چنگ سے وہ ہر کھیت کی مٹی کی قسم اور پیداوار بڑھانے کے لیے فصل کی مناسب تبدیلی کے متعلق مشورہ کرنے لگا۔ ہر جگہ وہ اپنے سب سے

چھوٹے بیٹے کو ساتھ لے جاتا تاکہ وہ کچھ سیکھ سکے۔ کیونکہ اپنے بعد زمینوں کے انتظام کے لیے اس نے اسی لڑکے کا انتخاب کیا تھا۔ وانگ لنگ نے یہ معلوم کرنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ لڑکے کا دھیان اس معاملات کی طرف ہے یا نہیں۔ اور لڑکا منہ پھلائے سر جھکائے چل رہا تھا اور کوئی نہ جانتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔

وانگ لنگ نے اس کی جانب کوئی توجہ نہ کی۔ جب سب معاملات طے پا چکے تو وہ مطمئن ہو کر یہ سوچتا ہوا گھر لوٹا:

"اب میری عمر ایسی نہیں کہ اپنے ہاتھوں سے محنت کروں۔ یہ کارندے اور بیٹے کس دن کے لیے ہیں؟ اب تو لے دے کر گھر میں تھوڑا سا امن ہوا ہے۔"

لیکن امن اب بھی اس کے گھر سے کوسوں دور تھا۔ عجب کہ بیٹے کا بیاہ ہو جانے، سب کے لیے باندیاں خرید دیئے جانے اور چچا چچی کو دن بھر افیون کی چسکی لگانے کا چسکا پڑ جانے کے باوجود، سکون و قرار ہنوز اس کے لیے حرام تھا۔ اس کے بڑے بیٹے اور چچا زادے کی مناقشت وجہ مخاصمت تھی۔

وانگ لنگ کے لیے ناممکن تھا کہ چچیرے بھائی کی طرف سے اپنے دل کا بغض اور شبہہ دور کر دے۔ نئی جوانی کے دنوں میں اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ وہ شخص کیسا بد باطن ہے۔ اور اب تو حالات اس نوبت کو آ پہنچے تھے کہ جب تک یہ چائے خانہ نہ جاتا دوسرا گھر چھوڑنے کا نام نہ لیتا تھا۔ اسے صرف یہی شک نہ تھا کہ اس شخص کا تعلق لونڈیوں سے ہے بلکہ یہ شبہہ بھی تھا کہ اس نے کمل بائی سے لگا

لگا رکھا ہے۔ یہ دوسرا الزام محض بے بنیاد تھا کیونکہ کمل کا موٹاپا اور بڑھاپا روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ اسے کھانے پینے کے سوا اب کچھ نہ بھاتا تھا اور کسی مرد کو وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی تھی۔ عمر کے ساتھ ساتھ وانگ لنگ کا آنا جانا جتنا کم ہوتا گیا، کمل کو اتنا ہی اطمینان ہوتا گیا۔

وانگ لنگ چھوٹے بیٹے کے ساتھ کھیت سے گھر لوٹا ہی تھا کہ بڑے لڑکے نے باپ کو الگ لے جا کر کہا:

"مجھے چچا کے بیٹے کے ساتھ ایک گھر میں رہنا منظور نہیں۔ جب دیکھو وہ لونڈیوں سے آنکھ لڑایا کرتا ہے اور کپڑے پہننے تک کا اسے ہوش نہیں۔ میں اس کی آوارگی اور تاک جھانک سے تنگ آ گیا ہوں۔"

اسے اپنا یہ شبہ ظاہر کرنے کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ تو آپ کی داشتہ پر بھی ڈورے ڈال رہا ہے۔ کیونکہ یہ یاد آتے ہی وہ شرم سے کٹ کٹ مرا کہ کبھی خود وہ ایسی عورت سے پینگ بڑھا رہا تھا۔ اب اس کے پلپلے چوتڑے اور پھولی ہوئی توند کو دیکھ کر وہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ کبھی اس کا فدائی رہ چکا ہے۔ اس واقعے کی اسے سخت ندامت تھی اور وہ مرتے دم تک اسے گوارا نہ کرتا کہ باپ کو اس کی یاد دلائے اس لیے اس نے صرف لونڈیوں کا ذکر کیا۔

وانگ لنگ بڑی امنگ کے ساتھ کھیتوں سے لوٹا تھا۔ وہ مسرور تھا کہ سیلاب دور پار گیا، ہوا میں گرمی اور خشکی پیدا ہو گئی ہے اور پھر یہ کہ چھوٹا بیٹا اس معائنے میں اس کا ہم رکاب تھا۔ اس نئی بپتا کا حال سنتے ہی وہ بوکھلا اٹھا:

'تمھاری عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں جو یہی لکیر پیٹے جاتے ہو۔ تم اپنی

بیوی پر جو نچھاور ہو رہے ہو، یہ بڑی بُری بات ہے۔ کیونکہ ماں باپ نے جو عورت تمھارے پلے باندھی ہے، اسے سر پر بٹھا کر پوجنا کہاں کی دانائی ہے۔ بیوی سے رنڈی کی سی محبت کرنا اور اس پر دم دینا انتہائی حماقت ہے۔"

باپ کی یہ ڈانٹ تیر کی طرح نوجوان کے کلیجے میں چبھی، کیونکہ تمیز اور شعور کی بیگانگی کا الزام اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ وہ یہ کیونکر سہہ سکتا تھا کہ اسے نادان بتایا جائے۔ پلٹ کر اس نے جواب دیا:

"یہ میری بیوی کا معاملہ نہیں۔ بلکہ یہ میرے باپ کے مکان کے شایان شان نہیں ہے۔"

وانگ لنگ نے اس جواب پر کان نہ دیا کیونکہ وہ غصّے کے مارے کھول رہا تھا:

"میرے گھر میں عورت مرد کا یہ جھگڑا کب تک چلتا رہے گا؟ اب میں بوڑھا ہو رہا ہوں، میرا خون ٹھنڈا پڑ رہا ہے اور خواہشوں کی آگ دب رہی ہے۔ اب تو مجھے سکون ملنا چاہیے۔ لیکن اپنے بیٹوں کے حسد و رشک کو میں کیا کروں ——— اچھا، یہ تو کہو تم چاہتے کیا ہو؟"

جب تک یہ آندھی گزر نہ گئی لڑکا صبر سے باپ کی باتیں سنتا رہا کیونکہ اس کے دل میں کوئی بات تھی۔ یہی دیکھ کر وانگ لنگ نے پوچھا تھا کہ تم چاہتے کیا ہو۔ جواب میں نوجوان نے کہا:

"میں چاہتا ہوں کہ یہ گھر چھوڑ کر ہم شہر کی سکونت اختیار کریں۔ گنواروں کی طرح ہم دیہات میں کیوں سڑتے رہیں۔ چچا اور ان کی بیوی بیٹے کو ہم یہاں چھوڑیں اور چل کر حفاظت سے شہر میں رہیں۔"

یہ سن کر وانگ لنگ کے ہونٹوں پر ایک تیکھی مسکراہٹ آئی اور اس نے اس تجویز کو بالکل ناقابل اعتنا گردان کر رد کر دیا۔ میز پر وہ جم کر بیٹھ گیا اور پایپ سے اسے کچوک کر بولا:

"میرا گھر تو یہی ہے، تمھاری مرضی کہ اس میں رہو نہ رہو۔ میری زمین یہیں ہے اور اگر زمین نہ ہوتی تو ہم دوسروں کی طرح فاقے کرتے اور نہ تمھیں نصیب ہوتا کہ کمخواب کا چوغا پہنے بیٹھے بیٹھے علیت بگھارا کرو۔ یہ اسی دھرتی ماتا کا طفیل ہے کہ تمھاری حالت عام کسانوں سے بہتر ہے۔"

وانگ لنگ دیوان خانے میں دھما دھم چہل قدمی کرنے لگا اور گنواروں کی طرح اوجڈپن برتنے اور یہاں وہاں تھوکنے لگا۔ ایک طرف تو اپنے بیٹے کی نفاست پر اسے فخر ہوتا تھا، لیکن اس کے دل کا دوسرا پہلو عامیانہ پن تھا اور لڑکے سے حقارت کرتا تھا وہ خوب محسوس کرتا تھا کہ اس بیٹے پر اسے گھمنڈ ہے اس لیے کہ کوئی اس نوجوان کو دیکھ کر یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اسے کسانی چھوڑے ابھی ایک ہی پشت گزری ہے۔

لیکن لڑکا یوں آسانی سے ماننے والا نہ تھا۔ اپنے باپ سے وہ بحث کرنے لگا:

"ہوانگ کی بڑی حویلی موجود ہے۔ اس کے باہر ایرے غیرے رہتے ہیں لیکن اندر کا حصہ خالی ہے۔ ہم اسے کرایہ سے لے کر امن و امان کی زندگی گزار سکتے ہیں۔ آپ چھوٹے بھائی کے ساتھ کھیت آ جا سکتے ہیں اور مجھے بھی اس حرام زادے کا کھٹکا نہ رہے گا۔" اپنے باپ کو اس نے بہت دم بتے دیے اور آنکھوں میں آنسو بھی بھر لایا اور انھیں گال پر بہتا ہوا چھوڑ کر منت کرنے لگا: "میں آپ کی فرماں برداری میں

کسر باقی نہیں رکھتا۔ نہ تو میں جوا کھیلتا ہوں نہ افیون کے قریب جاتا ہوں۔ آپ نے جس سے شادی کردی اسی سے خوش ہوں۔ آپ سے میں جو مانگ رہا ہوں وہ تو معمولی سی بات ہے۔"

یہ کہنا مشکل ہے کہ اکیلے ان آنسوؤں کا وانگ لنگ پر کس حد تک اثر ہوتا۔ لیکن ہوانگ کی حویلی کے نام نے کچھ اور ہی اثر کیا۔

وانگ لنگ کو وہ نظّارہ کبھی نہ بھولا تھا جب وہ کانپتے ہوئے اس کوٹھی میں داخل ہوا تھا اور اس کے مکینوں کے آگے جاتے ہوئے ـــــ یہاں تک کہ دربان کے سامنے بھی اس کی روح لرز رہی تھی۔ یہ خیال اس کے لیے سوہان روح تھا اور اب بھی یہ سوچ کر اسے شرم آتی تھی۔ زندگی بھر اسے یہ احساس ہوتا رہا تھا کہ شہر کے امرا سے اس کی عزت کم ہوتی ہے۔ بڑی بیگم کے آگے اپنی پیشی کا منظر یاد آتے ہی اس کی کڑھن ہزار گنا بڑھ گئی۔ اس لیے جب بیٹے نے سمجھایا کہ "ہم اس بڑی حویلی میں رہ سکتے ہیں" تو وانگ لنگ کے تخیّل نے اس خیال کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا:

"میں اس چبوترے پر بیٹھوں گا جہاں بیٹھے بیٹھے بڑی بیگم نے مجھے یوں طلب کیا تھا گویا میں غلام تھا۔ اب میں بھی وہاں بیٹھ کر دوسروں کو بلاؤں گا۔

بہت غور وغوض کے بعد اس نے سوچا: "یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔"

اس خیال سے وہ الگ الگ محظوظ ہوتا رہا مگر لڑکے سے کچھ نہ کہا۔ پائپ پیتے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ میں چاہوں تو کیا کیا کر سکتا ہوں۔

اس میں رہنے کا خیال نہ بیٹے کا پیدا کیا ہوا تھا نہ اس کے بھتیجے کا۔ بلکہ اس کے لیے یہ وہی پرانی بڑی حویلی تھی۔

اس وقت تو اس نے ظاہر نہ ہونے دیا کہ گھر بدلنے کے لیے تیار رہی۔ لیکن چچیرے بھائی کی کاہلی سے اس کی ناراضگی روز بروز بڑھتی گئی اور اس نے دیکھا کہ وہ دراصل لونڈیوں پر نگاہ بد ڈالا کرتا ہے۔ اب تو اس نے دل میں تہیہ کر لیا کہ

"اس بدکار کتے کو میں اپنے گھر میں نہ ٹکنے دوں گا۔"

چچا افیون نوشی کی وجہ سے اور بھی کمزور ہو چلا۔ افیم نے اس کی کھال کو زرد کر دیا۔ بڑھاپے کے مارے وہ جھک گیا اور خون تھوکنے لگا۔ چچی کو دیکھو تو وہ میلے کپڑوں کی گٹھری معلوم ہوتی تھی جب دیکھو جھپکی لگاتی اور اونگھتی رہتی تھی۔ یعنی افیوں نے وانگ لنگ کی مرضی کے مطابق اپنا کام کیا۔

لیکن ان کے بیٹے پر افیون نے اتنی جلدی اثر نہ کیا۔ اب تک وہ بن بیاہا چھوٹا ہوا سانڈ تھا۔ وانگ لنگ کو پسند نہ تھا کہ وہ شادی کرکے بچوں کی جھول پیدا کرے۔ ایک اپنا ہی دم کیا کم تھا جو اس کی نسل پھیلائی جائے، نہ وہ کام کرتا تھا کیونکہ ایک تو نہ اس کو اس کی حاجت تھی اور نہ کوئی اس سے کام کرا سکتا تھا۔ البتہ رات کے وقت وہ جو کار نیک انجام دیتا تھا اسے محنت سے تعبیر کریں تو دوسری بات ہے لیکن جب لوگ گانو کو لوٹنے لگے تو ہر طرف پھر سے امن و انتظام کا دور دورہ ہوا اور ڈاکو دور کی پہاڑیوں میں جا چھپے۔ اس شخص کا دھندا اب بند ہو گیا اور ڈاکوؤں کے ساتھ ہجرت کرنے کے مقابلے میں اس نے

وانگ لنگ کی بھائی کو ترجیح دی۔ سب کی آنکھوں میں وہ کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا اور دن کو بھی تہمد باندھے گپ کرتے اور جمائی لیتے ہوئے یہاں وہاں پھرا کرتا تھا۔

ایک روز اناج منڈی اپنے منجھلے بیٹے کے پاس جا کر وانگ لنگ نے اس معاملے میں اس کی رائے پوچھی:

تمھارے بڑے بھائی کی تجویز ہے کہ ہم شہر میں منتقل ہو جائیں اور بڑی حویلی کے اندر کا حصّہ کرائے سے لے لیں۔ تمھاری کیا رائے ہے؟"

منجھلا بیٹا اب جوان ہو گیا تھا اور دوسرے کارندوں کی طرح وہ صاف ستھرا اور بانکا ترچھا بنا رہتا تھا۔ البتہ وہ پست قد اور زرد رو تھا اور اس کی آنکھوں سے عیّاری جھلکتی تھی۔ اس نے چکنی چپڑی آواز میں کہا:

"اس سے بہتر کوئی تجویز ہو ہی نہیں سکتی مجھے بھی اس سے سہولت ہوگی کیونکہ پھر میں بھی شادی کر سکوں گا، اور ہم سب کسی بڑے کنبے کی طرح ایک ہی مکان میں رہ سکیں گے۔

وانگ لنگ نے اب تک اس لڑکے کی شادی کی طرف توجہ نہ کی تھی کیونکہ اس کا خون ٹھنڈا تھا اور وہ شہوت کی طرف راغب نہ تھا، پھر وانگ لنگ اِدھر اُدھر کے کاموں میں پھنسا رہا تھا۔ لیکن اب اس نے قدرے ندامت سے کہا۔ کیونکہ اس بیٹے سے اس کا سلوک اچھا نہ رہا تھا — "عرصے سے میں تمھاری شادی کے مسئلے پر غور کر رہا تھا۔ لیکن ہمیشہ کوئی نہ کوئی رخنہ پڑ جاتا تھا اور قحط کی وجہ سے تقریبوں کا

التوا ضروری تھا . . . . لیکن اب پھر خوش حالی کا زمانہ آیا ہے تو تمھاری شادی بھی ہو جائے۔"

دل ہی دل میں وہ سوچنے لگا کہ کون سی لڑکی ٹھیک بیٹھے گی۔ لڑکے نے جواب دیا:

"ہاں میں بھی اس فرض سے سبک دوش ہو جاؤں، کیونکہ تیر تکے مارنے کی بجائے گھر میں ایک بیوی کا رکھ لینا اچھا ہے اور انسان کا بھلا اولاد سے ہے۔ لیکن بھائی جان کی طرح کسی سوداگر زادی سے مجھے نہ پھنسا دیجیے گا کیونکہ اپنے میکے کا ذکر کرکے وہ میرا سر کھا جائے گی اور فضول خرچی کرے گی سو الگ - یہ بات مجھے پسند نہ آئے گی۔"

وانگ لنگ یہ سن کر دنگ رہ گیا کیونکہ اپنی بہو کے اس چلن پر اس کی نگاہ نہ گئی تھی - اب تک وہ سمجھتا تھا کہ یہ عورت سلیقہ مند اور قبول صورت ہے۔ بہر حال، اس بیٹے کی گفتگو سے بردباری ٹپکتی تھی اور وہ خوش ہوا کہ کفایت شعاری لڑکے کو اس حد تک عزیز ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وانگ لنگ اس سے بخوبی واقف نہ تھا۔ کیونکہ بڑے بھائی کے مقابلے میں وہ کمزور تھا اور اپنی لن ترانی کے سوا اس میں کوئی بات ایسی نہ تھی کہ دوسروں کو متوجہ کر سکے - اس لیے اسے دُکان پر بھیج کر وانگ لنگ بالکل بھول گیا۔ جب کبھی کوئی پوچھتا کہ کتنے بچّے ہیں، تو اسے یاد آتی کہ وہ تین بیٹوں کا باپ ہے۔

اب جو اس نے اس نوجوان کو دیکھا تو خوش سلیقگی سے مانگ نکلی ہوئی ہے، بھورے ریشم کا لبادہ زیب تن ہے اور چال ڈھال میں

ایسا ستھرا پن اور آنکھوں میں ایسا کائیاں پن ہے کہ وہ حیرت سے سوچنے لگا:

"یہ بھی میری ہی اولاد ہے!"

باآواز پوچھا: "یہ تو کہو کہ تم کس قسم کی لڑکی پسند کرو گے؟"

نوجوان نے ایسا منجھا یا جواب دیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ پہلے ہی منصوبہ کر چکا ہے:

"میں ایسی لڑکی پسند کروں گا جو کسی زمیندار کی بیٹی ہو۔ اس کے بھائی بند محتاج نہ ہوں اور وہ خوب سا جہیز لائے۔ نہ وہ حسین ہو نہ بدصورت، اور کھانا اچھا پکاتی ہو تاکہ نوکروں کی دیکھ ریکھ کر سکے۔ وہ ایسی ہوشیار ہو کہ اناج کا ایک دانہ یا کپڑے کی ایک تھگلی اِدھر سے اُدھر نہ ہو۔ میں ایسی بیوی چاہتا ہوں۔"

یہ تقریر سن کر وانگ لنگ کی حیرت دگنی ہو گئی کیونکہ یہ نوجوان اس کا بیٹا تھا لیکن اس کی زندگی سے وہ قطعاً ناآشنا تھا۔ جوانی میں اس کے یا بڑے بیٹے کے جسم میں جو گرم گرم خون بہتا تھا، وہ اس نوجوان میں مفقود تھا۔ اس کی سمجھداری پر ریجھ کر وہ ہنس پڑا:

"میں ایسی ہی بہو تلاش کروں گا اور چنگ کو اس خدمت پر مامور کروں گا۔"

مسکراتے ہوئے وہ بڑی حویلی کی طرف گیا اور اس کے اردگرد چکّر لگاتا رہا۔ پہلے تو وہ سنگین شیروں کے پاس جاکر ٹھٹکا مگر اسے روکنے والا کوئی نہ تھا۔ جب وہ اندر گیا تو باہری دالانوں کی وہی

حالت پای جو اس وقت تھی جب وہ اس رنڈی کو ڈھونڈنے آیا تھا۔
پیڑوں پر کپڑے سکھانے کے لیے لٹکا دیئے گئے تھے۔ عورتیں جوتوں
کے تلے سیتی ہوئی چٹر چٹر باتیں بنا رہی تھیں۔ فرش پر بچّے ننگے بدن لوٹتے
پھرتے تھے۔ حویلی اُن عامیوں کی بدبو سے بسی ہوئی تھی جو بڑے
لوگوں کے ہٹتے ہی ان کے گھروں میں گھس آتے ہیں۔ رنڈی کی
کوٹھری میں جھانک کر دیکھا تو وہاں کوئی بڈّھا رہنے لگا تھا اور اس
تبدیلی سے وانگ لنگ کو خوشی ہوئی۔
پچھلے دنوں جب یہاں وہ بڑا گھرانا رہتا تھا۔ اگر وانگ لنگ
آتا تو اپنے کو بھی عام آدمیوں کا ایک فرد سمجھتا اور ان امیروں سے
کچھ ڈرتا کچھ جلتا۔ لیکن اب وہ خود زمیندار بن بیٹھا تھا اور سونے
رُپے کے دفینے اس کے یہاں چھپے ہوئے تھے، اس لیے ان
عامیوں سے اسے نفرت ہوئی اور وہ سوچنے لگا کہ یہ کتنے گندے ہیں
اور ان سے دامن بچائے اور ناک بند کیے وہ کتراتا ہوا اندر گیا۔ ان
غریبوں سے وہ ایسی نفرت کرنے لگا گویا اس بڑے گھرانے سے اس کی
ناتے داری ہو۔
حالانکہ ابھی اس نے کوئی فیصلہ نہ کیا تھا مگر یونہی
ٹہلتے ہوئے اندر چلا گیا۔ پیچھے ایک مقفّل دالان نظر آیا جس کے پاس
ایک بڑھیا بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ غور سے دیکھا تو یہ اس دربان کی
چیچک رو بیوی نکلی۔ اسے اس تبدیلی پر تعجب ہوا کہ پہلے جب وہ
ادھیڑ تھی تو کیسی گول گپا تھی ؟! دانت کیا گویا پیلی کیلیں جبڑوں
میں ادھر لٹکی ہوئی تھیں۔ ایک لمحے کے اندر اس نے محسوس کیا کہ

جب جوانی کے زمانے میں وہ اپنا پہلا بچہ یہاں لایا تھا تب سے لے کر اب تک ایک پورا دور کس سرعت سے گزر چکا۔ اپنی زندگی میں کبھی اس شدت سے اس نے بڑھاپے کے حملے کو محسوس نہ کیا تھا۔

کچھ اداسی سے اس نے بڑی بی سے کہا:

"اٹھو اور مجھے اندر جانے دو۔"

بڑی بی چونک پڑیں اور ہونٹ چاٹ کر جواب دیا:

"جو اندر کے حصے کو کرائے پر لینے کو تیار ہو صرف اسی کے لیے یہ دروازہ کھل سکتا ہے۔"

وانگ لنگ یک بیک بول اٹھا:

"اگر جگہ پسند آئی تو ابھی کرائے پر لے لوں گا۔"

بڑھیا سے اس نے اپنا تعارف نہ کرایا۔ راستہ وہ بھولا نہ تھا اور کشاں کشاں اس کے ساتھ ہو لیا۔ یہ تھا وہ سنسان دالان، یہ تھی وہ کوٹھری جہاں وہ ٹوکری رکھ گیا تھا، ادھر وہ طویل برآمدے سبک و نازک رنگین کھمبوں کے سہارے پھیلے ہوئے تھے۔ بڑھیا کے ساتھ وہ اس شاندار دیوان خانے تک گیا اور اسے فوراً وہ وقت یاد آیا جب یہاں حویلی کی ایک باندی سے شادی کرنے آیا تھا۔ سامنے وہ خوب صورت چبوترا تھا جس پر اپنے نحیف و نزار جسم کو روپہلے ساٹن میں لپیٹے ہوئے بوڑھی بیگم دربار کر رہی تھی۔

جانے کس عجیب جذبے کے تحت وہ چبوترے پر چڑھ کر اس پر بیٹھ گیا جہاں بڑی بیگم اڈا جماتی تھی اور میز پر کہنی ٹیک کر

اس بلندی سے وہ اس بڑھیا ملازمہ کو گھورنے لگا، جو آنکھیں مچمچاتی ہوئی چپ چاپ یہ سارا تماشہ دیکھ رہی تھی۔ ساری عمر وہ جس اطمینان کے لیے ترس رہا تھا۔ اس آن وہ اس کے دل کو مالا مال کر گیا۔ اور وانگ لنگ میز پر ہاتھ پٹک کر یک بیک کہہ اٹھا:

"میں اس مکان کو لے کر رہوں گا!"



باب ۲۹

اب کوئی فیصلہ کر لینے پر بھی اس پر جلد عمل کرنا وانگ لنگ کے بس میں نہ تھا۔ بڑھاپے کے ساتھ اس کا جی چاہنے لگا کہ شام سے پہلے کام ختم ہو جائے تاکہ وہ جھٹپٹے کے سمے آرام سے بیٹھ کر ڈوبتے ہوئے سورج کا نظارہ کر سکے اور کھیتوں میں گھومنے پھرنے کے بعد قیلولہ کر سکے۔ لہذا بڑے بیٹے کو اپنے منصوبے کی اطلاع دے کر اس نے معاملہ طے کرنے کی ہدایت کی۔ منجھلے بیٹے کو بلا بھیجا کہ سامان منتقل کرنے میں مدد پہنچائے۔ چنانچہ ایک روز کمل اور کویل اپنا بوریا بدھنا لیے ہوئے بیٹے بہو اور نوکر چاکروں کے ساتھ وہاں چلی گئیں۔

لیکن وانگ لنگ اس وقت نہ گیا بلکہ سب سے چھوٹے بیٹے کے ساتھ وہیں چند سے ٹھہرا رہا۔ اور جب وہ گھڑی آ پہنچی جب اس زمین سے اٹھ جانا تھا جہاں وہ پلا بڑھا تھا، تو یہ مرحلہ خلاف توقع مشکل نکلا۔ جب بیٹے بار بار نئے گھر اٹھ چلنے کا اصرار کرنے لگے تو وہ بولا:

”تنہا میرے لیے ایک ڈیوڑھی تیار کر دو اور پوتے کی پیدائش سے پہلے میں ایک نہ ایک روز وہاں آ رہوں گا۔ جب جی چاہے گا میں کھیت لوٹ آؤں گا۔“

جب وہ زیادہ مصر ہوئے تو اس نے جواب دیا:

”اصل بات یہ ہے کہ مجھے اپنی پگلی بٹیا کی فکر ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ

اسے بھی لے چلوں یا نہیں۔ لیکن اسے اپنے ساتھ رکھنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں کیونکہ میرے سوا کوئی پروا بھی نہ کرے گا کہ اس کے منہ میں ایک کھیل بھی اڑ کر گئی یا نہیں ؟"

وانگ لنگ نے یہ جملہ اپنی بڑی بہو پر کسا تھا کیونکہ بے چاری پگلی اس کے قریب بھی نہ پھٹک سکتی تھی۔ بہو ہمیشہ چڑچڑاتی بڑبڑاتی رہتی: "نوج جو کوئی ایسی زندگی تیر کرے۔ جو اس کا منہ دیکھے اس کا بچہ پیٹ میں ہی مرجائے گا۔" وانگ لنگ کے بڑے بیٹے کو اپنی بیوی کے یہ چرتر یاد آئے اور اس کی زبان نہ کھلی۔ باپ کو بھی اپنے کہے کا پچھتاوا ہوا اور اس نے اپنا لہجہ نرم کرلیا:

"جب منجھلے لڑکے کے بیاہ کی بات پکّی ہوجائے گی تو میں یقیناً آجاؤں گا۔ اس وقت تک میرا چِنگ کے ساتھ یہیں قیام کرنا بہتر ہے۔"

یہ سن کر منجھلے بیٹے نے زیادہ اصرار نہ کیا۔

اب اس گھر میں وانگ لنگ اپنے سب سے چھوٹے بیٹے اور پگلی بیٹی کے ساتھ رہنے لگا۔ چچا اپنی بیوی بیٹی کے ساتھ ڈٹا رہا اور چِنگ تو اپنے مزدوروں کے ساتھ وہاں تھا ہی۔ چچا نے جھٹ کمل والے حصّے پر قبضہ کرلیا۔ وانگ لنگ نے اس کا زیادہ برا نہ مانا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ چچا قبر میں پانو لٹکائے بیٹھا ہے۔ جب وہ مرجائے گا تو اس کے خاندان کے تئیں وانگ لنگ کے فرائض ختم ہوجائیں گے۔ اگر اس کے لڑکے نے وانگ لنگ کا کہا نہ مانا تو وہ اسے کھڑے نکال باہر کرے گا اور دنیا ہرگز اسے برا نہ سمجھے گی۔

چنگ اپنے کارندوں کے ساتھ باہر اور وانگ لنگ اپنی اولاد کے ساتھ اندر رہنے لگا اور گھر کے کام کاج کے لیے اس نے ایک مسٹنڈی نوکرانی رکھ لی۔

یک بیک وہ سخت تھکن محسوس کرنے لگا اور یہ گھر اسے بہت پر امن معلوم ہوا۔ اب وہ سونے اور آرام کرنے کے سوا کسی کام پر دھیان نہ دیتا تھا۔ یہاں کوئی اسے ستانے والا نہ تھا کیونکہ چھوٹا بیٹا کم سخن تھا اور باپ کے معاملات میں دخل نہ دیتا تھا۔

خدا خدا کر کے ایک دن وہ بھی آیا کہ وانگ لنگ کو اپنے منجھلے بیٹے کا خیال آیا اور اس نے چنگ کو اس کے لیے لڑکی ڈھونڈنے کا حکم دیا۔

حالانکہ چنگ بیدِ مجنوں کی مانند لاغر اور بڑھاپے کے مارے جھک گیا تھا اور وانگ لنگ اب اسے کھرپی تک اٹھانے نہ دیتا تھا اور کھیتوں میں بیل تک نہ ہانکنے دیتا تھا، پھر بھی اس میں کسی پرانے وفادار کتے کی سی سکت باقی تھی۔ وہ دوسروں کے کام کی نگرانی کرتا اور اناج اپنے سامنے تلواتا۔ چنانچہ جب اسے اپنے مالک کی مرضی کا پتا چلا تو وہ نہا دھو کر اور کپڑے بدل کر آس پاس کے گانوں کے گشت کے لیے نکل گیا۔ بہتیری کنواریوں کو دیکھ بھال کر وہ لوٹا اور یہ کیفیت سنائی۔

" صاحب زادے کے لیے دُلہن کا انتخاب اتنا آسان نہیں جتنا اپنی ذات کے لیے۔ لیکن اگر میں جوان ہوتا اور یہ میرا معاملہ ہوتا تو اس لڑکی کو پسند کرتا جو یہاں سے تین دیہات پرے رہتی ہے

وہ تندرست، نیک دل اور ہوشیار ہے۔ ہنسوڑپن کے سوا اس میں کوئی عیب نہیں اور اس کا باپ آپ کے خاندان سے یہ رشتہ جوڑنے کو بخوشی تیار ہے۔ زمانے کو دیکھتے ہوئے وہ جہیز بھی کافی دے رہا ہے اور پھر وہ زمیندار بھی ہے۔ لیکن میں نے آپ کی رضامندی کے بغیر زبان دینا مناسب نہ سمجھا۔"

وانگ لنگ کو بھی یہ نسبت بھائی اور وہ جلد از جلد اس فریضے سے سبک دوش ہونا چاہتا تھا۔ وہ فوراً رضامند ہو گیا اور اقرار نامے پر اپنی مہر لگا دی۔ پھر مطمئن ہو کر بولا:

"اب صرف ایک لڑکا بچ رہا ہے۔ پھر اس بیاہ شادی کی کھڑاگ سے نجات مل جائے گی اور مجھے امن نصیب ہو گا۔"

جب بات پکّی ہو گئی اور شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی تو وانگ لنگ دھوپ میں پانو پسار کر بیٹھ گیا اور اپنے باپ کی طرح وہیں سو گیا۔

جب وانگ لنگ نے دیکھا کہ بڑھاپے اور خوش خوراکی کی وجہ سے وہ توندل اور کاہل ہوتا جاتا ہے، ادھر چنگ کو بڑھاپا جھکا رہا ہے اور چھوٹا بیٹا اتنا کم عمر ہے کہ ذمّہ داری نہیں سنبھال سکتا تو یہی مناسب معلوم ہوا کہ دور دراز کے کھیت آدھے ساجھے پر دوسروں کو کاشت کے لیے دے دیئے جائیں۔ اس نے یہی کیا اور پڑوس کے دیہاتوں کے کئی کسان زمین اٹھانے اور اس کی آسامی بننے آئے۔ طے یہ ہوا کہ آدھی پیداوار زمیندار کو اور آدھی کاشت کار کو ملے گی۔ بعض دوسری چیزوں کا تبادلہ بھی طے پایا۔ مثلاً وانگ لنگ کھاد کی ایک خاص مقدار اور تیل نکالنے کے بعد السی اور سرسوں کی کھلی انھیں دے گا جس کے

بدلے وہ وانگ لنگ کے گھر کے لیے سبزی وغیرہ مہیا کریں گے۔

اب کیونکہ پہلے کی طرح دیکھ ریکھ کی ضرورت نہ تھی، اس لیے وانگ لنگ کبھی کبھی شہر جا کر اُس ڈیوڑھی میں آرام کرتا جو اس نے اپنے لیے بنوائی تھی۔ لیکن صبح ہوتے ہی وہ انتظار کرتا کہ شہر کا دروازہ کھلے تاکہ وہ اپنی زمین کی طرف جا سکے وہاں آکر جب وہ کھیتوں کی سوندھی سوندھی مہک سونگھتا تو اس کے دل کی کلی کھل جاتی تھی۔

یہی نہیں بلکہ گویا دیوتا اس پر مہر و کرم کی بارش کرنے پر تلے ہوئے تھے اور انھوں نے اس کے بڑھاپے کے لیے امن و سکون کا انتظام کر رکھا تھا۔ اس کا چچا زاد بھائی بیکل رہنے لگا کیونکہ ایک تو گھر کا سونا پن اسے کاٹنے لگا تھا اور پھر موٹی تازی نوکرانی کے سوا ــــ اور وہ بھی کسی مزدور کی بیوی تھی ــ گھر میں کوئی عورت نہ رہی تھی۔ جب اس نے سنا کہ شمال میں کہیں لڑائی ہو رہی ہے تو اس نے وانگ لنگ سے کہا:

کہتے ہیں کہ اُتر میں کہیں لڑائی ہو رہی ہے۔ میں اس میں شریک ہونا چاہتا ہوں تاکہ کچھ کروں اور دیکھوں۔ اگر آپ مجھے وردی، بستر اور بدیسی بندوق کے لیے رُپے دیں تو میں کوچ کا انتظام کروں!!

یہ سن کر وانگ لنگ کا دل باغ باغ ہو گیا مگر اس نے کائیں پن سے اپنی خوشی چھپالی اور یوں باتیں بنانے لگا:

"تم چچا کے چشم و چراغ ہو اور اگر تم لام پر چلے گئے تو انھیں مٹی کون دے گا؟"

مگر اس شخص نے ہنس کر جواب دیا:

"میں کوئی انیلا تو ہوں نہیں کہ جان جوکھم میں ڈالوں ۔ لڑائی کے میدان میں قدم بھی نہ رکھوں گا ۔ میں تو کچھ سیر سپاٹا کرنا چاہتا ہوں تاکہ عمر ڈھلنے سے پہلے باہر کی دنیا دیکھ لوں ۔"

وانگ لنگ نے جھٹ پٹ رُپے اسے تھما دیئے کیونکہ اس مرتبہ بھی اسے یہ صرفہ نہ اکھرا ۔ اس نے اپنے کو یوں سمجھا لیا :

"اگر یہ مشغلہ اسے بھا گیا تو یہ بلا میرے گھر سے ٹل جائے گی ، کیونکہ لڑائی کا کیا ہے، وہ تو کہیں نہ کہیں ہوتی ہی رہتی ہے اور میری قسمت راس آئی تو وہ زندہ نہ بچے گا ۔ آخر لڑائی میں لوگ مرتے ہیں یا نہیں ۔"

اس کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا حالانکہ اسے چھپانے کے لیے وہ سب جتن کرتا رہا ۔ جب بچی لڑکے کی روانگی کی خبر سن کر رونے لگی تو وانگ لنگ نے اسے سمجھایا بجھایا اور تھوڑی افیون اور دی اور اس کے لیے چلم بھر کر بولا :

"خدا چاہے تو ایک روز وہ جنرل کرنل کا عہدہ پائے گا اور سارے کنبے کا نام اُچھالے گا ۔"

اس کے بعد اللہ اللہ کر کے امن نصیب ہوا کیونکہ دیہات والے مکان میں دو بڈھے افیونیوں کے سوا کوئی نہ رہا اور شہر والے گھر میں پہلے پوتے کے تولد کی ساعت آ پہنچی ۔

جیسے جیسے وہ گھڑی قریب آتی گئی ۔ وانگ لنگ کا قیام شہر میں طول کھینچتا گیا ۔ آنگن میں چہل قدمی کرتے ہوئے وہ پچھلے واقعات کی ورق گردانی کرتا تھا اور رہ رہ کر حیرت کرتا تھا کہ یہ کیا سے کیا ہو گیا :

جہاں کبھی ہوانگ کا نامدار خاندان رہا کرتا تھا وہاں اب وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ قیام پزیر ہی اور آج کل میں اس کے پوتا ہونے والا ہی۔

فرطِ مسرت میں اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنے عزیزوں کے لیے دوعالم خرید کر لا دے گا۔ ان سب کے لیے وہ ساٹن اور ریشم کے تھان مول لایا۔ کیونکہ منقش کرسی میز پر معمولی روئی کی پوشش کتنی بدنما جنچتی تھی۔ غلاموں کے لیے بھی وہ رنگ برنگے کپڑے لایا تاکہ انھیں پھٹا پرانا لباس نہ پہننا پڑے۔ یہ سب کرکے وہ محظوظ ہوا کیونکہ بڑے بیٹے کے شہری دوست مدعو کیے گئے تھے اور وانگ لنگ مگن تھا کہ وہ سب اس تزک و احتشام کا نظارہ کریں گے۔

یہی نہیں بلکہ وانگ لنگ اب چٹورا بھی ہوگیا۔ وہ آدمی جو کبھی جو کی روٹی لہسن کی ڈلی کے ساتھ مزے لے لے کر کھاتا تھا، اب جبکہ اسے ہاتھ سے کام کرنے کی ضرورت نہ رہی اور وہ دن بھر پڑا اینڈنے لگا، تو اسے سادے کھانوں سے نفرت ہوگئی۔ وہ سب نعمتیں جو امرا اپنی مردہ اشتہا کو حرکت میں لانے کے لیے چکھتے ہیں، مثلاً بانس کی جڑ، مچھلی اور کبوتر کے انڈے، جنوب کے جھینگے اور شمال کے گھونگے، یہ سب اس کے دسترخوان پر چنے جانے لگے۔ کمل اور لڑکے سیر ہوکر یہ پکوان کھاتے اور کوئل اس تبدیلی پر ہنس کر کہتی:

"ایسا معلوم ہوتا ہی کہ اس حویلی کی پرانی زندگی پھر سے تازہ ہوگئی۔ فرق یہ ہی کہ میرا بدن اب لاغر و نحیف ہوگیا ہی اور کسی بوڑھے نواب کے لایق بھی نہیں رہا۔"

یہ کہ کر اس نے چور نگاہوں سے وانگ لنگ کو دیکھا اور وہ ہنس دیا۔ اس کی ان شہوت خیز باتوں کو وانگ لنگ نے سنی انسنی کر دیا مگر دل ہی دل میں پھولا نہ سمایا کہ اسے بوڑھے نواب کا مقابل بتلا رہی ہے۔

اب کاہلی اور عیش کوشی میں دن گزارتے ہوئے وہ بچّے کی ولادت کا انتظار کرنے لگے۔ جب جی چاہتا اٹھتے اور جب جی چاہتا سوتے تھے، ایک صبح بہو کی کراہ سن کر جیسے ہی وہ باہر نکلا، لڑکے سے ملاقات ہوئی جس نے کہا:

"وہ گھڑی آپہنچی۔ لیکن کوئل کہتی ہے کہ اس میں دیر لگے گی کیونکہ عورت دبلی پتلی ہے، اس لیے پیدائش جلدی نہ ہوگی۔"

وانگ لنگ اپنے کمرے میں جا بیٹھا اور جب متواتر چیخیں کان میں پڑیں تو وہ سہما اور غیب کی مدد ڈھونڈنے لگا۔ ایک دکان میں جاکر اس نے اگربتی خریدی اور شہر کے اس مندر میں گیا جہاں رحم کی دیوی اپنے رپہلے شہ نشیں پر جلوہ گر تھی۔ ایک کاہل الوجود پجاری کو پاس بلاکر اس نے پیسے دیئے تاکہ وہ دیوی کے آگے اس کی اگربتی روشن کر دے:

کیونکہ میں مرد ہوں اس لیے یہ خدمت میرے لیے نازیبا ہے۔ مگر میرا پوتا پیدا ہونے والا ہے اور یہ ماں کے لیے مصیبت کی گھڑی ہے کیونکہ وہ دبلی پتلی شہزادی ہے۔ میری بیوی مر چکی ہے اور گھر میں کوئی عورت نہیں کہ یہ خدمت انجام دے سکے۔

جب پجاری عود دان میں یہ بتّیاں کھونسنے لگا تو یک بیک اس خیال نے وانگ لنگ کے دل میں چٹکی لی: "اگر لڑکے کے بدلے لڑکی ہوی

تو کیا ہو گا؟" اس لیے اس نے جلدی سے پجاری کو ہدایت کی :—
"اگر پوتا ہوا تو میں دیوی کو نیا سرخ لباس پہناؤں گا لیکن اگر لڑکی ہوئی تو میں ایک کوڑی بھی خرچ نہ کروں گا۔"

گھبراہٹ کی حالت میں وہ باہر نکلا کیونکہ اس امکان کا اسے خیال بھی نہ آیا تھا کہ لڑکی بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ حالانکہ کڑاکے کی دھوپ پڑ رہی تھی اور ہر طرف گرد و غبار کے بادل چھائے ہوئے تھے، تاہم دوبارہ عود بتّیاں لے کر وہ دھرتی ماتا کے مندر میں پہنچا جہاں دونوں بت زمینوں کی خبرگیری کیا کرتے تھے۔ ان کے آگے عود بتّی جلا کر وانگ لنگ بولا :—

"تین پشتوں سے ہم لوگ تمھاری خدمت کرتے آئے ہیں۔ آج میرے بیٹے کی پہلی اولاد کی پیدائش کا دن ہے۔ اگر لڑکا نہ ہوا تو ہمارا تمھارا تعلّق ہمیشہ کے لیے ختم۔"

یہ سب کر کے جب وہ گھر لوٹا تو نڈھال ہو چکا تھا۔ کرسی پر بیٹھ کر اس نے تالی بجائی کہ ایک غلام چائے لائے اور دوسرا بھیگا ہوا تولیہ لا کر اس کا منہ پونچھے۔ مگر کوئی نہ آیا۔ کسی نے اس کی طرف توجّہ نہ کی۔ گھر بھر میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی لیکن وانگ لنگ کو جرات نہ ہوئی کہ کسی کو روک کر پوچھے کہ بچہ پیدا ہوا یا نہیں اور اگر ہوا تو کیا ہوا۔ دھول میں سنا ہوا وہ تھکا ہارا وہیں بیٹھا رہا مگر کسی نے اس کی بات بھی نہ پوچھی۔

وہ اتنی دیر بیٹھا رہا کہ اسے رات ہونے کا یقین ہو گیا۔ اتنے میں کمل اپنے پلپلے جسم کے بوجھ سے ننھے ننھے پانو پر ڈگمگاتی ہوئی کویل کا سہارا لیے ہوئے اندر آئی اور ہنس کر بولی :

"پوتا مبارک ہوا۔ زچہ بچہ دونوں صحیح سلامت ہیں۔ میں نے بچے کو دیکھا، ماشاءاللہ تندرست اور خوب صورت ہے۔"

یہ سُن کر وانگ لنگ اچھل پڑا اور بچوں کی طرح کھکھلا کر تالی بجانے لگا اور بولا:

"میں یہاں یوں گُم سُم بیٹھا تھا جیسے کوئی اپنے پہلے بچے کی پیدائش کا منتظر ہو۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں اور دل آپ ہی آپ بیٹھا جاتا تھا۔"

جب کمل چلی گئی تو وہ یوں سوچ بچار کرنے لگا: "اپنے سگے بیٹے کی پیدائش کے وقت بھی میں اتنا پریشان نہ ہوا تھا۔"

تنہائی اور خاموشی کے عالم میں اسے وہ سماں یاد آیا جب اولان اپنی تنگ و تاریک کوٹھری میں بند ہو گئی تھی کس طرح اس نے یکے بعد دیگرے بچوں کو جنم دیا اور آہ بھی نہ کی اور کس طرح کوکھ ہلکی ہوتے ہی وہ کھیت میں اس کے دوش بدوش کام کرنے آ کھڑی ہوتی تھی۔ لیکن اس چھوکری کو دیکھو جو اس کی بہو ہے۔ وہ زار و قطار رو رہی تھی، لونڈی باندیاں اس کی خدمت پر مستعد تھیں اور شوہر چوکھٹ پہ کھڑا ہوا تھا۔

پھر جس طرح کوئی بھولا ہوا خواب یاد آتا ہو، اسے یاد آیا کہ کام کرتے کرتے اولان بچے کو دودھ پلانے کے لیے بیٹھ جاتی تھی اور دودھ کی فراوانی سے زمین تر ہو جاتی تھی۔ یہ باور کرنا دشوار تھا کہ کبھی ایسا واقعہ بھی ہوا تھا۔

اس کا بیٹا مسکراتا اور اکڑتا ہوا پاس آیا اور بولا:

"ابّا جان! پوتا مبارک! اس کے لیے کوئی کھلائی ڈھونڈنا ہی کیونکہ مجھے یہ گوارا نہیں کہ میری بیوی اسے دودھ پلاکر اپنی صحت برباد کرے۔ شہر میں بڑے گھروں کی عورتوں کا یہی چلن ہی۔"

وانگ لنگ نے اداسی کے لہجے میں کہا ۔۔ اسے خود علم نہ تھا کہ وہ اداس کیوں ہی:

"اگر بہو اپنے بیٹے کی پرورش نہیں کرسکتی اور کوئی انا رکھنا ضروری ہی، تو کیا کیا جائے ۔ یہی سہی۔"

جب بچّے کی عمر مہینے بھر کی ہوئی تو اس کے باپ نے ماہ گرہ کی دعوت کی جس میں سسرال والوں کے سوا شہر کے سب بڑے لوگ آئے۔ سیکڑوں انڈے رنگوا کر مہمانوں میں بانٹ دیے گئے۔ سارا گھر خوشی سے نہال ہوگیا کیونکہ بچّہ چاق چوبند تھا اور چھٹی کے ایام بخیریت گزر گئے گویا بڑی مصیبت ٹل گئی۔ ہر طرف خوشی کی لہر سی دوڑ گئی۔

جب دعوت ختم ہوگئی تو بیٹے نے وانگ لنگ سے کہا:

"اللہ رکھے، اب ہمارے گھر تین پشتوں کے افراد موجود ہیں ۔ ذی وقار کنبوں کا دستور ہی کہ خاندان کا نسب نامہ چھپاں کر رکھتے ہیں تاکہ تقریب کے موقعے پر اس پر فاتحہ پڑھی جائے۔ ہمیں بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔"

یہ رائے وانگ لنگ کو دل وجان سے پسند آئی، اس لیے اس پر آناً فاناً عمل کیا گیا۔ گول کمرے میں کئی کتبے نصب ہوئے جن میں سے ایک دادا کا اور دوسرے پر باپ کا نام کندہ کیا گیا۔ دو وانگ لنگ اور اس کے بیٹے کے لیے مخصوص کر دیے گئے کہ ان کے انتقال کے بعد نام کھودے جائیں۔ ایک عود دان ان کتبوں کے آگے رکھ دیا گیا۔

یہ سب کر دھر چکنے کے بعد وانگ لنگ کو یاد آیا کہ اس نے رحم کی دیوی کو لال چادر اوڑھانے کی منّت مانی تھی۔ اس کی قیمت وہ مندر پہنچا آیا۔

لیکن دیوتاؤں کی دین میں بخل کا پہلو ضرور رہتا ہے۔ ابھی وہ گھر لوٹ رہا تھا کہ کھیت سے کوئی آدمی دوڑتا ہوا آیا اور خبر دی کہ یک بیک چنگ موت کے گھاٹ جا لگا ہے اور پوچھ بھیجا ہے کہ کیا وانگ لنگ آخری دم اسے دیکھنے آئے گا۔ اس ہانپتے ہوئے ہرکارے کی بات سن کر وانگ لنگ غصّے سے چلّایا:

"میں سمجھ گیا کہ یہ ان دونوں جل ککڑے دیوتاؤں کا کام ہے جو اس لیے بھنّا گئے ہیں کہ میں نے شہر کی دیوی کو لال چادر دی ہے۔ شاید انھیں معلوم نہیں کہ یہ صرف دھرتی کے دیوتا ہیں، بچّے کی ولادت سے انھیں کیا تعلق"۔

حالانکہ دوپہر کا کھانا تیّار تھا مگر وانگ لنگ نے اسے ہاتھ بھی نہ لگایا۔ کمل پکارتی رہ گئی کہ دھوپ ڈھلنے کا انتظار کرلو، لیکن وہ چل کھڑا ہوا۔ یہ دیکھ کر کمل نے اس کے پیچھے موم جامے کی چھتری کے ساتھ ایک باندی دوڑائی۔ لیکن وانگ لنگ کی رفتار اتنی تیز تھی کہ وہ مسٹنڈی بمشکل اس پر چھتری کا سایہ کرسکی۔

وانگ لنگ نے چنگ کی کوٹھری میں پہنچ کر آواز دی:

"بیٹھے بٹھائے یہ مصیبت کہاں سے آئی؟"

کوٹھری میں مزدوروں کی بھیڑ تھی اور ان سب نے حیرانی و پریشانی حالت میں کہا:

"وہ دھان کاٹنے پر تلا ہوا تھا . . . . ہم نے بہت منع کیا کہ تمھاری عمر ایسی نہیں . . . . ایک نیئے کا رندے کو سانٹ پکڑنا نہیں آتا تھا چنگ اسے بتلانے لگا . . . . بڑھاپے میں اتنی محنت نہیں کرنا چاہیے"۔

وانگ لنگ دھاڑ پڑا :

" اس کارندے کو میرے سامنے پیش کرو۔"

یہ بیچارا مالک کے آگے ڈھکیل دیا گیا ایک دیہاتی جو نرا اوجڈ مگر اونچا پورا تھا، اس کی آنکھیں بیل کی سی اور دانت باہر نکلے ہوئے تھے۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا اور اس کے پیر لڑکھڑا رہے تھے۔ وانگ لنگ کو اس پر کوئی رحم نہ آیا۔ اس کے گالوں پر چٹا چٹ طمانچے رسید کیے اور پھر باندی کے ہاتھ سے چھتری چھین کر تا بڑ توڑ پیٹنا شروع کیا۔ کسی نے اسے روکنے کی جرات نہ کی کہ کہیں غصہ خون میں سرایت کرکے زہر کا کام نہ کرے۔ وہ دہقانی دانت کٹکٹاتا اور رہا ہو کرتا ہوا بیچارگی کے عالم میں کھڑا رہا۔

اتنے میں چنگ کے کراہنے کی آواز آئی اور وانگ لنگ چھتری پھینک کر بولا: میں اس اُلو کے پٹھے کو پیٹتا رہ جاؤں گا اور وہ غریب اس اثنا میں مرجائے گا۔"

چنگ کے برابر بیٹھ کر اس نے بیمار کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ سوکھے ہوئے پتے کی طرح ہلکا اور بے جان تھا۔ وہ اتنا گرم اور ہلکا اور سوکھا ساکھا تھا کہ یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ اس میں خون کی گردش بھی ہوسکتی ہے۔ لیکن چنگ کا وہ چہرا جو بالکل پھیکا اور پیلا رہا کرتا تھا، اب سنولا گیا تھا اور اس میں خون کی اِکّی دُکّی چھینٹ جھلک آئی تھیں۔ ادھ کھلی آنکھوں کے آگے کہر سا چھا گیا تھا، وہ کچھ نہ دیکھ سکتی تھیں اور سانس اوپر تلے چل رہی تھی۔ وانگ لنگ نے جھک کر زور سے اس کے کان میں کہا:

" میں آگیا ہوں۔ سچ جانو کہ میں تمھارے لیے ویسا ہی تابوت خریدوں گا جیسا ابا جان کے لیے لایا تھا۔"

لیکن چنگ کے کانوں میں بھی خون اتر آیا تھا۔ اور وہ ظاہر بھی نہ کر سکتا تھا کہ وانگ لنگ کی بات سنی یا نہیں۔ ہانپتے ہوئے وہ موت کی راہ تکتا رہا اور بالآخر مر گیا۔

اس کا دم نکلنے پر وانگ لنگ اتنا رویا کہ اپنے باپ کے مرنے پر بھی نہ رویا تھا۔ اس کے لیے بہترین تابوت خریدا گیا، پجاری بلائے گئے، اور سفید ماتمی لباس پہن کر وہ جنازے کے ساتھ ہولیا۔ اپنے بڑے لڑکے تک کو اس نے ٹخنوں پر سفید پٹی باندھنے کی ہدایت کی گویا کوئی عزیز مر گیا ہو۔ گو اس نے عذر کیا کہ "بہر حال چنگ ہمارا ملازم ہی تو تھا۔ اس کا ماتم کرنا مناسب نہیں۔"

مگر وانگ لنگ نے تین دن تک اسے بھی زبردستی ماتمی لباس پہنوایا۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ چنگ کو خاندانی قبرستان میں دفن کرتا جہاں بڑے میاں اور اولان گاڑے گئے تھے۔ لیکن لڑکوں نے متفقہ طور پر مخالفت کی اور کہا:

"کیا ہمارے دادا اور اماں کے نصیب میں ایک نوکر کی قربت لکھی تھی؟ اور کیا مرنے کے بعد ہمیں بھی اس کے پاس سونا ہوگا؟"

ان سب سے عہدہ برا ہونا وانگ لنگ کے لیے ممکن نہ تھا اور اب وہ گھر میں کسی قسم کی دانتا کلکل نہ چاہتا تھا۔ مجبوراً چنگ کو دروازے کے پاس مدفون کرنے پر اکتفا کیا اور اطمینان سے بولا:

"یہ مقام اسی کا ہے کیونکہ وہ ہمیشہ بدی کی راہ روک کر میری پاسبانی کرتا رہا۔" بیٹوں سے اس نے وصیت کی کہ مرنے کے بعد وہ چنگ کے قریب دفن کیا جائے۔

اب وانگ لنگ نے اپنے کھیتوں کی نگرانی بہت کم کردی۔جب وہ وہاں تنہا جاتا تو چنگ کے خیال سے دل بھر آتا تھا۔ ناہموار کھیتوں میں اکیلے ٹہلنے سے اس کے جوڑ جوڑ میں درد ہونے لگا اور اس دوڑ دھوپ سے اس کا جی اُکتا گیا۔ اس لیے اس نے اپنی ساری زمین پٹے پر اٹھا دی اور لوگ اس پر چیل کی طرح جھپٹے کیونکہ زمین زرخیز تھی۔ لیکن وانگ لنگ نے اراضی کا ایک چپہ بھی بیچنے سے انکار کر دیا۔ اگر پٹے پر اٹھائی تو وہ سال سال بھر کے لیے۔ اس طرح اسے اپنی ملکیت کا کھٹکا بھی نہ رہا۔

اپنے ایک کارندے کو اس نے حکم دیا کہ بال بچوں سمیت گانو والے مکان میں رہے اور افیونی چچا چچی کی خبر گیری کرے۔ اسی وقت اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کی اُداسی دیکھ کر وہ بولا :

اچھا تم بھی شہر چلے چلو۔ اپنی پگلی بٹیا کو بھی میں ساتھ لے جا رہا ہوں، یہ میرے دالان میں رہا کرے گی۔ چنگ کے انتقال کے بعد تم بھی یہاں بڑی تنہائی محسوس کرتے ہو گے اس کے نہ رہنے سے اب مجھے اس کا بھی یقین نہیں کہ کارندے اس بیچاری کی دیکھ ریکھ کریں گے۔ اگر اسے مارا پیٹا گیا یا کھانے پینے کی تکلیف ہوئی تو مجھے کوئی اطلاع تک نہ ہوگی۔ چنگ کے بعد اب ایسا کوئی نہیں کہ تمھیں کاشتکاری کی تعلیم دے۔

اپنے بیٹے بیٹی کو لے کر وانگ لنگ شہر چلا گیا اور پھر بھول کر بھی کبھی گانو کا رُخ نہ کیا۔



باب ۳۰

وانگ لنگ کو محسوس ہوا کہ اب اسے اور کسی چیز کی خواہش نہیں رہی۔ اپنی پگلی بٹیا کے پاس دھوپ میں آرام کرسی ڈال کر حقّہ گڑگڑانے کے سوا اسے اور کوئی مشغلہ نہ تھا کیونکہ زمین پٹے پر اٹھ گئی تھی اور گھر بیٹھے اس کی آمدنی آجاتی تھی۔

زندگی یونہی بسر ہو جاتی۔ لیکن برا ہو بڑے لڑکے کا جسے کبھی اطمینان میسر نہ ہوتا تھا اور جو ہمیشہ 'زیادہ' سے 'زیادہ تر' کی تلاش میں رہتا تھا۔ باپ کے پاس آکر بولا:

"اس حویلی میں ہمیں فلاں فلاں چیز کی ضرورت ہے محض ان اندرونی دالانوں میں بیٹھ کر ہمیں اس غرے میں نہ رہنا چاہیے کہ ہم بھی بڑے آدمی ہیں۔ چھ مہینے میں میرے چھوٹے بھائی کی شادی ہے، لیکن مہمانوں کے لیے نہ ہمارے پاس کافی کرسیاں اور میزیں ہیں، نہ برتن بھانڈے۔ پھر یہ کیسے شرم کی بات ہے کہ مہمانوں کو ان گندے کرایہ داروں اور ان کی عفونت میں سے ہو کر یہاں آنا ہوگا۔ یہ بھی سوچیے کہ میرے بچوں کے علاوہ میرے بھائی کی بھی اولاد ہوگی اور ان کے لیے ہمیں حویلی کے باہر کے حصّے کی ضرورت ہوگی۔"

اپنے بیٹے کے خوب صورت لباس کو دیکھ کر وانگ لنگ نے آنکھیں بند کرلیں اور پائپ کا ایک گہرا کش کھینچ کر روکھے پن سے پوچھا:

"آخر اس لنترانی سے تمہارا منشا کیا ہے؟"

حالانکہ نوجوان سمجھ گیا کہ باپ اس کی باتوں سے بیزار ہی، لیکن آواز اونچی کرکے وہ باصرار بولا:

"میرا مدعا یہ ہی کہ ہمیں حویلی کا بیرونی حصہ بھی لے لینا چاہیے اور ہمارے پاس وہ سب سازوسامان ہونا چاہیے جو ایک امیر اور زمیندار خاندان کے شایان شان ہی۔"

وانگ لنگ دھنواں اڑاتے ہوئے بڑبڑانے لگا:

"یاد رہے کہ یہ زمین میری ہی، اور اس کے حصول کے لیے آپ نے کوئی زحمت نہیں اٹھائی تھی۔"

یہ سن کر لڑکا چلّایا: "ابا جان، آپ ہی نے مجھے علم کی طرف مایل کیا تھا اور اب جو میں اپنے فرایض فرزندی ادا کرنا چاہتا ہوں تو آپ میرا مذاق اڑاتے ہیں، اور ہم دونوں میاں بیوی کو دہقانیوں کی طرح رکھنا چاہتے ہیں۔" غصّے کی حالت میں وہ اس طرح پیچھے مڑا کہ گویا درخت کے تھنے سے ٹکراکر سر پھوڑلے گا۔

وانگ لنگ گھبرایا کہ کہیں لڑکا ہاتھ پانو نہ توڑ بیٹھے کیونکہ وہ ہمیشہ سے سرپھرا تھا اس لیے اس نے جواب دیا:

"جو جی چاہے کرو ——— جو جی چاہے کرو! لیکن خدا کے لیے میرا سر نہ کھاؤ!"

یہ سنتے ہی لڑکا خوش خوش فوراً چلتا بنا کہ کہیں باپ اپنی رائے نہ بدل دے۔ اولین فرصت میں وہ عمدہ کرسیاں اور میزیں خرید لایا۔ دروازوں کے لیے سرخ ریشم کے پردے، بھانت بھانت کے پھول دان اور دیواروں پر ٹانگنے کے لیے تصویریں ——— خصوصاً حسین عورتوں کی۔

— لانا بھی وہ نہ بھولا۔ آنگن میں مصنوعی پہاڑیاں بنانے کے لیے وہ عجیب عجیب قسم کی چٹانیں لایا جنھیں وہ دکن میں دیکھ چکا تھا۔ کئی دن اس نے اسی مصروفیت میں گزارے۔

اس دوڑ دھوپ کی وجہ سے اسے بارہا حویلی کے اندر باہر آنا جانا پڑا۔ جب وہ غریبوں کی کوٹھریوں کے سامنے سے گزرتا ناک بھوں چڑھا لیتا اور ان کی قربت کا متحمل نہ ہوسکتا تھا۔ اس لیے کرایہ دار اس کی پیٹھ پیچھے اس کا مذاق اڑاتے اور کہتے:

"اپنے باپ کے کھیت کی کھاد کی بدبو میاں کو یاد نہ رہی!"

لیکن منہ پر کسی کو یہ کہنے کی جرات نہ ہوتی تھی کیونکہ بہرحال وہ امیر زادہ تھا۔ جب کرایہ طے کرنے کا دن آیا تو غریبوں کو معلوم ہوا کہ ان کے کمروں کا کرایہ دُگنا کر دیا گیا ہے اور کوئی دوسرا انھیں اس کرائے پر لینے کو تیار ہے۔ بوریا بندھنا باندھنے کے سوا ان کے لیے کوئی چارہ نہ تھا۔ اب انھیں معلوم ہوا کہ یہ وانگ لنگ کے بڑے بیٹے کی حرکت تھی۔ وہ ایک ہی کائیاں نکلا، زبان سے کچھ نہ کہا لیکن ہوانگ کے بیٹے کو جو پردیس میں رہتا تھا بالا ہی بالا خط لکھ کر یہ انتظام کر لیا۔ ہوانگ کے بیٹے کو رُپے سے مطلب تھا، اس سے غرض نہ تھی کہ وہ کہاں سے آتا ہے۔

اس وجہ سے غریبوں کو نقل مکان پر مجبور ہونا پڑا اور وہ شکایت کرنے لگے، بددعائیں دینے لگے کہ امیر جو چاہے کر گزرتے ہیں۔ اپنا مختصر سا سامان لیے غصّے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے وہ چلے گئے اور یہ کہتے گئے کہ ایک روز پھر لوٹیں گے۔ کیونکہ جب امیروں کی امارت

حد سے تجاوز کر جاتی ہی تو غریبوں کے دن پھرتے ہیں۔
وانگ لنگ تک یہ باتیں نہ پہنچیں کیونکہ وہ اندر رہتا تھا اور کھا پی کر لوٹ پوٹ کر وقت گزار دیتا تھا، بہت کم باہر آتا تھا۔ کُل انتظام اس نے بڑے بیٹے کے سپرد کر رکھا تھا۔ اس نے ہوشیار معمار اور بڑھئی بلا کر وہ محراب اور حجرے ٹھیک کروائے جنھیں غریبوں نے اپنی گن دگی سے خراب کر دیا تھا۔ پھر سے حوضوں کی مرمت ہوئی اور ان میں سنہری اور رنگ برنگی مچھلیاں چھوڑی گئیں جب سب ٹھیک ٹھاک ہوگیا اور صاحب زادے کے معیار حسن پر ہر چیز جنچ چکی تو حوضوں میں کنول اور سوسن کے پھول اُگائے گئے، اودے رنگ کے ہندستانی بانس بوئے گئے۔ اور وہ سب چیزیں مہیا کی گئیں جو اس نے دکن میں دیکھی تھیں۔ اس کی بیوی اس کی کارگزاری کے معائنے کے لیے باہر آئی اور ہر کونے کھدرے میں گھس کر نکتہ چینی کرتی رہی کہ یہ کم ہی وہ کم ہی۔ شوہر بڑی فرماں برداری سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ تاکہ اس کی خواہش پر عمل کرے۔
شہر والوں تک وانگ لنگ کے بیٹے کی کارروائی کا چرچا پہنچا اور وہ ذکر کرنے لگے کہ دیکھیے کسی امیر کا قدم پڑتے ہی گھر میں کیسی رونق آجاتی ہی۔ وہ لوگ کسان وانگ لنگ کی بجائے اسے ’نواب وانگ لنگ‘ یا ’سیٹھ وانگ لنگ‘ کہنے لگے۔
اس سازوسامان کا سارا خرچ وانگ لنگ سے دھیرے دھیرے وصول کیا جا رہا تھا تاکہ اسے صحیح اندازہ نہ ہونے پائے۔ بڑا لڑکا کبھی آکر کہتا: ”فلاں کام کے لیے سو رُپے دلوایئے“۔ یا ”فلاں دروازے

کی چوکھٹ بدل دی جائے تو بالکل نیا ہو جائے"۔ "یا کمرے میں ایک جگہ خالی رہ گئی ہی جس کے لیے میز کی ضرورت ہی۔"

وانگ لنگ حقّہ گڑگڑاتے ہوئے آنگن میں بیٹھا رہتا تھا اور ہر مطالبے پر گرہ کھول کر دام نکال دیتا تھا، کیونکہ رُپے کی اسے کمی ہی کیا تھی، جب جتنا چاہا منگوا لیا۔ اس لیے دینے میں بھی اسے کوئی تکلّف نہ ہوتا تھا۔ اسے اس سارے خرچ کا صحیح اندازہ کبھی نہ ہوتا، لیکن ایک دن منہ اندھیرے منجھلا لڑکا اس کے پاس آیا اور بولا:

"ابا جان، آخر یہ فضول خرچی کب تک روا رکھیے گا؟ کیا یہ ضروری کہ ہم کسی محل ہی میں رہیں؟ اگر یہ رقم بیس صدی سود پر اٹھا دی جاتی تو چاندی کی ڈھیری لگ جاتی۔ ان حوضوں اور پیڑوں سے کیا حاصل جن میں کبھی ایک پھل بھی نہیں آتا اور ان بیکار پھولوں سے کیا فایدہ؟"

وانگ لنگ سمجھ گیا کہ دونوں بھائی اس معاملے میں جھگڑا شروع کر دیں گے۔ اس لیے جھٹ سے جواب دیا:

"بھئی یہ سب تو تمھاری شادی کے سلسلے میں کیا گیا ہی۔"

نوجوان نے طنز آمیز تبسّم ہونٹوں پر لا کر کہا:

یہ تو کبھی نہیں سنا کہ بیوی سے دس گنا زیادہ خرچ شادی پر کیا جائے۔ آپ کی کمائی جو کبھی ہم بھائیوں میں برابر برابر تقسیم ہوگی آج بڑے بھائی کی نخوت کے صدقے کی جا رہی ہی!"

وانگ لنگ کو اس لڑکے کی مستقل مزاجی کا حال معلوم تھا اور یہ بھی خوب جانتا تھا کہ بحث میں کبھی اس سے ورنہ ہو سکے گا۔ اس لیے

پیچھا چھڑانے کو کہا:

"اچھا، اچھا، میں اس قضیے کو ختم کردوں گا۔ تمھارے بھائی کو تنبیہ کردوں گا اور آیندہ رُپے نہ دوں گا۔ بہت ہو چکا! تم ٹھیک کہتے ہو۔"

نوجوان نے ایک کاغذ نکالا جس میں وہ سب رقمیں درج تھیں جو بڑے بھائی نے صرف کی تھیں۔ اس فہرست کی لمبائی دیکھتے ہی وانگ لنگ گھبرا کر بولا:

"ابھی میں نے ناشتہ بھی نہیں کیا ہے۔ اور اس عمر میں جب تک پیٹ میں دانہ نہ پڑ جائے غشی کی سی کیفیت طاری رہتی ہے۔ پھر کبھی یہ دیکھیں گے۔" یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کے اندر چلا گیا اور لڑکے کو چلتا کیا۔

لیکن اسی روز شام کو اس نے اس معاملے کا ذکر بڑے بیٹے سے کیا:

"آرائش و نمائش کا یہ قصّہ اب ختم ہو جانا چاہیے۔ اتنا کافی ہے۔ بہرحال ہم دیہات کے رہنے والے ہیں۔"

لیکن صاحب زادے نے تمکنت کے ساتھ کہا:

"ہم دیہاتی کیوں ہونے لگے۔ شہر والے تو ہمیں 'وانگ کا نامور گھرانا' کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ ہمیں اس لقب کے شایان شان زندگی بسر کرنی چاہیے۔ اگر میرے بھائی کو چاندی کے سوا کسی شے سے محبّت نہیں تو بلا سے۔ میں اپنی بیوی کے ساتھ خاندان کی عزّت کی حفاظت کے لیے موجود ہوں۔"

وانگ لنگ کو ہرگز علم نہ تھا کہ لوگوں نے　　اسے یہ نام دے

رکھا ہے کیونکہ بڑھاپے کی وجہ سے وہ نہ تو چائے خانے جاتا تھا اور نہ اناج کی منڈی کیونکہ وہاں منجھلا بیٹا سارے کاروبار کے لیے مقرر تھا۔
لہذا یہ سن کر وہ دل ہی دل میں خوش ہوا مگر بظاہر بولا:
"اس سے کیا، بڑے بڑے گھرانوں کی ابتدا دیہاتوں سے ہوئی ہے اور ان کی بنیاد وہیں ملتی ہے"

لڑکے نے چٹ سے جواب دیا:

"یہ سچ ہے، مگر وہاں رہتا کون ہے۔ وہ اپنی شاخیں کہیں اور پھیلاتے ہیں اور ان کے پھل پھول جگہ جگہ پھیلے ہوتے ہیں"
وانگ لنگ کو پسند نہ تھا کہ یہ لونڈا یوں آسانی سے اس کی بات کاٹ دے، اس لیے وہ بولا:
"میری بات پتھر کی لکیر ہے۔ فضول خرچی سے باز آؤ۔ اگر پیڑ میں پھل آنا ہے تو اس کی جڑوں کو زمین میں پیوست ہونا چاہیے"۔
شام ہو چلی تھی اور وانگ لنگ منتظر تھا کہ لڑکا وہاں سے چلا جائے تاکہ اسے سکون میسر ہو اور وہ تنہا شفق کا نظارہ کر سکے۔ لیکن اس لڑکے کی موجودگی سے امن و امان کو کیا واسطہ۔ فی الحال اس کے درو دالان آرام دہ تھے اس لیے وہ باپ کی فرماں برداری پر آمادہ تھا۔ اپنا کام تو وہ کر چکا تھا۔ لیکن اب اس نے ایک نیا راگ چھیڑا:
"خیر، آپ کا حکم سر آنکھوں پر، مگر ایک بات رہی جاتی ہے"
یہ سنتے ہی وانگ لنگ نے گڑگڑی ایک طرف پھینک ماری اور چیخ پڑا:

"کیا مجھے سکون کا ایک لمحہ بھی میسر نہ ہوگا؟"

لیکن لڑکا بھلا کب رکنے والا تھا:

"میں اپنے یا اپنے بیٹے کے لیے کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ یہ میرے سب سے چھوٹے بھائی کا معاملہ ہے۔ کیسے افسوس کی بات کہ اب وہ سن شعور کو پہنچا مگر اب تک نرا جاہل ہے۔ اس کی تھوڑی بہت تعلیم لازمی ہے۔"

وانگ لنگ بھوچکا رہ گیا کیونکہ یہ مشورہ نرالا تھا۔ مدتوں پہلے وہ چھوٹے بیٹے کے مستقبل کا فیصلہ کر چکا تھا، چنانچہ جواب دیا:

"اس گھر میں الف بے کی تختیوں کی مزید ضرورت نہیں۔ آپ دو عالم کیا کم ہیں جو اس بیچارے پر بھی یہ مصیبت لادی جائے۔ میرے بعد وہ زمین کا انتظام کرے گا۔

"جی ہاں، اسی وجہ سے وہ رات رات بھر روتا ہے، اور سوکھ کر کانٹا ہوا جاتا ہے!"

وانگ لنگ نے چھوٹے بیٹے سے اس کی زندگی کے متعلق رائے نہ لی تھی۔ خود ہی اس نے طے کر لیا تھا کہ تینوں میں سے ایک کو کاشتکاری کرنا چاہیے۔ بڑے بیٹے کی بات سے اسے سخت صدمہ ہوا اور وہ خاموش ہو گیا۔ گڑگڑی اٹھا کر وہ چھوٹے بیٹے کے متعلق غور و خوض کرنے لگا۔ وہ اپنے دونوں بھائیوں سے مختلف تھا اور اپنی ماں کی طرح کم سخن تھا۔ اور کیونکہ وہ خاموش پسند تھا اس لیے کوئی اسے خاطر میں نہ لاتا تھا۔

وانگ لنگ نے شبہہ کے انداز میں پوچھا:

"کیا تم نے خود اسے یہ کہتے سنا ہے؟"

"آپ اس سے خود پوچھ دیکھیے۔"

وانگ لنگ تکرار کے انداز میں، گلا پھاڑ کر یک بیک بول اٹھا:

"آخر ایک نہ ایک لڑکے کو زمین کی نگہداشت کرنا ہی یا نہیں؟"

"ابّا جان، اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ آپ کو اپنی اولاد سے غلاموں کی سی خدمت لینا تو منظور نہیں؟ یہ مناسب بھی نہیں کیونکہ دنیا کہے گی کہ آپ کیسے سنگ دل ہیں، خود تو راجاؤں کی طرح رہتے ہیں لیکن بیٹے سے خدمت گاروں کا سا برتاؤ کرتے ہیں۔"

بڑے بیٹے کے اس قول نے جادو کا کام کیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ باپ کو دنیا کی رائے کا بڑا خیال رہتا تھا۔ اس لیے وہ بولا:

پہلے ہم اس پر ایک معلم تعینات کریں، بعد ازاں اسے دکن کے کسی اسکول میں داخل کرادیں۔ آپ کی مدد کے لیے میں موجود ہی ہوں؛ پھر آپ کا منجھلا بیٹا بھی کاروبار کر رہا ہے۔ میرے چھوٹے بھائی کو تعلیم کی نعمت سے محروم نہ رکھیے۔"

مجبوراً وانگ لنگ کو یہ کہتے ہی بنی:

"اسے یہاں بھیج دو۔"

تھوڑی دیر کے بعد سب سے چھوٹا بیٹا آکر باپ کے سامنے کھڑا ہوگیا اور وانگ لنگ نے اسے سر سے پانو تک دیکھا کہ اسے پرکھ سکے۔ وہ دراز قد اور نازک اندام تھا۔ ماں کی متانت اور کم سخنی کے علاوہ اس میں والدین کی کوئی چھب نہ آئی تھی۔ لیکن وہ اپنی ماں اور بھائی بہنوں سے زیادہ شکیل تھا ـــــ منجھلی بہن کو چھوڑ کر جو اب ہمیشہ کے لیے شوہر کے گھر چلی گئی تھی۔ اس کی خوب صورتی میں اگر کوئی داغ تھا تو یہ

اس کی گھنی بھنویں تھیں جو عمر کے لحاظ سے بہت ہی سیاہ اور گھنی تھیں اور اس کے زرد اور معصوم چہرے پر گراں گزرتی تھیں۔ اسے ناک بھوں چڑھانے کی عادت سی ہوگئی تھی اور ایسے موقع پر اس کے ماتھے پر ایک کالی لکیر سی بن جاتی تھی۔

لڑکے کو ایک نظر دیکھ کر وانگ لنگ نے پوچھا:

"تمھارا بڑا بھائی کہتا تھا کہ تمھیں حصول تعلیم کا شوق ہوگیا ہے۔"

لڑکے کی زبان سے ہاں کے سوا کوئی لفظ نہ نکلا، وانگ لنگ پائپ کی راکھ صاف کرکے اس میں تمباکو انگوٹھے سے بھرنے لگا۔

"تو اس کا یہ مطلب ہے کہ تم بھی کھیتی نہیں کرنا چاہتے۔ اتنی اولاد میں سے ایک بھی تیار نہیں کہ زمین پر کام کرے۔"

وانگ لنگ نے تلخی سے یہ باتیں کہیں مگر لڑکا چپ رہا۔ سفید سوتی لباس پہنے ہوئے وہ بت بنا بے حرکت کھڑا رہا۔ اس کی خاموشی پر وانگ لنگ سخت برہم ہوا اور بولا:

"آخر بولتے کیوں نہیں؟ کیا یہ سچ ہے کہ تم کاشت کاری سے جی چراتے ہو؟"

اس کے جواب میں بھی لڑکے کی زبان سے ایک ہی لفظ نکلا:

"جی ہاں۔"

وانگ لنگ نے سوچا کہ یہ لونڈے بڑھاپے میں بھی مجھے چین نہیں لینے دیتے۔ میرے لیے وبال جان بنے ہوئے ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے ساتھ کیا کروں۔ ان کی خود پسندی پر جھنجھلا کر وہ زور سے چلا پڑا:

"جو جی چاہے کرو لیکن میرے آگے سے منہ کالا کرو۔"

لڑکا تو چلتا ہوا مگر وانگ لنگ اکیلے بیٹھا سوچنے لگا کہ ان بیٹوں سے

تو دونوں لڑکیاں ہی اچھی ہیں۔ پگلی بیچاری کو روٹی کے ایک ٹکڑے اور گز بھر کپڑے کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ اور دوسری شادی کے بعد سسرال چلی گئی۔ اتنے میں دھندلکا ہوگیا اور وہ اندھیرے کے دامن میں چھپ گیا۔

اس کے باوجود جب غصّہ ٹھنڈا پڑجاتا تھا تو عادت کے مطابق وانگ لنگ لڑکوں کو اپنی مرضی پر چھوڑ دیتا تھا۔ بڑے لڑکے کو بلا کر کہا:

"چھوٹے کے لیے ایک معلّم تلاش کرو اور وہ جو چاہے کرنے دو مگر میری جان ضیق میں نہ ڈالو۔"

منجھلے لڑکے کو طلب کر کے کہا:

"کیونکہ تم میں سے کوئی زمین کی دیکھ ریکھ کے لیے تیار نہیں اس لیے آیندہ لگان وغیرہ کا حساب تمھارے ذمّے رہا۔ اناج کے وزن اور خرید فروخت کا انتظام بھی تم کروگے اور میرے گماشتے کی خدمت انجام دیا کروگے۔"

اس سے اُسے دلی مسرت ہوئی کیونکہ آمدنی اب اس کے ہاتھ میں آئے گی اور وہ اس کا حساب رکھ سکے گا۔ اگر گھر میں زیادہ خرچ ہوا تو وہ باپ سے شکایت کرسکے گا۔

وانگ لنگ کو سب سے زیادہ حیرت اسی بیٹے پر ہوتی تھی کیونکہ شادی کے دن بھی شراب و کباب پر جو کچھ خرچ ہوا اس کے ایک ایک پیسے کا حساب وہ کرتا رہا۔ میز لگانے میں بھی اس نے بڑی ہوشیاری دکھائی۔ کھانے کا بہترین سامان اپنے شہری دوستوں کے لیے مخصوص رکھا جو ان لوازمات کی صحیح قدر و قیمت کرسکتے تھے۔ لیکن دیہاتی مہمانوں

کے لیے آنگن میں میزیں چنی گئیں اور انھیں ذرا گھٹیا قسم کی شراب اور گوشت دیا گیا۔ کیونکہ وہ روکھا سوکھا کھانے کے عادی تھے اور ان کی تواضع کے لیے یہی بہت تھا کہ کھانا کچھ ہی بہتر مل جائے۔

شادی کی نیگ اور تحفے تحایف کا تخمینہ وہ لگاتا رہا اور نوکر چاکروں کو یونہی ٹرخا دیا۔ کویل کو جب اس نے دو رُپے تھمائے تو وہ جھلّا اٹھی اور سب کے آگے تڑسے منہ پر کہہ دیا:

"بڑے لوگ ایسے مکھی چوس نہیں ہوتے۔ آج سب پر کھل گیا کہ اس حویلی کی تم ہتک کر رہے ہو۔"

یہ سن کر بڑا لڑکا شرم سے کٹ مرا۔ کویل کی زبان درازی سے وہ یوں بھی خائف رہتا تھا، چپکے سے اسے کچھ دے کر ٹالا مگر اپنے بھائی پر اسے بڑا غصّہ آیا۔ عین شادی کے روز بھی جب مہمان قطار در قطار بیٹھے ہوئے تھے اور دلھن کی ڈولی گھر آ رہی تھی دونوں بھائیوں میں چخ ہوتی رہی۔

بڑے بھائی نے اپنے خاص دوستوں کو مدعو نہ کیا کیونکہ میاں نوشہ کی کنجوسی اور دلھن کے دہقانی ہونے کی وجہ سے انھیں سخت ندامت ہو رہی تھی۔ چنانچہ وہ حقارت سے الگ تھلگ رہا اور کہنے لگا کہ "میرا بھائی چاہتا تو ابّا جان کی دعا سے جواہرات کے کٹورے سے پانی پیتا لیکن اس کی قسمت میں مٹّی کا آب خورہ ہی لکھا تھا۔"

جب بنا بنی کا جوڑا سلام کرنے سامنے آیا تو اس نے نہایت بے التفاتی اور لاپروائی سے سر کو جنبش دی۔ اس کی بیوی بھی اکڑی بیٹھی رہی اور اس کے نک چڑھے پن کا یہ حال تھا کہ ضرورت سے

ایک تل زیادہ جھک کر نہ دیا۔

اس حویلی میں جتنے لوگ بھی رہتے تھے ان میں سے کسی کی زندگی اتنی پرسکون اور آسودہ نہ تھی جتنی وانگ لنگ کے ننھے پوتے کی، محل کے کمرے سے لگا ہوا اس کا کمرا تھا۔ وہاں جب وہ اپنی شاندار مسہری کے اندر نیند سے بیدار ہوتا تو کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا کہ وہ اسی مٹیا محل کی تنگ و تاریک کوٹھری میں پڑا ہوا ہے۔ جہاں پینے کو ٹھنڈی چائے بھی مل جاتی تو غنیمت تھا اور مسہری کے نام پر اچھی لکڑی کا تختہ بھی نایاب تھا اور دروازے سے قدم نکالیے تو کھیت کے اندر پڑتا تھا۔

اس کے لڑکوں کی پوچھو تو ان کی پراگندگی کسی طرح ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ بڑے لڑکے کو ہمیشہ یہ کھٹکا رہتا کہ کفایت شعاری کی وجہ سے کہیں دنیا ان کے طرزِ معاشرت پر نام نہ دھرے، کہیں کسی شہری کے آگے گھر کا کوئی دیہاتی نکل نہ آئے جس سے خاندان کی ناک کٹ جائے۔ ادھر منجھلے لڑکے کو یہ فکر تھی کہ فضول خرچی کی وجہ سے ساری دولت لٹی جا رہی ہے سب سے چھوٹا بیٹا اس ادھیڑبُن میں تھا کہ گزرے ہوئے بیکار وقت کی تلافی کس طرح ہو۔

ان سب میں فقط بڑے لڑکے کا بچہ تھا جو ہر طرف کلیلیں کرتا پھرتا تھا اور اپنی زندگی سے مطمئن تھا۔ بچے کو نہ اس کی خبر تھی کہ یہ گھر بڑا ہے یا چھوٹا، وہ بس اتنا جانتا تھا کہ یہ اس کا گھر ہے جہاں اس کے والدین اور دادا رہتے ہیں اور وہاں کا ہر آدمی گویا اس کا خدمت گار ہے۔ وہ وانگ لنگ کی آنکھوں کا نور تھا اور اس کی اچھل کود کے تماشے سے وہ کبھی نہ تھکتا تھا، اُسے دیکھ دیکھ کر ہنسا کرتا اور جب وہ گرتا تو جھٹ

اٹھا لیتا تھا۔ اسے اپنے باپ کی یاد آئی، اور بچے کو ایک کمر بند سے باندھ کر چلتا ہوا ، تاکہ وہ گر نہ پڑے ، اسے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ وہ ایک دالان سے دوسرے دالان میں جاتے اور بچہ حوض میں تڑپتی ہوئی مچھلیوں کو دیکھ کر غوں غاں کیا کرتا تھا۔ کبھی وہ کسی پھول کی پنکھڑی نوچ لیتا۔ غرض کہ ہر حال میں وہ مگن رہتا تھا اور یہ دیکھ کر وانگ لنگ کو بھی اطمینانِ قلب حاصل ہوتا تھا۔

یہی ایک بچہ نہ تھا۔ اس کی وفادار بہو ہر سال باقاعدگی کے ساتھ حاملہ ہوتی اور یکے بعد دیگرے بچے جنتی جاتی تھی اور ہر بچے کو ایک غلام خدمت کے لیے ملتا تھا۔ وانگ لنگ دیکھتا تھا کہ ہر سال ایک نہ ایک بچہ اور اس کے ساتھ ایک غلام کا اضافہ ہوگیا۔ اس لیے جب کوئی کہتا کہ "بڑے صاحب زادے کی ڈیوڑھی کی آبادی ایک عدد بڑھ گئی"۔ تو وانگ لنگ ہنس کر جواب دیتا کہ

"خدا کا شکر ہے۔ جب تک ہماری زمین زرخیز ہے گھر میں اناج کی کمی نہیں۔"

یہ سن کر اسے خوشی ہوئی کہ منجھلی بہو کے بھی اپنے وقت پر بچہ ہوا۔ اپنی نند کے احترام میں اسکی پہلی اولاد لڑکی تھی۔ پانچ سال کے اندر چار پوتے اور تین پوتیاں ہوئیں اور ساری حویلی ان کے ہنسنے رونے کی آوازوں سے گونج اٹھی۔

اگر آدمی بہت کم عمر یا بالکل بوڑھا نہ ہو تو اس کی عمر میں پانچ سال کی مدت کچھ نہیں۔ اس دوران میں اگر ایک نئی پود پروان چڑھنے لگی تو اس کے خیال باز چچا کا انتقال بھی ہوگیا۔ وانگ لنگ کو

اس سے اس کے سوا کوئی دلچسپی نہ رہی تھی کہ کھانا کپڑا اور افیوں اسے مل جایا کرے۔

پانچویں سال ایسی کڑاکے کی سردی پڑی کہ تیس برس سے نہیں پڑی تھی۔ اس کی وجہ سے وانگ لنگ کی زندگی میں پہلی مرتبہ شہر پناہ کی خندق جم گئی اور لوگ اس پر مزے سے چلنے پھرنے لگے۔ شمال مشرق سے دن رات برفانی ہوائیں چلنے لگیں اور کوئی پوستیں یا گرم کپڑا اس کی شدّت سے آدمی کے جسم کو نہ بچا سکا۔ حویلی کے ہر کمرے میں آتش دان روشن ہو گئے، تاہم سردی کا یہ عالم تھا کہ آدمی کی سانس ہوا میں نظر آتی تھی۔

چچا اور چچی کا سارا گوشت تو دھنواں بن کر چلم کی نذر ہو ہی چکا تھا۔ وہ دن رات دو بھس بھری کھالوں کی طرح بستر میں پڑے رہتے تھے اور ان کا خون سرد ہو چکا تھا۔ جب وانگ لنگ نے سنا کہ چچا کے لیے پلنگ پر بیٹھنا بھی دوبھر ہو گیا ہے اور حرکت کرتے ہی خون تھوکنے لگتا ہے تو وہ اس کی مزاج پرسی کے لیے دوڑا مگر اب تو اس کی شمع زندگانی کے گل ہونے میں کچھ ہی لمحات رہ گئے تھے۔

یہ دیکھ کر وانگ لنگ دو چوبی تابوت خرید لایا جو اگر بہت اچھے نہ تھے تو بُرے بھی نہ تھے۔ تابوت چچا کے آگے لائے گئے۔ تاکہ انھیں دیکھ کر اسے کچھ سہارا بندھے کہ لاش کے لیے کوئی ٹھکانا تو ہو گیا۔ چچا کی کانپتی ہوئی آواز نے آہستہ سے کہا:

"تم نے وہ حقِ فرزندگی ادا کیا جس کی توقع میں اپنے سگے آوارہ گرد بیٹے سے بھی نہیں کر سکتا۔"

اور چچی نے جو اب بھی اپنے شوہر سے زیادہ مضبوط تھی، کہا:
"اگر اس بدنصیب کی واپسی سے پہلے ہی میں مرجاؤں تو تمھیں یہ وصیت کیے جاتی ہوں کہ اس کے لیے ایک اچھی سی بیوی تلاش کر دینا جو ہماری ارواح کے ثواب کے لیے اولاد پیدا کرے۔ وانگ لنگ نے اس کا وعدہ کیا۔
اسے معلوم بھی نہ ہوا کہ کس گھڑی چچا کی جان نکل گئی۔ ایک شام کو جب نوکرانی یخنی لیے ہوئے گئی تو اسے مردہ پایا۔ جس دن وہ دفن کیا گیا بلا کی سردی تھی اور برف کے تودے آسمان سے نیچے گر رہے تھے۔ وانگ لنگ نے خاندانی قبرستان میں اسے دفنایا اور باپ کے پاس ذرا نیچے لیکن اپنے مقبرے سے کچھ بلندی پر اسے جگہ دی۔
پھر وانگ لنگ نے سارے کنبے کو ماتم منانے کا حکم دیا۔ اور سال بھر وہ سب ماتمی لباس پہنے رہے — اس وجہ سے نہیں کہ انھیں اس بڈھے نے مرنے کا دل سے صدمہ تھا کیونکہ وہ تو ساری عمر ان کے لیے عذاب جان بنا رہا بلکہ محض اس لیے کہ بڑے گھرانوں کا یہی دستور تھا کہ کسی بھی رشتے دار کا انتقال ہو سوگ منایا جائے۔
چچی کو وہ حویلی میں لے آیا تاکہ وہ اکیلی نہ رہے اور ایک الگ تھلگ کوٹھری اس کے لیے خالی کرا دی۔ کویل کو حکم دیا کہ اس پر ایک باندی تعینات کرے۔ بڑھیا دن رات پلنگ پر افیون پیتی اور اونگھتی رہتی تھی، اور پلنگ کے قریب ہی تابوت رکھ دیا گیا تھا کہ اس کی روح کو تسکین ہو۔
وانگ لنگ کو یہ سوچ کر کبھی کبھی سخت حیرت ہوتی تھی کہ جب یہ دیہاتی عورت موٹی تازی اور ہڑدنگی تھی تو اس کے سائے سے بھی گھبراتا تھا لیکن اب وہ اسی حویلی کی بڑی بیگم کی طرح مردار اور جان ہار ہو کر ایک کونے میں پڑی اپنی آخری گھڑیاں گن رہی تھی۔

باب ۳۱

وانگ لنگ لڑائی بھڑائی کا ذکر تو خیر بچپن سے ہی سنتا آرہا تھا مگر جوانی میں اس دکنی شہر کے قیام کے دوران کے سوا اور کبھی اس کی جھلک قریب سے دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ جنگ کے بادل اس سے قریب تر نہ آنے پائے تھے حالانکہ ہمیشہ سے وہ سنتا آیا تھا کہ لڑائی اب پچھم میں ہو رہی ہے یا لڑائی اب پورب میں ہو رہی ہے۔

جنگ کا وجود اس کے لیے اتنا ہی اٹل تھا جتنا زمین یا آسمان کا، اور اسے مطلق نہ معلوم تھا کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ آئے دن وہ لوگوں کو یہ کہتے سنتا تھا کہ ہم تو فوج میں بھرتی ہونے جا رہے ہیں۔ یہ وہ اس وقت کہتے جب فاقوں کی نوبت آجاتی تھی اور گدائی پر سپہ گری کو ترجیح دیتے تھے۔ کبھی کبھی اس کے چچا زاد بھائی کی طرح لوگ گھر کی زندگی سے بیزار ہو کر لام پر چلے جاتے تھے۔ بہر حال یہ مصیبت اب تک گھر سے کالے کوسوں دور رہتی آئی تھی۔ مگر اب یک بیک کسی بھونچال یا طوفان کی طرح یہ بلائے ناگہانی سر پر آن موجود ہوئی۔

اس کی سب سے پہلی اطلاع اسے اپنے منجھلے بیٹے سے ملی۔ ایک روز دوپہر کا کھانا کھانے جب وہ بازار سے گھر آیا تو باپ سے کہنے لگا:

"اناج کا بھاؤ یک بیک چڑھ گیا ہے کیونکہ یہاں سے جنوب کی سمت لڑائی چھڑ گئی ہے اور اس کی لپٹ روز بروز ہمارے قریب آتی

جائے گی۔ ہمیں اپنا گودام ابھی خالی نہ کرنا چاہیے کیونکہ فوجیں جس قدر ہمارے پاس آتی جائیں گی، اناج کا بازار اتنا ہی تیز ہوتا جائے گا۔ پھر ہمیں اور بھی اچھے دام مل سکیں گے۔"

وانگ لنگ کھاتے کھاتے یہ باتیں سنتا گیا اور بولا:

"لڑائی بھی کیسی عجیب چیز ہوتی ہوگی۔ ہمیشہ سے اس کا ذکر سنتا رہا ہوں مگر اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا اتفاق کبھی نہ ہوا۔ اسے دیکھ کر مجھے عین خوشی ہوگی۔"

یک بیک اسے یاد آیا کہ کسی زمانے میں جنگ کے نام سے اس کی روح لرز جاتی تھی کیونکہ اسے گرفتاری کا ڈر تھا۔ لیکن اب وہ ضعیف اور نکما ہوگیا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ امیر تھا اور امیروں کو کوئی خطرہ چھو نہیں سکتا۔ اس لیے اس معاملے کو اس نے مذاق میں اڑا دیا اور خفیف سے تجسس کے علاوہ اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ جواب میں بیٹے سے فقط اتنا کہا:

"اناج کو تم جس طرح چاہو بیچو، یہ تمھارا ذمہ ہے۔"

کبھی پوتے پوتیوں سے کھیل کر اور کبھی سو کر یا تمباکو پی کر وہ وقت گزارنے لگا۔ گاہے گاہے وہ دیوانی بیٹی کو بھی دیکھ آتا تھا جو ڈیوڑھی کے ایک کونے میں پڑی رہتی تھی۔

آغاز گرما کے ایک دن شمال مشرق سے انسانوں کا ایک گروہ یک بیک ٹڈی دل کی طرح نمودار ہوا۔ صبح کا سماں تھا، ہر طرف دھوپ کا اجالا پھیلا ہوا تھا اور وانگ لنگ کا ایک پوتا کسی نوکر کے ساتھ دروازے پر کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے وردی پوش آدمیوں کی

لا تنا ہی، قطار دیکھی تو دادا کے پاس یہ شور مچاتے ہوئے دوڑا:

"دادا جان، دیکھیے، یہ کون لوگ آرہے ہیں۔"

وانگ لنگ اس کی خوشنودی کے لیے دروازے تک چلا گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ سپاہی جوق درجوق شہر کے اندر گھسے آتے ہیں۔ وہ اس باقاعدگی اور تزک و احتشام کے ساتھ رائٹ لیفٹ کرتے جا رہے تھے کہ دم بھر کے لیے گویا ہوا رک گئی اور دھوپ بند ہوگئی۔ جب وانگ لنگ نے غور سے ان کا جایزہ لیا تو ہر سپاہی کے ہاتھ میں ایک حربہ نظر آیا جس کے سرے پر چھری چمک رہی تھی۔ ان میں سے ہر ایک خونخوار، غضبناک اور بے رحم معلوم ہوتا تھا۔ ان میں کچھ کچّی عمر کے لڑکے تھے لیکن ان کا بھی یہی وطیرہ تھا۔ ان کے چہروں کو دیکھتے ہی وانگ لنگ نے بچّے کو سینے سے چمٹا لیا اور کہا:

"آؤ، ہم اندر سے دروازہ بند کرلیں۔ بیٹا یہ شریف آدمی نہیں معلوم ہوتے!"

لیکن قبل اس کے کہ وہ پیٹھ پھیرے کسی سپاہی کی نظر اس پر پڑی اور وہ چلاّیا:

"میرے باپ کے بھتیجے ایک نظر ادھر بھی!"

یہ سن کر وانگ لنگ نے گردن جو موڑی تو سامنے اس کا چچا زاد بھائی موجود تھا۔ اس کے جسم پر بھی دوسروں کی طرح وردی تھی اور وہ گرد و غبار میں سنا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ دوسروں سے بھی زیادہ غضبناک اور وحشیانہ معلوم ہو رہا تھا۔ ایک کرخت قہقہہ لگا اس نے اپنے دوستوں سے کہا:

"یارو، ہم یہیں پڑاؤ ڈالیں کیونکہ یہ حضرت میرے رشتے دار بھی ہیں اور مالدار بھی !"

قبل اس کے کہ حیران و پریشان وانگ لنگ حواس سنبھالے، یہ گروہ اس کی آنکھوں دیکھتے دروازے کے اندر پل پڑا اور وہ اس کے بیچ میں گم سم کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ سیلاب کے پانی کی طرح وہ حویلی کے ہر حصے میں گھس گئے اور جدھر دیکھو سپاہی ہی سپاہی موجود تھے۔ ان میں سے کچھ تو فرش پر دراز ہو گئے، کچھ حوضوں کو گندہ کرنے لگے۔ باقی لوگ یا تو میزوں پر چھرے کھڑکانے لگے اور یا یہاں وہاں تھوکتے ہوئے گالی گلوچ کرنے لگے۔

اس واقعے سے وانگ لنگ تو سٹی بھول گیا اور بچے کو لے کر اپنے بڑے بیٹے کی تلاش میں بھاگا۔ اس کے کمرے میں جا کر دیکھا تو وہ کسی کتاب کے مطالعے میں مشغول تھا۔ وانگ لنگ نے ہانپتے ہوئے جو کچھ کہا اسے سنتے ہی اس کے منہ سے آہ نکل گئی اور وہ باہر بھاگا چچازاد بھائی سے مڈبھیڑ ہونے پر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اسے سلام کرے یا بددعا دے۔ چاروں طرف نگاہ دوڑا کر وہ کراہ اٹھا اور باپ سے جو پیچھے پیچھے آ رہا تھا، بولا:

"ہر آدمی سنگین لیے ہوئے ہے !"

اب خوش سلوکی کے سوا چارہ کار کیا تھا:

"بھائی جان، جم جم آئیے، یہ واپسی مبارک ہو!"

اس ہٹ دنگے نے زہر خند کے ساتھ جواب دیا:

"میرے ساتھ چند مہمان بھی ہیں !"

"آپ کے مہمان ہمارے سر آنکھوں پر! روانگی سے پہلے یہ لوگ کچھ کھا پی تو لیں، میں جھٹ پٹ انتظام کیے دیتا ہوں۔"

"ضرور، ضرور۔ لیکن اس کے بعد زیادہ جلدی نہ کرنا کیونکہ جب تک ہماری فوج کو دوسرا حکم نہ ملے ہم یہیں قیام کریں گے۔ حکم خدا جانے دس دن میں آئے، یا چار پانچ ہفتے میں، یا سال دو سال میں۔"

اس کے بعد تو باپ بیٹے کے لیے اپنی بیزاری کو پوشیدہ رکھنا دشوار ہو گیا۔ لیکن زبان بندی ہی مناسب تھی کیونکہ ہر طرف تلواریں چمک رہی تھیں۔ اس لیے کسی نہ کسی طرح ہونٹوں پر مسکراہٹ لا کر وہ بلبلائے:

"زہے قسمت، زہے قسمت!"

بڑے لڑکے نے بہانہ کیا کہ کھانے کا بندوبست کرنا ہے اور باپ کا ہاتھ پکڑ کر وہ اندر بھاگ آیا اور دروازہ بند کر لیا۔ پھر دونوں ایک دوسرے کو ہراس کے عالم میں تکنے لگے اور کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔

اتنے میں منجھلا بیٹا دوڑتا ہوا آیا اور دروازے پر دستک دی۔ اندر وہ اس ہڑبڑاہٹ میں داخل ہوا کہ گرتے گرتے بچا اور بمشکل تمام بولا:

"ہر چھوٹے بڑے مکان میں سپاہی گھس آئے ہیں۔ میں بھاگا بھاگا آپ لوگوں کو جتانے آیا ہوں کہ ان کی مرضی کے خلاف ورزی نہ ہو۔ یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میری دکان کا ایک کارندہ جو میرا واقف کار تھا، سپاہیوں کی چڑھائی کی خبر سن کر گھر کی خبر لینے گیا۔ وہاں اپنی بیمار بیوی کے کمرے میں فوجیوں کو دیکھ کر وہ جیسے ہی حرفِ شکایت زبان پر لایا کسی نے سنگین اس کے جسم میں بھونک دی اور وہ اس صفائی سے آر پار نکل گئی گویا وہ موم کا بنا ہوا تھا۔ یہ کمبخت جو کچھ مانگیں بے چون و چرا

انھیں دے دلا کر پیچھا چھڑائیے، ساتھ ہی ساتھ دعا کیجیے کہ جنگ کی بلا یہاں سے جلد ٹل جائے۔"

وہ تینوں تردد سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ انھیں اپنی عورتوں اور ان ہٹے کٹے بھوکے مردوں کا خیال آیا۔ اپنی نیک سیرت قبول صورت بیوی کی فکر بڑے بیٹے کو سب سے زیادہ تھی اور وہ بولا:

"سب سے اندر کی ڈیوڑھی میں ہمیں عورتوں کو جمع کرنا چاہیے اور دن رات وہاں پہرا دینا چاہیے۔ سامنے کے دروازے بند لیکن چور دروازہ کھلا رکھنا چاہیے۔"

اس رائے پر انھوں نے عمل کیا۔ جہاں کمل اپنی باندیوں اور کویل کے ساتھ رہتی تھی، سب عورتیں اور بچے یکجا ہو گئے۔ وہاں لشتم پشتم وہ کسی طرح وقت گزارنے لگے۔ وانگ لنگ بڑے بیٹے کے ساتھ دن رات چوکسی سے پہرا دینے لگا اور منجھلے لڑکے کو بھی جب وقت ملتا آ جاتا تھا۔

لیکن چچا زاد بھائی کو کیا کیجیے۔ قانوناً ہر رشتے دار کو زنانے میں داخل ہونے کی اجازت تھی۔ دروازے پر دستک دے کر وہ بڑی شان سے اندر گھس آتا اور ہاتھ میں چمکتا ہوا خنجر لیے ہوئے یہاں وہاں گھومتا پھرتا تھا۔ بڑا لڑکا نفرت سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے رہتا لیکن خنجر پر نگاہ پڑتے ہی اس کی گھگھی بندھ جاتی تھی۔ چچا زاد بھائی کی آنکھیں ناچتی رہتی تھیں اور ہر عورت کا جایزہ وہ غور سے لیا کرتا تھا۔

بڑی بہو کو دیکھ کر وہ اپنے بیہودہ انداز میں ہنسا اور بولا:

" بھائی ، یہ پری چھم تم کہاں سے اُچک لائے !۔ یہ تو شہر کی رہنے والی معلوم ہوتی ہے اور اس کے پاؤں ہیں یا کنول کے پھول!" منجھلی بہو پر اس نے یہ جملہ کسا : " بھئی، یہ تو دیہات کی لال مولی لگتی ہے —— عمدہ سرخ گوشت کا پسندہ !"

یہ بات اس نے اس لیے کہی کہ یہ عورت گول گپا اور سرخ و سفید ہوتے ہوئے قابل غور تھی ۔ جب یہ شہدا بڑی بہو پر نظر ڈالتا تو وہ شرما کر منہ پھیر لیتی تھی ، لیکن منجھلی کی توانگی اور خوش مزاجی اسے مسکرانے اور مٹک کر یہ کہنے کو مجبور کرتی کہ " اوئی ، کیا کچھ مردوؤں کو تیکھی مولی یا تازہ گوشت پسند نہیں ؟ "

" کسی کو ہو نہ ہو ، مجھے تو دل و جان سے پسند ہے !" جھٹ سے یہ کہہ کر اس نے اس عورت کے ہاتھ کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا ۔

بڑا لڑکا انگاروں پر لوٹ رہا تھا کیونکہ ان دونوں میں باہمی گفتگو ناواجب اور شرمناک بات چیت ہو رہی تھی ۔ کن انکھیوں سے اپنی بیوی کو دیکھ کر وہ اپنی بھاوج اور بھائی کی اس حرکت پر شرمایا کیونکہ اس کی تربیت شریفانہ طریقے سے ہوئی تھی ۔ بیوی کے آگے اس کی اس جھجھک کو بھانپ کر چچا زاد بھائی نے شرارت سے کہا :

" ایسی بدمزہ اور سرد مچھلی کی بجائے مجھے روکھا سوکھا گوشت ہزار درجہ پسند ہے ۔"

بڑی بہو یہ سن کر بڑی شان سے اٹھی اور ایک کمرے کے اندر جا بیٹھی ۔ وہ بھلا مانس بھونڈے پن سے ہنس پڑا اور کسان کو جو گڑگڑی پی رہی تھی مخاطب کر کے کہا :

" بڑی بیگم، یہ شہر والیاں بڑی نک چڑھی ہوتی ہیں، ہی یا نہیں؟"
پھر کمل کو غور سے دیکھ کر کہا: " آہا یہ تو بڑی بیگم ہیں۔ اگر مجھے وانگ لنگ کی خوشحالی کا علم نہ ہوتا تو تمھیں کیونکر پہچان سکتا۔ تم پر چربی کا چبوترا سا بن گیا ہی جو اس بات کا ثبوت ہی کہ تم نے خوب مرغن پکوان اڑائے ہیں! صرف امیروں کی بیویاں ہی ایسی توپیں بن سکتی ہیں!"

کمل خوشی سے کھل اٹھی کہ اس نے بڑی بیگم کہہ کر مخاطب کیا۔ صرف بڑے گھروں کی بیویوں کو ہی یہ لقب ملتا تھا۔ وہ اپنے بانس کے سے گل پھڑے سے کھی کھی کرکے ہنسنے لگی اور پایپ سے راکھ جھاڑ کر اسے ایک باندی کو دوبارہ بھرنے کے لیے دے دیا اور کویل کی طرف مڑکر بولی:

" یہ لہڑونگا تو خوش مزاج معلوم ہوتا ہی۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے بڑے نخرے سے ان ذات شریف کو آڑی چتونوں سے دیکھا۔ لیکن اب اس کی آنکھیں پہلی کی طرح بڑی بڑی نہ رہی تھیں اور اس کے پھولے ہوئے گالوں میں دھنس گئی تھیں، اس لیے ان چتونوں میں وہ بانک پن بھی نہ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا اور کہنے لگا:

" ارے، اس بڑھیا کتیا کے چونچلے تو دیکھو!"

بڑا لڑکا برابر غصّے سے کانپتے ہوئے چپ چاپ یہ ماجرا دیکھ رہا تھا۔

اس چہل کے بعد وہ اپنی ماں کی مزاج پرسی کے لیے گیا اور اس کا کمرا دکھانے کے لیے وانگ لنگ ساتھ ہو لیا۔ وہ اپنے پلنگ پر اس طریقے سے سو رہی تھی کہ بیٹا بھی نہ جگا سکے۔ لیکن سرھانے فرش پر بندوق کا دستہ اس زور سے پٹکا کہ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اسے یوں گھورتے

ہوئے گویا خواب دیکھ رہی ہو۔ لڑکے نے چڑچڑی آواز میں کہا:
"بیٹے کی آؤ بھگت آپ اسی طریقہ سے کرتی ہیں کہ پانو پسار کر پڑ گئیں۔"
پلنگ سے اٹھ کر اس پر نگاہ گاڑے ہوئے بڑھیا حیرت سے بولی:
"میرا بیٹا . . . . . میرا لختِ جگر ــــ" دیر تک اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کے بعد بھی اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ بیٹے کی کیا خاطر کرے۔ پھر افیون کی ڈبیا اس کی طرف یوں بڑھائی گویا اس سے بڑی نعمت ہو ہی نہیں سکتی اپنی باندی کو اس نے حکم دیا:
"صاحب زادے کے لیے ایک چسکی تیار کرو!"
بڑھیا کو گھور کر لڑکے نے کہا:
"نہیں، میں افیون کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔"
وانگ لنگ پلنگ کے قریب ہی کھڑا تھا۔ اچانک وہ ڈرا کہ کہیں سپاہی پوچھ نہ بیٹھے:
"تم نے میری ماں کا یہ حال کر دیا کہ وہ زرد اور بیجان ہو گئی ہے اور اس کے جسم پر گوشت کا نام بھی نہیں۔"
اس لیے وہ جلدی سے بول اٹھا:
"کاش چچی جان زیادہ افیون نہ پیتیں کیونکہ ہر روز کئی رُپی کا خرچ اسی مد میں لگا رکھا ہے۔ لیکن ان کی عمر ایسی نہیں کہ ہم ان کی مرضی کی خلاف ورزی کریں۔ اسی وجہ سے ان کا شوق حد سے تجاوز کر گیا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ٹھنڈی سانس لی اور سپاہی کو چور نگاہوں سے دیکھا۔ لیکن اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا، وہ اپنی ماں کے

حال زار کو دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ جب وہ از سرِ نو اونگھ کر پلنگ پر لیٹ گئی تو وہ بندوق کو لاٹھی کی طرح ٹیکتے ہوئے کھٹ پٹ کرتا باہر چلا آیا۔

وانگ لنگ اور اس کے بیٹے دوسرے لُچّے لفنگوں سے اتنے بدظن اور خائف نہ تھے جتنے کہ اس رشتے دار سے۔ حالانکہ ان فوجیوں نے ایک طوفانِ بدتمیزی برپا کر رکھا تھا۔ کبھی وہ پیڑوں کو نوچتے اور کبھی آڑو اور بادام کے پودوں کو خوامخواہ اکھاڑ ڈالتے تھے۔ کبھی وہ اپنے بھاری بھرکم جوتوں سے کرسیوں کے نظر افروز نقش و نگار کو کچل ڈالتے۔ حوضوں میں موتنے سے بھی وہ باز نہ آئے جس کی وجہ سے سنہری مچھلیاں مرکر اوپر تیرنے لگیں۔

لیکن ان سے زیادہ بدچلن وہ چچا زاد بھائی تھا جو پھرکی کی طرح ہرطرف گھومتا پھرتا تھا اور کبھی اِس باندی، کبھی اُس باندی کو آنکھ مارتا۔ اس کی دھما چوکڑی کے مارے وانگ لنگ اور اس کے بیٹوں کی آنکھیں بے خوابی کی وجہ سے سوج آئی تھیں۔ یہ دیکھ کر کویل نے مشورہ دیا۔

"بس ایک ہی راستہ ہے کہ جب تک وہ یہاں ہے اسے ایک باندی دے دی جائے ورنہ وہ ہر جائز ناجائز پر ہاتھ ڈالے گا۔"

وانگ لنگ کو یہ رائے جی جان سے بھائی کیونکہ اس ہنگامے میں اپنے گھر میں رہنا بھی اس کے لیے دشوار ہوگیا تھا۔ سو وہ جھٹ سے بولا:

"تمھیں بھی کیا دور کی سوجھی ہے!"

کویل کو اس نے حکم دیا کہ اس سے جا کر پوچھے کہ سب باندیوں کے معاینے کے بعد اس نے کس کا انتخاب کیا ہے۔

ارشاد کی تعمیل کے بعد کویل نے لوٹ کر یہ خبر سنائی:

"اس کی طبیعت تو اس ننھی مُنّی باندی پر آئی ہے جو بیگم کی خدمت میں رہتی ہے۔"

اس لونڈی کا نام تاشپاتی تھا اور وانگ لنگ نے قحط سالی میں اسے خریدا تھا جب وہ خستہ حال اور فاقہ زدہ تھی۔ اس کی نزاکت پر رحم کھا کر سب اس سے بھلا برتاؤ کرتے تھے۔ وہ کویل کے ہاتھ تلے کام کرتی تھی اور کمل کے چھوٹے موٹے کام مثلاً پایپ بھر دینا یا چائے بنا دینا—انجام دیتی تھی۔ وہیں چچازاد کی نظر اس بیچاری پر پڑ گئی تھی۔

جب باندی تاشپاتی کو کویل نے یہ اطلاع دی تو وہ کمل کے لیے چائے بنا رہی تھی۔ یہ سنتے ہی اس کے ہاتھ سے کیتلی گر کر چکنا چور ہو گئی اور چائے فرش پر بہ گئی اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ کمل کے آگے وہ گھٹنوں کے بل گر پڑی اور فرش پر سر پٹک کر بصد عجز گڑگڑانے لگی:

"میری مالکن — مجھے بچا لیجیے — اس سے میرے جسم کا ایک ایک رُواں خوف کھاتا ہے۔"

لیکن کمل کو اس کی یہ ادا ناپسند ہوئی وہ جھڑک کر بولی:

"آخر وہ مرد ہی تو ہے۔ اور سب مرد برابر ہیں کیونکہ عورت سے وہ ایک ہی حرکت کرتے ہیں۔ پھر اس ہائے پکار سے کیا حاصل؟" کویل کی طرف مڑ کر حکم دیا: "اس باندی کو اس شہدے کے حوالے کر آؤ۔"

لڑکی ہاتھ باندھ کر ایسی آہ و بکا کرنے لگی گویا خوف و ہراس سے اس کی جان نکل جائے گی۔ اس کا دھان پان بدن وحشت کے مارے تھرتھرا رہا تھا اور اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں التجا کے لیے کبھی اس کا

کبھی اس کا منہ تکنے لگتی تھیں۔

وانگ لنگ کے بیٹوں یا بہو کی مجال نہ تھی کہ اپنی سوتیلی ماں کے خلاف زبان کھولیں۔ وہ چپ کھڑے تماشا دیکھتے رہے اور ان میں سب سے چھوٹا لڑکا بھی تھا۔ لڑکی پر اس کی نگاہیں گڑی ہوئی تھیں، اس کے ہاتھ سینے پر بندھے ہوئے تھے اور بھنویں تنی ہوئی تھیں۔ اس کی زبان بھی بند رہی۔ باندی کی ہچکیوں اور فریاد کے سوا کوئی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔

لیکن وانگ لنگ کا کلیجہ مسوس سا گیا اور وہ حالت پس و پیش میں باندی کو دیکھنے لگا کیونکہ اس نے نرم دل پایا تھا۔ وہ یہ بھی نہ چاہتا تھا کہ کمل کو ناراض کرے۔ جیسے ہی باندی نے اس کے دل کی بات اس کے چہرے پر دیکھی وہ دوڑ کر اس کے قدموں پر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وانگ لنگ نے جب اس کے نحیف و نزار جسم کو دیکھا اور چچا زاد بھائی کا لحیم وشحیم بدن یاد آیا جو اب جوانی کے دور سے گزر چکا تھا تو اسے سخت کراہت ہوئی اس لیے اس نے دھیمی آواز میں کویل سے کہا: "اس باندی پر زبردستی کرنا ناروا ہے۔"

حالانکہ اس نے یہ الفاظ بڑی ملائیت سے کہے تھے مگر کمل تنک اٹھی:

"اسے میرے حکم کی تعمیل کرنی ہی ہوگی۔ پھر یہ بات کا بتنگڑ کیا بنا رکھا ہے جب کہ ہر عورت پر دیر سویر یہی مرحلہ گزرتا ہے!"

لیکن وانگ لنگ ایسا سرد مہر نہ تھا۔ اس نے کمل سے کہا:

"پہلے دیکھیں تو سہی کہ یہ معاملہ آسانی سے سلجھ سکتا ہے یا نہیں۔ اور تم جیسی کہو ویسی باندی خریدنے کو میں تیار ہوں۔"

کمل کو اچانک ایک بدیسی گھڑی اور زمرّد کی انگوٹھی کا خیال آیا جنھیں خریدنے کا ارادہ وہ عرصے سے کر رہی تھی، وہ چپ ہو گئی۔

وانگ لنگ نے کویل کو حکم دیا:

"میرے چچا زاد بھائی سے جا کر کہو کہ اس لونڈی کو ایک خطرناک مرض ہی۔ پھر بھی اگر وہ چاہے تو یہی بھیجی جا سکتی ہی۔ لیکن اگر وہ کہے تو ہم ایک دوسری کا انتظام کر سکتے ہیں جو حسین بھی ہی اور صحت مند بھی۔"

یہ کہہ کر اس نے باندیوں پر نگاہ ڈالی جو گھبرائے ہوئے وہیں کھڑی تھیں اور سب تو منہ پھیر کر ہنسنے لگیں گویا شرما گئیں۔ لیکن ایک جوان مسٹنڈی نے قہقہہ لگا کر کہا:

"اجی میں نے ان باتوں کا بہت چرچا سنا ہی اور جی چاہتا ہی کہ اس کا مزہ بھی چکھوں۔ اگر وہ مجھے پسند کرے تو مجھے بھی کوئی عذر نہیں کیونکہ وہ کچھ ایسا بدصورت بھی نہیں۔"

وانگ لنگ نے اطمینان کی سانس لے کر جواب دیا:

"تو پھر جا بھی، منہ کالا کر!"

کویل نے کہا:

"اری میرے ساتھ چلی آ۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ اس وقت جو بھی اس کے ہتّے چڑھے گا وہ اسے قبول کر لے گا۔"

پہلی باندی اب بھی وانگ کے آگے سر بہ سجدہ پڑی تھی۔ البتّہ اس کے آنسو تھم گئے تھے اور وہ ان باتوں کو غور سے سن رہی تھی۔ کمل جو اس سے اب بھی خفا تھی بے کچھ کہے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

وانگ لنگ نے آہستہ سے باندی کو اس کے پیروں پر کھڑا کیا۔ وہ نڈھال

ہوگئی تھی اور پیلی پڑگئی تھی - مگر اس کا بیضاوی چہرا کمال نزاکت کا آئینہ دار تھا اور دہانہ تنگ و سرخ تھا - وانگ لنگ نے مہربانی سے کہا:

"بٹیا، ایک دو روز اپنی مالکن کے قریب بھی نہ جانا تاوقتیکہ ان کا غصہ ٹھنڈا نہ پڑجائے - اور جب وہ لُچا آئے تو اس کے سامنے ہرگز نہ آنا ورنہ وہ پھر تیرا مطالبہ کرے گا۔"

باندی نے اپنے آقا کو پرشوق انداز میں دیکھا اور چپ چاپ چلی گئی۔

چچازاد بھائی ڈیڑھ ماہ تک وہیں رہا اور اس مسٹنڈی سے جی کھول کر عیش کرتا رہا حتیٰ کہ اسے حمل ٹھہر گیا اور وہ فخریہ اس کا اعلان کرنے لگی - اس کے بعد ہی کہیں اور لڑائی چھڑی اور یہ گروہ اس طرح غائب ہوگیا جیسے ہوا بھوسی کی ڈھیری کو اڑا لے جائے - ان کی تباہ کاری اور گندگی کے علاوہ ان کی یاد دلانے کو اور کچھ نہ رہا - وانگ لنگ کے بھائی نے کمر میں تلوار باندھی اور کندھے پر بندوق رکھ کے ان سب سے حقارت آمیز انداز میں بولا:

میرے بیٹے کو امانت سمجھ کے رکھنا - ہر مرد کا جگرا نہیں کہ جہاں بھی ماہ دو ماہ کے لیے پڑاؤ ڈالے اپنا بیج چھوڑ جائے - سپاہی کی زندگی کی ایک برکت یہ بھی ہے کہ بچّہ وہ پیدا کرتا ہے، پالتے دوسرے ہیں۔"

اس طرح ان سب کا مذاق اڑاتے ہوئے وہ اپنے دستے کے ساتھ دفان ہوا -



باب ۳۲

سپاہیوں کی روانگی کے بعد باپ بیٹوں نے پہلی مرتبہ یہ متفقہ فیصلہ کیا کہ اس نادرگردی کے آثار کو یک لخت مٹا دینا چاہیے۔ چنانچہ ایک بار پھر بڑھئیوں اور معماروں کو بلایا گیا۔ در و دالان کی صفائی اور ٹوٹی ہوئی کرسیوں کی مرمّت ہونے لگی۔ حوضوں کا گندا پانی نکال کر تازہ پانی بھرا گیا۔ بڑا لڑکا دوبارہ رنگ برنگی مچھلیاں لایا۔ پھولوں کے نئے پودے لگائے اور پیڑوں کی ٹوٹی ہوئی ڈالیوں کی کانٹ چھانٹ کی۔ سال بھر کے اندر حویلی میں وہی پرانی رونق آگئی۔ ہر لڑکا اپنی اپنی ڈیوڑھی میں رہنے لگا اور زندگی از سرِ نو پُر امن ہو گئی۔

چچا زاد بھائی کی داشتہ باندی کو حکم دیا کہ مرتے دم تک اپنی ساس کی خدمت میں رہے۔ وہ تو یونہی جان ہار رہی تھی۔ اسے کفنانے کا کام بھی اسی لونڈی کے سپرد کیا گیا۔ وانگ لنگ کو عین مسرت ہوئی کہ اس نے جو پلا جنا تھا وہ لڑکا نہیں لڑکی تھی۔ کیونکہ اگر یہ لڑکا ہوتا تو اس کے دماغ آسمان پر ہوتے اور وہ خاندان سے مساوی حقوق کا مطالبہ کرتا، لیکن لڑکی کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ باندی نے باندی پیدا کی اور اس کے مرتبے میں کوئی فرق نہ آیا۔

تاہم وانگ لنگ نے دوسروں کی طرح اس سے بھی انصاف کیا۔ اس سے کہا کہ ”بڑھیا کی موت کے بعد اس کا کمرا اور پلنگ تیرے استعمال میں رہے گا۔“ سچ تو یہ ہے کہ ساٹھ کمروں میں ایک کمرے کی کمی کیسے

اٹھ سکتی تھی ۔ لونڈی کو اس نے چند روپے بھی دیئے ۔ اس سلوک سے وہ مطمئن ہوئی ۔ بس اسے ایک چیز کا قلق تھا جس کا اس موقعے پر اس نے ذکر بھی کر دیا :

"میرے آقا ، یہ رقم آپ میرے جہیز کے لیے بچا رکھیے ۔ اگر آپ میری زندگی سدھارنا چاہتے ہیں تو کسی سیدھے سادے غریب آدمی سے میری شادی کرا دیجیے ۔ آپ کو ثواب ہو گا ۔ ایک مرد کے ساتھ رہ چکنے کے بعد پلنگ پر مجھے تن تنہا نیند نہیں آتی ۔"

وانگ لنگ نے فوراً وعدہ کر لیا اور اسی وقت اسے ایک بھولی ہوئی یاد آئی ۔ آج وہ اس باندی کا بیاہ کسی کسان سے رچانے کا ارادہ کر رہا تھا لیکن ایک دن وہ تھا جب وہ اسی حویلی میں ایک لونڈی سے شادی کرنے آیا تھا ۔ کتنی مدت ہو گئی کہ اس نے اولان کو یاد بھی نہ کیا تھا ۔ اب اس کی یاد آتے ہی وہ اُداس ہو گیا ۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مغموم ہوا کیونکہ اب یہ صدیوں پہلے کا واقعہ معلوم ہوتا تھا ۔ ہاں طبیعت پر پچھلی باتوں کے خیال سے بار سا ضرور آ گیا ۔ اس نے افسردہ آواز میں کہا :

"ان چنیا بیگم کے مرتے ہی میں تیرے لیے کوئی شوہر تلاش کر دوں گا اور اس میں زیادہ دیر نہ لگے گی ۔"

وانگ لنگ نے اپنا وعدہ پورا کیا ۔ ایک دن صبح اس باندی نے آ کر کہا :

"میرے مالک ، اب اپنا کہا کیجیے ۔ کیونکہ آپ کی چچی آج صبح مری ہوئی ملیں اور میں نے انھیں تابوت میں رکھ دیا ہے ۔"

وانگ لنگ سوچنے لگا کہ اپنے کارندوں میں سے کسے آمادہ کرے۔ اتنے میں اُسے اس ہکلے لونڈے کا خیال آیا جس کی بدولت چنگ کی جان گئی تھی اور جس کے دانت باہر نکلے ہوئے تھے۔ "یہ جرم دانستگی میں اس سے سرزد نہ ہوا تھا۔ اس میں کوئی ایسی خرابی بھی نہیں ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ مجھے اور کسی کا علم بھی نہیں۔"

اس لڑکے کی طلبی ہوئی۔ وہ اب بڑا ہو گیا تھا لیکن اب بھی لٹھ کا لٹھ تھا اور اس کے دانت اتنے ہی بڑے تھے۔ وانگ لنگ دیوان خانے کے چبوترے پر جا کر بیٹھا اور ان دونوں کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ اس عجیب و غریب نظارے سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے اپنے ہر لفظ کو تول تول کر وہ کہنے لگا:

"سنو جی، اگر پسند ہو تو یہ عورت تمھاری ہو سکتی ہے۔ میرے چچا کے بیٹے کے علاوہ کسی نے اب تک اسے ہاتھ نہیں لگایا۔"

مرد نے بصد شکر اسے قبول کیا کیونکہ عورت تندرست بھی تھی اور خوش مزاج بھی۔ علاوہ بریں اس جیسے غریب کو اس سے بہتر بیوی کہاں مل سکتی تھی۔

جب وانگ لنگ اس مسند سے نیچے اترا تو اسے محسوس ہوا کہ زندگی کے تمام ارمانوں کی تکمیل ہو چکی۔ اس نے جو کچھ تصور کیا تھا اس سے کہیں زیادہ دنیا نے اسے دیا اور یہ سمجھنا اس کے لیے ناممکن تھا کہ یہ سب کس طریقے سے حاصل ہوا۔ کہیں آج جا کر اس کے دل کو یقین آیا کہ اب اسے واقعتاً سکون میسر آئے گا اور وہ دھوپ میں جی بھر کر اینڈ سکے گا۔ دراصل یہ اس کے آرام کا

زمانہ تھا کیونکہ اس کی عمر پینسٹھ کے لگ بھگ ہوگئی تھی۔ اس کے پوتے بھی تیزی سے پروان چڑھ رہے تھے۔ ان میں سے تین اس کے بڑے لڑکے کے بیٹے تھے اور دو منجھلے کے۔ وانگ لنگ کا چھوٹا بیٹا بھی جلد بیاہ دیا جائے گا اور پھر اس کے تمام فرائض ختم ہو جائیں گے اور اسے کسی قسم کا تردد نہ رہے گا۔

لیکن وائے قسمت سکون پھر بھی نہ ملا۔ ان سپاہیوں کا دھاوا گویا شہد کی مکھیوں کا ہلّا تھا جو جانے کے بعد اپنے ڈنکوں کے نشان پیچھے چھوڑ جاتی ہیں۔ بڑی اور منجھلی بہوئیں جب تک ساتھ رہیں کسی نہ کسی طرح نباہ ہوتا رہا لیکن اب جدا ہوتے ہی وہ ایک دوسری سے انتہائی نفرت کرنے لگی تھیں۔ اس کا اظہار اُن چھوٹی موٹی لڑائیوں میں ہوتا تھا، جو ان عورتوں میں ہوتی رہتی ہیں جن کے بچّے ساتھ کھیلتے اور کتّے کے پلّوں کی طرح لڑتے رہتے ہیں۔ ہر ماں اپنے بچّے کے بچاؤ کے لیے دوڑتی تھی اور دوسرے بچّوں کی پٹائی کرتی تھی کیونکہ اس کی اولاد تو گویا کبھی غلطی کر ہی نہ سکتی تھی۔ اسی وجہ سے دونوں عورتوں میں تنا تنی رہتی تھی۔

لیکن ان کے جلاپے کا بُحران وہ تاریخی دن تھا جب بچا زاد بھائی نے شہری عورتوں کا مذاق اڑایا تھا اور دیہاتی حسن کی داد دی تھی۔ اپنی بھاوج کو حقارت سے دیکھ کر بڑی بہو اکڑتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ اور اس کے بعد اسے سنا کر ایک روز اپنے شوہر سے باآواز کہا تھا:

"گھر میں کسی ننگ حیا عورت کا وجود بھی کیا قیامت ہے کہ جب

غیر مرد اسے گوشت کا پسندا کہے تو وہ کھلے خزانے قہقہہ لگائے!"
منجھلی بہو بھی جلتے ہوئے طمنچے سے کیا کم تھی۔ تڑ سے جواب دیا:
"میری نند کا حسد دیکھو کہ کسی مرد نے ٹھنڈی مچھلی کہہ دیا تو کوئلوں پر لوٹنے لگی ہے!"

اس کے بعد دونوں کی نفرت غضب آلود چتونوں سے صاف ظاہر ہونے لگی۔ لیکن بڑی کو کیونکہ اپنی تربیت کا غرہ تھا، اس لیے وہ اس کے وجود سے بے اعتنائی برت کر اپنی حقارت کا ثبوت دیا کرتی تھی۔ البتہ جب اس کے بچے اپنی ڈیوڑھی سے باہر نکلتے تو وہ پکار کر کہتی:

"بدتمیز بچوں کے قریب بھی نہ پھٹکنا!"

یہ وہ اپنی بھاوج کے منہ پر کہہ دیتی تھی جو سامنے کی ڈیوڑھی پر اس وقت کھڑی ہوتی تھی۔ پھر وہ بھی بپھر کر اپنے بچوں کو تلقین کرتی تھی:

"سنپولوں کے ساتھ نہ کھیلنا ورنہ تمھیں کاٹ کھائیں گے!"

قصہ مختصر یہ کہ دونوں عورتوں کی دشمنی بڑھتی گئی۔ دونوں بھائیوں کی ناچاقی نے آگ پر گھی کا کام کیا۔ بڑے بھائی کو یہ ڈر رہتا کہ بیوی جو زیادہ اعلیٰ خاندان اور شہر کی تربیت یافتہ تھی میرے خاندان کو حقیر نہ سمجھنے لگے۔ چھوٹے بھائی کو یہ کھٹکا کہ بڑے کی فضول خرچی جایداد کے بٹوارے سے پہلے اس کا صفایا نہ کر دے۔ بڑے بھائی کو شرم آتی تھی کہ گھر میں جو کچھ خرچ ہوتا اور باپ کے پاس جو جمع پونجی تھی اس کی دمڑی دمڑی کا حساب منجھلے بھائی کو معلوم تھا کیونکہ ساری آمدنی پہلے اسی کے ہاتھ آتی تھی۔ حالانکہ وانگ لنگ خرچ و آمد کا

ذمے دار تھا لیکن بڑے کو اس کی تفصیل کا کچھ پتا نہ ہوتا تھا اور اس کے برعکس منجھلے کو ہر چیز کا علم تھا۔ بڑے کو بچّوں کی طرح بات بات پر باپ کی رائے لینی ہوتی تھی۔ اس لیے جب عورتوں کے دل میں کھوٹ پڑا تو مردوں میں بھی کھلّم کھلّا دشمنی ہوگئی۔ ان کی ڈیوڑھی میں ایسی باد مخالف چلنے لگی کہ وانگ لنگ بھی تلملا اٹھا اور سکون پھر اس کے لیے حرام ہوگیا۔

طرفہ یہ کہ درپردہ وانگ لنگ اور کمل کے تعلقات بھی کشیدہ ہوگئے تھے۔ یہ حادثہ اس دن پیش آیا کہ جب اس نے اس جوان باندی کو چچا زاد کے چنگل سے چھڑایا تھا۔ بس اسی دن سے 'ناشپاتی' اپنی مالکن کی مشق ستم کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔ گو کہ وہ دن رات اس کی خدمت میں چپ چاپ حاضر رہتی۔ دن بھر اس کے لیے چلم بھرتی اور یہ لاوہ لائیں جھپا جھپ دوڑی بھرتی۔ رات کو بھی جب کبھی وہ بے خوابی کی شکایت کرتی تو یہ لونڈی اس کے ہاتھ پانو دباتی رہتی۔ مگر کمل کا منہ جب دیکھو تو بڑے کی طرح پھولا رہتا تھا۔

وجہ یہ کہ وہ اس باندی ناشپاتی سے جلنے لگی تھی۔ وانگ لنگ کے آتے ہی اس الزام پر اسے باہر نکال دیتی تھی کہ وہ اسے تاکا کرتا ہے۔ اب تک حقیقت میں وانگ لنگ کے لیے یہ باندی ایک یتیم بچّی تھی جس کی دیکھ ریکھ وہ اسی حد تک کرنا چاہتا تھا جس حد تک اپنی معذور بیٹی کی۔ لیکن جب کمل نے یہ مسئلہ چھیڑا تو وانگ لنگ نے اسی نظر سے اسے دیکھا۔ اسے کمل کے شبہات واقعات پر مبنی

معلوم ہوئے کیونکہ لونڈیا دراصل ہزار حسینوں میں ایک حسین تھی۔ ناشپاتی کے پھول کی طرح وہ پیلی تھی۔ اور اسے دیکھتے ہی وانگ لنگ کے سرد خون میں کوئی چیز جوش مارنے لگی جو دس بارہ سال سے بالکل سرد تھی۔

بظاہر وہ کمل سے ٹھٹھول کرتا رہا: "اخاہ۔ کیا تمھارا خیال ہے کہ اب بھی مجھ میں شہوانی جوش باقی ہے؟ —— اللہ کی بندی، میں تو تین تین برس تمھاری خواب گاہ کا رخ نہیں کرتا۔" لیکن یہ کہتے وقت بھی اس کی نگاہیں باندی پر لگی ہوئی تھیں اور وہ ہیجان کے عالم میں آرہا تھا۔

اور سب معاملات میں کمل جاہل ہو تو ہو لیکن اس کوچے سے خوب ہی واقف تھی۔ مردوں کی اڑن گھائیوں کو وہ جانتی تھی اور یہ بھی سمجھتی تھی کہ بڑھاپے میں ایک بار پھر تھوڑی سی دیر کے لیے جوانی کی لو بھڑک اٹھتی ہے۔ لہذا اس باندی پر وہ بہت خفا ہوئی اور یہ سوچنے لگی کہ چائے خانے کے ہاتھ اسے بیچ دے۔ لیکن اسے اپنا آرام سب پر مقدم تھا اور کویل چونکہ بوڑھی اور کاہل ہوگئی تھی اس لیے اس لونڈی ناشپاتی کو علیحدہ کرنے کی اسے ہمت نہ ہوتی تھی۔ یہ ایک ہی پھرتیلی تھی اور مالکن کی ضرورت کو اس سے پہلے بھانپ جاتی تھی۔ کمل کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسے رکھے یا نکالے اور اس حیص بیص کی وجہ سے اس کا غصہ بڑھتا ہی جاتا تھا۔ اس کے ساتھ رہنے کے لیے بڑا پتا چاہیے تھا۔ وہ اتنی چڑچڑی ہوگئی تھی کہ وانگ لنگ کئی کئی روز اس کے کمرے کا رخ نہ کرتا تھا۔ وہ اپنے

دل کو یوں تسلّی دے لیتا کہ وہ جلد راہِ راست پر آجائے گی، بس ذرا سے صبر کی ضرورت ہے۔ لیکن اس دوران میں اس حسین اور نوجوان باندی کا خیال اسے اس شدت سے ستانے لگا جس کی خود اسے بھی توقع نہ تھی۔

ایک ان عورتوں کی چیں چیں ہی کارونا ہو تو سہہ لیا جائے، لیکن وانگ لنگ کے چھوٹے بیٹے نے ایک نیا قصہ چھیڑا۔ یہ لڑکا بڑا کم سخن تھا اور بھولی ہوئی کتابوں سے چپکا رہتا تھا۔ لوگ جب دیکھتے تو یہی دیکھتے کہ ایک چھریرے بدن کا لڑکا بغل میں کتابیں دبائے جا رہا ہے اور اس کے پیچھے کتّے کی طرح بوڑھا معلّم لگا ہوا ہے۔

لیکن جب سپاہیوں کا ڈیرا یہاں پڑا ہوا تھا تو لڑکے کو ان کی صحبت کا چسکا لگ گیا تھا۔ وہ بڑے شوق سے جنگ و جدل اور لوٹ مار کے قصّے سنا کرتا تھا۔ ان کے جاتے ہی وہ معلّم سے زمانۂ قدیم کی لڑائیوں اور ڈاکوؤں کے قصّے منگوا کر پڑھنے لگا۔ اس کا دماغ ان خرافات سے بھر گیا تھا۔

ایک روز وہ اپنے باپ کے پاس پہنچا اور کہا:

"اپنے مستقبل کے متعلّق میں فیصلہ کر چکا ہوں۔ میں سپاہی بن کر لڑنے جاؤں گا۔"

یہ سن کر وانگ لنگ کو ایسا معلوم ہوا کہ گویا آج تک اتنا بڑا صدمہ اسے کبھی نہ پہنچا تھا اور وہ چیخ اٹھا:

"یہ کیا پاگل پن ہے! ۔ کیا بیٹوں کے ہاتھ مجھے کبھی امن نصیب نہ ہوگا۔"

پھر وہ اپنے بیٹے کو ملایمت اور متانت سے سمجھانے بجھانے لگا کیونکہ اس کی

بھنویں اوپر چڑھ گئی تھیں۔ باپ نے کہا:
"پرانی مثل ہی کہ عمدہ فولاد سے کیل نہیں بنائی جاتی اور نہ سپاہی کا پیشہ کسی شریف کے لیے ہی۔ تم میرے چھوٹے بیٹے ہو۔ اس لیے سب سے زیادہ عزیز ہو۔ تم اگر سپاہی کا بانا لیے صحرانوردی کرتے پھروگے تو مجھے راتوں کو کیونکر نیند آئے گی۔"
لیکن لڑکے کا فیصلہ اٹل تھا۔ ابرو پر بل ڈال کر اس نے جواب دیا:
"میں تو سپاہی بن کر رہوں گا۔"
وانگ لنگ منت سماجت پر اتر آیا:
"تم جس تعلیم گاہ میں جانا چاہو میں بھیجنے کو تیار ہوں۔ دکن کے کالجوں میں یا عجیب و غریب علوم سیکھنے کے لیے کسی بدیسی مدرسے میں جانا چاہو تو بھی مجھے انکار نہیں۔ سپاہی نہ بنو تو میں تمھیں حصولِ تعلیم کے لیے دیس بدیس جانے کی اجازت دے سکتا ہوں۔ مجھ جیسے زمیندار اور رئیس کی ہتک نہیں تو کیا ہی کہ اس کا بیٹا سپاہی بن جائے۔" جب لڑکے نے اس کا بھی کوئی جواب نہ دیا تو باپ نے پھر چمکار کر کہا:
"للہ، یہ تو بتاؤ کہ تم پر سپاہی بننے کا جنون کیونکر سوار ہوا؟"
لڑکے نے آنکھیں پھاڑ کر جواب دیا:
"ایسی زبردست جنگ ہونے والی ہی جس کی مثال نہ ملے گی۔ —— ایسا انقلاب ہوگا، وہ گھمسان کی لڑائی ہوگی جس کا جواب تاریخ میں نہیں۔ اور ہماری زمین پر کسی کا قبضہ نہ رہے گا۔"
وانگ لنگ کی حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ آج تک کسی بیٹے نے

ایسی بات اس سے نہ کہی تھی۔

سخت تحیّر کے عالم میں اس نے پوچھا: "تمھاری بکواس کو سمجھنے سے میں اپنے کو قاصر پاتا ہوں۔ ہماری زمین پر کس کا قبضہ ہے، وہ تو بالکل آزاد ہے۔ میں اپنی مرضی کے مطابق اسے پٹے پر دیتا ہوں اور اس کے بدلے مجھے اناج اور سونا ملتا ہے جس سے تمھاری پرورش ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ تم کس قسم کی آزادی چاہتے ہو یہ مجھے کیا معلوم۔"

لیکن لڑکا تلخی سے بڑبڑاتا رہا:

"یہ باتیں آپ کی سمجھ میں نہ آئیں گی کیونکہ آپ بوڑھے ہو چکے ہیں۔"

وانگ لنگ غور و فکر میں ڈوب گیا۔ لڑکے کے درمند چہرے کو دیکھ دیکھ وہ دل ہی دل میں کہنے لگا:

"میں نے اسے پیدا کیا اور اس کے آرام کے لیے ہر قسم کا سامان مہیّا کیا۔ حالانکہ زمین کی نگرانی کے لیے کوئی لڑکا نہیں، پھر بھی میں نے اسے وہاں سے ہٹا کر لکھنے پڑھنے کا موقع دیا، گو دو عالموں کے ہوتے گھر میں اب کسی تیسرے کی ضرورت نہیں۔" ان خیالات میں غلطاں و پیچاں ہونے کے باوجود رہ رہ کر یہ خیال اس کے ذہن میں چکّر لگا رہا تھا: "اس لڑکے کو سب کچھ میں نے ہی دیا ہے۔"

یہ لڑکا اب مردوں کی طرح اونچا پورا ہو گیا تھا گو سبزہ آغاز کا زمانہ تھا تو بھی اس کی کوئی بات 'جنس' کی طرف اشارہ نہ کرتی تھی اور اسی وجہ سے وانگ لنگ نے رکتے رکتے آہستہ سے کہا:

"شاید اس کی ایک ضرورت باقی رہ گئی۔" پھر زور سے پوچھا:

"بیٹے، اگر تم چاہو تو شادی کا انتظام جلد ہی ہو سکتا ہے۔"

یہ سنتے ہی لڑکے کی آنکھوں میں غصّے کے مارے لپک سی اٹھی اور اس نے حقارت سے کہا:

"پھر تو ایک منٹ کے لیے بھی اس گھر میں نہ ٹھہروں گا۔ بھائی جان کی طرح میرے لیے عورت دنیا و عاقبت نہیں۔"

وانگ لنگ فوراً تاڑ گیا کہ اس کا اندازہ غلط تھا اس لیے جلدی سے اپنی غلطی کی تلافی کے لیے بولا:

"نہیں، نہیں، تمھاری شادی نہیں ہوگی۔ لیکن اگر تم چاہو تو باندی واندی کا انتظام ہو سکتا ہے۔"

مگر لڑکے نے سینے پر ہاتھ باندھ کر بڑی تمکنت سے جواب دیا:

"میں کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں۔ میرا کوئی مسلک ہے۔ اور میں شہرت کا جویا ہوں۔ عورتوں کا کیا، ہر جگہ کوڑیوں کے مول خرید لو۔" اسی وقت کسی بھولی ہوئی بات کی یاد آئی اور اس کی ساری اکڑ ہوا ہو گئی۔ اپنی فطری آواز میں وہ بولا: "پھر یہ بھی تو ہے کہ ہماری باندیوں میں ایک سے بڑھ کر ایک بدصورت ہے۔ بفرض محال اگر میں چاہوں بھی تو ان میں سے کس پر دل آئے۔ البتہ لے دے کر سوتیلی اماں کی لونڈی ہے جو قدرے غنیمت ہے۔"

وانگ لنگ فوراً سمجھ گیا کہ یہ ناشپاتی کا ذکر ہے اور عجیب قسم کی آتشِ رقابت اس کے دل میں بھڑک اٹھی یک بیک اسے محسوس ہوا کہ وہ اور بھی بوڑھا ہو گیا ہے، بلغم سے جسم بھاری پڑ گیا اور بال سفید ہو گئے ہیں۔ لیکن سامنے ایک جوانِ رعنا کھڑا ہے۔ اور دم بھر کے لیے ان میں باپ بیٹے کا رشتہ نہ رہا۔ وہ دو مرد تھے۔ ایک بوڑھا ایک جوان۔

باپ نے غصّہ سے کہا :
"لونڈیوں پر ہاتھ نہ ڈالنا ۔ مجھے اپنے گھر میں نواب زادوں کی بدچلنی پسند نہیں ۔ ہم دیہات کے ایماندار لوگ ہیں اور ہمارا رویہ شریفانہ ہے۔ اس قسم کی حرکتوں کے لیے یہاں جگہ نہیں !"
نوجوان اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا ، اس کی بھنویں تنی کی تنی رہ گئیں ۔ شانہ ہلاکر وہ بولا : "آپ ہی نے یہ ذکرِ خیر چھیڑا تھا !" اور پیٹھ پھیر کر وہ باہر چلا گیا ۔
وانگ لنگ کمرے میں تنہا رہ گیا اور تنہائی اسے کاٹنے لگی۔ وہ سوچنے لگا :
"ایسی کیا خدا کی مار ہے کہ مجھے سکون کا ایک لمحہ میسر نہیں !"
مختلف قسم کی شکایتیں اس کا دل چھلنی کرنے لگیں لیکن جانے کیوں یہ غصّہ سب سے زیادہ شدید تھا کہ اس کے بیٹے کو گھر کی ایک باندی پسند آ گئی تھی ۔



باب ۳۴

چھوٹے بیٹے نے اس نوجوان لونڈی ناشپاتی کے بارے میں جو کچھ کہا تھا اسے وانگ لنگ بھول نہ سکا۔ اس کی چلت پھرت پر وہ نظر رکھنے لگا اور غیر محسوس طور پر اس کا خیال اس کے دل و دماغ میں رچ گیا۔ گو کہ اس کے آگے وہ حرف مدّعا زبان پر نہ لایا لیکن حجرے میں اسی کا وظیفہ پڑھنے لگا۔

اسی سال آغاز گرما کی ایک رات کو جب —— نسیم شب حرارت اور مہک کی چادروں میں لپٹ کر بیک وقت مرمریں اور بوجھل ہو جاتی ہے —— وہ تن تنہا ہار سنگار کے گل بار درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ پھولوں کی میٹھی مگر بھاری مہک مشام جان کو معطر کر رہی تھی اور اس کا خون کسی شباب پرور کے خون کی طرح تیزی سے گردش کر رہا تھا۔ دن بھر لہو اسی شدّت سے اس کی رگوں میں بہتا رہا تھا اور بارہا اس کا جی چاہا کہ صرف لنگوٹی باندھ کر کھیتوں میں نکل جائے اور خاکِ پاک کو پانو تلے اور ہوا کو جسم پر محسوس کرے۔

وہ یہ کر بھی گزرتا لیکن اس خیال سے شرما کر رہ جاتا کہ لوگ کیا کہیں گے۔ شہر میں اب اس کی گنتی کسانوں میں نہیں بلکہ امیروں اور زمینداروں میں ہوتی تھی۔ اس لیے وہ اضطراب کی حالت میں حویلی کا گشت لگاتا رہا، مگر اس ڈیوڑھی کی طرف نہ گیا جہاں کمل سائے میں بیٹھی چلم پی رہی تھی کیونکہ مردوں کی

بیکلی اور اس کے اسباب کو وہ فوراً تاڑ سکتی تھی۔ اس لیے وہ اکیلے یہاں وہاں پھرتا رہا، نہ جھگڑالو بہوؤں کی طرف گیا، نہ اُن پوتے پوتیوں کی جانب جو اسے تسکین پہنچاتے تھے۔

خدا خدا کر کے یہ پہاڑ سا دن کٹ گیا۔ مگر پھر بھی خون اس کی رگوں میں تھرکتا ناچتا رہا۔ وہ نہ تو اس گل اندام باندی کو بھول سکا اور نہ آڑی ابرو والے متین دراز قد بیٹے کو۔ وہ سوچنے لگا:

"ان کی عمروں میں بھی تو سنجوگ ہے — لونڈا اٹھارہ سال کا ہوگا اور لونڈی کو ابھی میٹھا برس لگا ہوگا۔"

اس خیال سے اُسے سخت ندامت ہوئی کہ تھوڑے عرصے بعد اس کی عمر ستّر کو پہنچ جائے گی لیکن خون ہے کہ کسی طرح ٹھنڈا نہیں پڑتا۔ پھر اس نے سوچا: "باندی اس لڑکے کو کیوں نہ دے دی جائے۔" جتنی بار وہ یہ جملہ دل میں دُہراتا ایک انی تھی کہ کلیجے میں چبھ جاتی۔ نہ اس کے بس میں یہ تھا کہ انی کو چبھنے سے روکے اور نہ یہ کہ اس کے درد سے بچ جائے۔

اور وہ دن تھا کہ تنہائی کی وجہ سے کسی طرح کٹتا ہی نہ تھا۔

رات آگئی لیکن پھر بھی وہ اکیلے اپنے دالان میں بیٹھا تھا۔ گھر بھر میں کوئی اس کا ہمدم و غم خوار نہ تھا اور نسیم شب تھی کہ ہارسنگار کے پھولوں کی خوشبو میں بھیگی ہوئی تھی۔

پیڑ تلے اندھیرے میں بیٹھے بیٹھے وہ دیکھتا کیا ہے کہ ڈیوڑھی کے دروازے سے کوئی گزر رہا ہے — اور یہ لو! وہ تو ناشپاتی ہے!

"ناشپاتی !" اس نے پکارا، اور یہ پکار کیا ایک سرگوشی تھی۔
وہ یک بیک رک گئی اور غور سے سننے لگی۔
وانگ لنگ نے پھر آواز دی جو ذرا رندھی ہوئی تھی:
"ذرا اِدھر تو آنا !"
اسے پہچان کر وہ جھجکتی ہوئی اس کے سامنے آئی۔ گو کہ تاریکی کی وجہ سے وہ اس کے خدوخال نہ دیکھ سکتا تھا۔لیکن اسے محسوس تو کر سکتا تھا۔ اس کا دامن اپنے ہاتھ میں لے کر اس نے مسوسی ہوئی آواز میں کہا:
"بچی ـــــ !"
اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ دل نے کہا کہ کیسی شرم کی بات ہے کہ تیرے پوتے پوتیوں کی عمر اس لونڈیا کے برابر ہے اور تو یہ حرکت کر رہا ہے۔ دامن سہلانے کے سوا وہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔
باندی پہلے تو منتظر رہی، پھر اس کے خون کی حدت سے متاثر ہوکر وہ ایک مرجھائی ہوئی کلی کی طرح زمین پر گر پڑی اور بوڑھے کے پانو تھام لیے۔ وانگ لنگ نے آہستہ سے کہا:
"بچی ـــــ میں بوڑھا ہوگیا ہوں ـــــ بہت بوڑھا ـــــ"
جب وہ بولی تو اندھیرے میں یہ محسوس ہوا کہ پھولوں کا کوئی پودا سانس لے رہا ہے۔
"مجھے بوڑھے پسند ہیں ـــ کیونکہ وہ بڑے رحم دل ہوتے ہیں"
وانگ لنگ نے اس کی طرف ذرا جھک کر لجاجت سے کہا

"تجھ جیسی ننھی منّی کو تو ایک اونچا پورا جوان چاہیے"۔
(دل ہی دل میں) "جیسے میرا بیٹا ——" زور سے اس نے یہ بات نہ کہی کہ کہیں باندی کے من میں یہ بات بیٹھ نہ جائے۔ یہ قیاس بھی اس کے لیے سوہان روح تھا۔

لیکن باندی بولی:

"جوان مرد نرم دل نہیں ہوتے۔ وہ تو بڑے خونخوار ہوتے ہیں"۔

جب یہ بھولی بھالی آواز قدموں کی طرف سے اوپر لہرائی تو وانگ لنگ محبّت کے بھنور میں پھنس کر رہ گیا۔ کمال احتیاط سے اسے اٹھا کر وہ اپنے کمرے میں لے گیا۔

شب باشی کے بعد بڑھاپے کی اس محبت نے اسے اس قدر متحیر کیا کہ پہلے کسی جنسی تعلق نے نہ کیا تھا —— کیونکہ ناشپاتی پر ہزار جان سے فدا ہونے کے باوجود اسے وہ اس طریقے سے آغوش شوق میں نہ لے سکا جس طرح پہلے اوروں کو لیا تھا۔

بڑی نزاکت سے اپنے بازوؤں میں اسے لے کر وہ بھینچتا رہا اور اپنے پلپلے بھسبھسے جسم کے مقابل اس کے سبک وسیمین شباب کو پاکر اسے تسکین ہوئی۔ دن کو اسے نگاہ بھر دیکھ کر یا اس کے اڑتے ہوئے دامن کو ہاتھوں سے چھو کر یا رات کو اسے پاس لٹا کر بھی اسے تسکین ہو جاتی تھی۔ بڑھاپے کی محبّت پر اسے سخت تعجب ہوا کہ اتنی جلدی اسے سکون وقرار

مل جاتا ہے۔

اور باندی کی پوچھو تو اس میں آتش شوق کا نام نہ تھا۔ اپنے کو وہ اس انداز سے اس کے سپرد کر دیتی گویا وہ اس کا باپ ہو اور وہ بھی اُسے عورت نہیں بلکہ چھوٹی سی بچی گردانتا تھا۔

یہ راز کچھ عرصے تو سربستہ رہا کیونکہ وانگ لنگ نے زبان بھی نہ کھولی۔ پھر وہ اس حویلی کے سفید و سیاہ کا مالک تھا کسی غیر سے کہنے سننے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

سب سے پہلے تیز نگاہ کویل نے اس لونڈی کو پو پھٹتے وانگ لنگ کی خواب گاہ سے نکلتے دیکھا۔ لڑکی کو پکڑ کر وہ خوب ہنسی اور اس کی شاہیں کی سی آنکھیں چمک اٹھیں:

"اوخو، بڑے میاں نے پھر وہی حرکت شروع کی!"

کویل کی آواز سنتے ہی وانگ لنگ اپنی قبا جلدی سے لپیٹ کر باہر آیا اور قدرے ہراس و قدرے تمکنت سے بولا:

"میں تو اسے کسی جوان کے سپرد کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے ایک بوڑھے کا انتخاب کیا!"

کویل کی شریر آنکھیں جگمگانے لگیں: "جب بیگم کو اس واقعے کی اطلاع ہوگی تو بڑا لطف آئے گا۔"

وانگ لنگ دھیرے دھیرے کہنے لگا: "مجھے خود خبر نہیں کہ یہ ہو کیا گیا۔ اپنے حرم میں کوئی اضافہ نہ چاہتا تھا لیکن بیٹھے بٹھائے یہ حادثہ ہو گیا۔" جب کویل نے دوبارہ کمل کی دھمکی دی تو وانگ لنگ اس کے غصّے سے گھبرایا۔ کویل سے وہ

منت کرنے لگا: "ایسے طریقے سے کہو کہ معاملہ پٹ جائے، اور وہ ناراض بھی نہ ہو۔ اس کے عوض میں تمھیں منہ مانگا انعام دوں گا۔"

کویل نے سر ہلاکر اور مسکراکر اس کا وعدہ کیا۔ وانگ لنگ اپنے کمرے میں جاکر چپ چاپ بیٹھ گیا اور کچھ دیر بعد کویل نے آکر کہا:

"پہلے تو یہ ذکر سن کر وہ بہت اچھلی کودی مگر میں نے برجستہ اسے ان تحایف کی یاد دلائی جن کا انتظار وہ عرصۂ دراز سے کر رہی ہے۔ آپ نے جس بدیسی گھڑیال کا وعدہ کیا تھا اس کے علاوہ وہ زمرّد کی چوڑیاں اور انگوٹھی چاہتی ہے۔ اگر کوئی بھولی بھٹکی چیز رہ گئی تو وہ بھی آپ کو دینی ہوگی اور باندی ناشپاتی کی جگہ کوئی لونڈی دینا تو لازمی ہے۔ ناشپاتی آیندہ ادھر کا رُخ نہ کرے اور آپ بھی براہ کرم چندے اس کے سامنے نہ جائیں کیونکہ آپ کو دیکھتے ہی اسے متلی ہونے لگتی ہے۔"

وانگ لنگ نے خوشی خوشی یہ سب شرایط منظور کرلیں:

"وہ جو مانگے گی، ملے گا، اس معاملے میں میرا ہاتھ نہ رکے گا۔"

کمل سے جلد ملاقات کا امکان نہ رہنے سے اسے اطمینان ہوا۔ یہ تو وہ جانتا ہی تھا کہ یہ تحایف ملتے ہی اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ لیکن اپنے بیٹوں سے اسے اس محبّت بازی کی ندامت تھی۔ بار بار وہ اپنے کو سمجھاتا:

"کیا میں اس گھر کا مالک نہیں ہوں اور کیا اپنی زر خرید لونڈی سے

لطف اندوز ہونے کا بھی حق مجھے نہیں ہے۔"
تاہم وہ شرمندہ تھا کیونکہ اب وہ دادا کہلانے لگا تھا۔
ساتھ ساتھ ہر شہوت پرست کی طرح اُسے اپنے کیے کا گھمنڈ بھی تھا۔
اس کیفیت میں وہ اپنی اولاد کا انتظار کرنے لگا۔
تینوں بیٹے جدا جدا آئے۔ منجھلا سب سے پہلے پہنچا۔ وہ
کاشت، فصل اور گرمی کی بارش کے متعلق باتیں کرتا رہا۔ لیکن
اب وانگ لنگ پر بارش کی کمی یا زیادتی کوئی اثر نہ کرتی تھی۔
کیونکہ اگر اس سال کم آمدنی ہوئی تو پچھلے سال کی بچت موجود تھی۔
اس کی تجوریاں سونے رُپے سے بھری ہوئی تھیں۔ منڈی میں
اس کا روپیہ لگا ہوا تھا اور بڑی بڑی رقمیں سود پر دی گئی تھیں
جن کا حساب اسی لڑکے کے سپرد تھا۔ پھر بھلا وانگ لنگ بادلوں کا
منہ کیوں تکے۔
اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے یہ لڑکا کن انکھیوں سے
کمرے کا جایزہ لے رہا تھا۔ وانگ لنگ سمجھ گیا کہ وہ اس باندی کے
آثار ڈھونڈ رہا ہے اور یہ قیاس لگا رہا ہے کہ ان افواہوں میں کچھ
اصلیت ہے یا نہیں۔ اس لیے اس نے ناشپاتی کو جو خواب گاہ
میں چھپی ہوئی تھی آواز دی:
"ننھی، میرے اور میرے بیٹے کے لیے چائے بنا لاؤ!"
جب وہ باہر نکلی تو اس کا پیلا مکھڑا سیب کی طرح سرخ
ہو گیا تھا۔ سر جھکائے ہوئے اپنے چھوٹے چھوٹے پانو سے وہ
مصروف خرام ہوئی اور منجھلے بیٹے کی حیرت کا یہ حال ہوا کہ اسے

اپنی آنکھوں پر اب بھی یقین نہ آتا تھا۔

پھر بھی اس نے موضوعِ بحث کو نہ بدلا۔ زمین ایسی ہی ویسی ہے
فلاں بٹّا اس سال بدل دیا جائے کیونکہ پٹے دار افیون نوشی
کے سوا کچھ نہیں کرتا اور زمین افتادہ پڑی ہوئی ہے جب وانگ لنگ
نے اس کے بچّوں کی خیرت پوچھی تو وہ بولا کہ انھیں سوکھی کھانسی
ہوگئی ہے۔ مگر اب موسم بہتر ہوگیا ہے تردّد کی کوئی بات نہیں۔

چائے پیتے ہوئے وہ اس قسم کی باتیں کرتے رہے۔ جب
منجھلے لڑکے کا تجسّس دھیما پڑ گیا تو وہ چلا گیا۔ اور وانگ لنگ کو ایک سے
تو نجات ملی۔

دوپہر کے وقت بڑا لڑکا آیا۔ وہ اونچا پورا اور بانکا ترچھا تھا
اور اپنے بڑے پن کا اسے احساس تھا۔ وانگ لنگ اس کی آن بان
سے کھٹکا اور ناشپاتی خانم کو بلانے کی جرأت نہ کی۔ چپ چاپ
حقّہ پیتے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ لڑکا
بڑے کرّوفر لیکن ادب و احترام سے بیٹھ گیا اور باپ کی صحت و
خیریت کا حال پوچھنے لگا۔ وانگ لنگ نے خدا کا شکر بجا لانے کی رسم
ادا کر کے جو اس کی طرف دیکھا تو اس کے سارے وسوسے دور ہوگئے۔
کیونکہ وہ سمجھ گیا کہ اس نوجوان کا خمیر کیسا ہے۔ بظاہر قوی ہیکل
لیکن شہر کی زندگی سے خائف اور اپنے ادنیٰ خاندان کی وجہ سے
شرمندہ۔ اب زمین کی وہ صحت مندی جو لاعلمی میں بھی وانگ لنگ
میں موجود رہتی تھی، اُبھر آئی اور ہمیشہ کی طرح آج بھی اس لڑکے
کی کوئی پروا اسے نہ رہی۔ اس کی ترّک بھڑک کا بھی بڈّھے پر

کوئی اثر نہ رہا اور اس نے بے دھڑک ہوکر اپنی آشنا کو بلایا:

"ننھی بڑے بیٹے کے لیے بھی چائے بنانا!"

اس مرتبہ باندی پر بےحسی اور بے حرکتی طاری تھی اور اس کا چہرا ناشپاتی کے پھول کی طرح سفید پڑگیا تھا۔ اس کی آنکھیں جھکی رہیں اور حکم کی تعمیل کرکے وہ فوراً باہر چلی گئی۔

جب تک وہ چائے انڈیلتی رہی، دونوں مرد خاموش بیٹھے رہے لیکن اس کے جاتے ہی جب دونوں نے پیالیاں اٹھائیں تو وانگ لنگ نے غور سے بیٹے کے چہرے کو دیکھا۔ لڑکے کی آنکھوں سے پسندیدگی کا جذبہ صاف عیاں تھا اور وہ رشک بھی چھپا ہوا تھا۔ جو ایک مرد دوسرے مرد سے محسوس کرتا ہے۔ جب وہ چائے پی چکے تو لڑکے نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

"مجھے تو اس بات پر یقین نہیں آتا تھا"

"کیوں نہیں؟۔ اپنے گھر میں جو چاہوں کروں۔" وانگ لنگ نے لاپروائی سے جواب دیا۔

لڑکے نے ایک لمبی سانس لی اور کچھ دیر کے بعد بولا:

"آپ رئیس ہیں اور خودمختار ہیں۔" ایک بار پھر اس نے سانس لی: "شاید یہ سچ ہے کہ سب مرد ایک عورت سے تھک جاتے ہیں اور کوئی دن ایسا بھی آتا ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ رک گیا لیکن اس کی نگاہ میں اس حسد کی جھلک باقی تھی جو ایک مرد بادلِ ناخواستہ دوسرے مرد کے خلاف رکھتا ہے۔ وانگ لنگ یہ دیکھ کر دل میں خوب ہنسا کیونکہ اسے ان صاحب زادے

کی عیش پسندی کا علم تھا۔ وہ بنی ٹھنی شہزاد بیوی بھی ہمیشہ اسے قابو میں نہ رکھ سکے گی اور کبھی نہ کبھی یہ لگام تڑا کر بھاگ نکلے گا۔

بڑے بیٹے نے اس سے زیادہ کچھ نہ کہا لیکن وہ اس انداز سے واپس گیا گویا اسے کوئی نئی بات سوجھی ہو۔ وانگ لنگ حقہ گڑگڑاتے ہوئے خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا کہ بڑھاپے میں بھی اپنی خواہش کی تکمیل سے وہ باز نہ رہا۔

چھوٹا بیٹا رات کے اندھیرے میں آیا اور وہ بھی اکیلا تھا۔ اس وقت وانگ لنگ گول کمرے میں حقہ پیتے بیٹھا تھا۔ میز پر لال موم بتی روشن تھی اور ناشپاتی سامنے خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی وہ وانگ لنگ کو طفلانہ انداز سے دیکھ لیتی تھی تو یہ حضرت آپ اپنے پر مرحبا کہہ اٹھتے کہ میں نے بھی کیسا کمال کر دکھایا۔

اتنے میں تاریکی سے چھوٹا بیٹا ہویدا ہوا اور یک بیک پاس آکھڑا ہوا کیونکہ کسی نے اس کے پاؤں کی آہٹ تک نہ سنی تھی۔ وہ ایسے عجیب انداز سے کھڑا تھا کہ وانگ لنگ کو بلا ارادہ ایک چیتے کا خیال آیا جسے پہاڑی پر سے دیہاتی لوگ پکڑ لائے تھے۔ حالانکہ چیتا پابند تھا مگر وہ جست لگانے کے لیے سکڑا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس لڑکے کی آنکھیں بھی اسی طرح باپ کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ اس کی وہ بھنویں جو عمر کے لحاظ سے بہت کالی اور گھنی تھیں اب اس کی آنکھوں پر یوں سمٹ آئی تھیں کہ ڈر لگتا تھا۔ یوں کھڑے کھڑے دبی ہوئی تھرتھرائی ہوئی آواز میں اس نے کہا:

"اب میں سپاہی بن کر رہوں گا۔ اب میں سپاہی بن کر رہوں گا"

لڑکی کی طرف اس نے آنکھ بھی نہ اٹھائی۔ صرف وانگ لنگ کو دیکھتا رہا اور وہ جس نے اپنے بڑے بیٹوں کی پروا بھی نہ کی تھی، اچانک اس سے خائف ہوگیا۔ حالانکہ بچپن سے لے کر اب تک اس کی طرف اس نے توجہ بھی نہ کی تھی۔

وانگ لنگ آئیں شائیں بکنے لگا۔ جب اس نے کچھ کہنے کے ارادے سے حقے کی نلی منہ سے ہٹائی تو اس کی گھگھی بندھ گئی اور وہ اسے دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ ادھر لڑکے کی وہ رٹ جاری تھی۔

"میں اب یہاں ہرگز نہ ٹھہروں گا — میں چلا جاؤں گا —"

یک بیک پلٹ کر اس نے پہلی مرتبہ لڑکی پر نگاہ ڈالی، اور نظریں چار ہوتے ہی وہ شرمائی اور اپنے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ تب نوجوان نے اپنی آنکھیں ہٹالیں اور یہ جا وہ جا، کمرے سے نکل کر شب گرما کی سیاہی میں گھل مل گیا۔ وہ چلا گیا اور کمرے میں پھر سناٹا چھا گیا۔

دیر کے بعد وانگ لنگ باندی سے مخاطب ہوا۔ اس کی ساری اکڑ ہوا ہوگئی تھی۔ بڑی لجا لجت اور افسردگی سے وہ بولا:

"جانِ من، مجھے اس امر کا احساس ہے کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں — بہت بوڑھا۔"

لڑکی نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے اور ایسے فرطِ شوق سے جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا — کہا:

"جوان مرد بے رحم ہوتے ہیں — مجھے بوڑھے ہی پسند ہیں۔"

جب صبح ہوئی تو وانگ لنگ کا چھوٹا بیٹا غایب ہو چکا تھا اور کوئی نہ جانتا تھا کہ وہ کہاں گیا۔



باب ۳۴

جس طرح برسات کی گرمی موسم گرما کا دھوکا دے کر سردی میں تبدیل ہو جاتی ہے، اسی طرح وانگ لنگ کی محبت بھی پلک جھپکتے سرد پڑ گئی۔ اس کی گرمی جاتی رہی اور اس کی شفقت میں اب شہوت کا پہلو نہ رہا۔

اس آگ کے بجھتے ہی بڑھاپے نے پوری طرح اس پر جال ڈالا۔ اس کے باوجود وانگ لنگ اپنی نئی چہیتی سے شفقت کرتا رہا۔ یہ خیال بھی اس کے لیے تسکین بخش تھا کہ وہ ساتھ رہتی ہے۔ وہ وفاداری سے اس کی خدمت میں لگی رہتی اور ایسے صبر و تحمّل کا ثبوت دیتی کہ جو اس کی کم عمری میں ناپید ہے۔ وانگ لنگ کے مہر و محبّت میں بھی کوئی فرق نہ آیا اور اب وہ اسے اسی طرح چاہتا تھا جس طرح باپ بیٹی کو چاہے۔

اس کی خاطر ناشپاتی اس کی بے زبان دیوانی لڑکی کا بھی خیال رکھتی تھی اور اس سے بوڑھے کو یک گونہ خوشی ہوتی تھی۔ اس لیے ایک روز اس نے ناشپاتی کو اپنے دل کا حال سنایا۔ اکثر وہ سوچا کرتا تھا کہ میرے بعد اس بیچاری کا کیا حال ہوگا، کون اس کی خبرگیری کرے گا۔ کیونکہ کسی کو کیا پروا کہ وہ زندہ ہے یا مردہ۔ آخر اس نے دواخانے سے زہر لا کر رکھ چھوڑا تھا کہ مرتے وقت بگلی کو کھلا دے گا۔ لیکن اس کا تصور تک اس کے لیے موت سے زیادہ ہولناک تھا۔ یہی وجہ ہے کہ

ناشپاتی کی وفاداری نے اسے اپنا گرویدہ کرلیا۔
ایک روز اسے پاس بلا کر وانگ لنگ نے کہا:

"تمھارے سوا کوئی ایسا نہیں جس کے ہاتھ میں میں اس دکھیاری پگلی کا ہاتھ دوں کیونکہ میرے بعد کون اس کی بات پوچھے گا۔ میں تو مرجاؤں گا لیکن یہ جیتی رہے گی کیونکہ اسے نہ کوئی فکر ہی نہ تردّد کہ اس کی زندگی کو گھن بن کر کھائے۔ مجھے خوب معلوم ہی کہ میری موت کے بعد نہ کوئی اسے کھلائے گا نہ یہ دیکھے گا کہ وہ دھوپ میں بیٹھی ہی یا سردی میں یا بارش میں۔ شاید وہ گھر سے نکال دی جائے — اور اس بیچاری کی پرورش میں نے اور میری بیوی نے اپنے ہاتھوں سے کی تھی۔ لو یہ دوا کی پڑیا۔ اس کی نجات کا ایک ہی ذریعہ ہی۔ جب میں مرجاؤں تو چاول میں ملا کر اسے کھلا دینا اور وہ بھی وہیں آجائے گی جہاں میں ہوں گا۔ میری روح کو اسی حالت میں آرام ملے گا۔"

لیکن ناشپاتی اس پڑیا کو دیکھ کر الگ دبک گئی اور اپنے مخصوص نرم لہجے میں بولی:

"میں جو کیڑے مکوڑے کو بھی نہیں مار سکتی یہ خون اپنی گردن پر کیونکر لوں گی۔ میرے آقا، آپ کے احسان کو یاد رکھنے کے لیے میں پگلی بٹیا کی پرورش اپنے ذمّے لیتی ہوں۔ کیونکہ آپ سے زیادہ کوئی اس زندگی میں مجھ پر مہربان نہیں ہوا۔ آپ کا مہر بے پایاں ہی۔"

اس کی باتیں سن کر وانگ لنگ کو رونا آنے لگا کیونکہ کسی نے

اس کے احسان کا بدلا یوں نہ چکایا تھا۔ اس کی محبت اور بھی زیادہ ہوگئی۔
اور وہ بولا:

"ننھی، یہ سب سچ ہے۔ پھر بھی خاکم بدہن، زندگی کا کیا اعتبار۔ اگر تم بھی اٹھ گئیں تو دنیا میں اس کا کون ہوگا۔ کیونکہ میری بہوؤں کو اپنے بچوں اور جھگڑوں سے فرصت کہاں۔ میرے بیٹے سب مردوں کی طرح ان جھمیلوں سے دامن بچاتے ہیں۔"

ناشپاتی نے اس کا مطلب سمجھ کر زہر کی پڑیا چپ چاپ رکھ لی۔ وانگ لنگ کو اس پر کامل اعتبار تھا اور اب وہ اپنی دیوانی بیٹی کی طرف سے بھی نچنت ہوگیا۔

اس کے بعد وانگ لنگ پر بڑھاپا چھا گیا۔ ناشپاتی اور پگلی بیٹی کے سوا اس کی ڈیوڑھی میں کسی کا آنا جانا نہ تھا۔ کبھی کبھی وہ چونک کر ناشپاتی کو بیکل ہو کر دیکھتا اور کہتا:

"ننھی، ایسی ساکن زندگی تمھاری عمر کے لیے نہیں۔"

لیکن وہ ہمیشہ کمال احسان مندی اور سعادت مندی سے جواب دیتی:

"بلا سے، اطمینان اور سکون تو ہے۔"

پھر وہ کبھی کہہ اٹھتا:

تمھارے لیے میں بہت بوڑھا ہوں اور میرے جسم میں اب آگ کی جگہ راکھ ہی راکھ ہے۔"

لیکن وہ ہمیشہ تشکر آمیز لہجے میں کہتی:

"آپ میرے مہربان ہیں اور کسی مرد سے میں اس سے زیادہ توقع نہیں رکھتی۔"

ایک بار جب اس نے یہی جملہ دہرایا تو وانگ لنگ نے اچنبھے سے پوچھا :

"کیا تمھارے بچپن میں کوئی ایسا واقعہ ہوا تھا جس کی وجہ سے تم مردوں سے اتنی نفرت کرنے لگیں؟"

یہ سنتے ہی باندی کی آنکھوں میں خوف وہراس چھا گیا اور انھیں ہاتھوں سے ڈھک کر وہ آہستہ سے بولی :

"آپ کے سوا مجھے تمام مردوں سے نفرت ہے — میں کسی مرد کو نہیں دیکھ سکتی اور اپنے باپ سے بھی مجھے نفرت ہے جس نے مجھے بیچ دیا تھا۔ میں نے مردوں کی برائی ہی برائی سنی، اسی لیے مجھے ان سے ڈر لگتا ہے۔"

وانگ لنگ نے حیرت زدہ ہوکر پوچھا :

"میں تو سمجھا تھا کہ اس حویلی میں تمھاری زندگی آرام وسکون سے گزری ہے۔"

لیکن باندی نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا :

"مجھے انتہائی نفرت ہے — مردوں کی ساری قوم سے خصوصاً جوان مرد تو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔"

یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئی اور وانگ لنگ اس ادھیڑبن میں پھنس گیا کہ اسے کمل نے اپنی زندگی کی داستان سنا کر ڈرا دیا ہے۔ کویل نے اپنی فتنہ سازی سے سہما دیا ہے۔ یا پوشیدہ طور پر اس پر کوئی ایسی افتاد نازل ہوئی جس کا ذکر وہ نہیں کرنا چاہتی۔ اس کی سمجھ میں بالکل نہ آیا کہ یہ کیا معمّا ہے۔

آہ بھر کر وہ خاموش ہو گیا کیونکہ سب سے زیادہ اسے سکون کی ضرورت تھی اور اس کی ایک یہی خواہش تھی کہ اپنے دالان میں ان دونوں لڑکیوں کے ساتھ بیٹھا رہے۔

وانگ لنگ کی زندگی یوں بسر ہو رہی تھی اور ماہ و سال اسے قبر کی طرف کھینچ رہے تھے۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی دھوپ میں اونگھنے لگا اور اسے اکثر یہ خیال ہوتا کہ اب آخری وقت آگیا۔ اس کا اسے کوئی رنج بھی نہ تھا۔

گاہے گاہے وہ اپنے عزیزوں کو دیکھنے جاتا اور کبھی کبھار کمل سے بھی بل آتا۔ وہ اس کی نئی چہیتی کا نام بھی نہ لیتی۔ مگر بظاہر اس سے خاطر سے پیش آتی کیونکہ اب وہ بھی بوڑھی ہو رہی تھی اور شراب و کباب اور روپیہ پیسے کے سوا اسے کسی چیز کی چاہت نہ تھی۔ کمل اور کویل میں اب بہناپے کا ناتا تھا، بیگم اور باندی کا نہیں۔ گپ ہانکتے ان کا وقت کٹتا تھا اور اس میں ان مردوں کا ذکر خصوصاً ہوتا تھا جن کے ساتھ کبھی انھوں نے مزے لوٹے تھے۔ جو باتیں زور سے نہ کی جاسکتیں وہ کانوں میں کہتیں۔ کھانے پینے سونے اور گپ لڑانے کے سوا ان کا کوئی مشغلہ نہ تھا۔

اگر بھولے بھٹکے وانگ لنگ کسی بیٹے کی ڈیوڑھی میں چلا گیا تو وہ بڑے احترام سے پیش آتا تھا، دوڑ دوڑ کر چائے لاتا تھا۔ پھر وانگ لنگ گود کے بچے کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کرتا اور یادداشت کی خرابی کی وجہ سے دسوں مرتبہ وہی سوال دہراتا:

کسی نے کہا: "سب ملا کر گیارہ پوتے اور آٹھ پوتیاں"۔

وانگ لنگ یہ سن کر خوب ہنسا: "ہر سال دو کا اضافہ کیے جاؤ، پھر تو حساب میں مجھے بھی آسانی ہوگی۔ کیوں؟"

تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ کر وہ اُن بچّوں کا معاینہ کرتا تھا جو گھیرا ڈال کر اس کے اِرد گرد جمع ہو جاتے تھے۔ اس کے کئی پوتے اب بڑے بڑے ہو گئے تھے اور انھیں سر سے پانو تک دیکھ کر بوڑھا آپ ہی آپ کہتا:

"وہ تو اپنے پردادا سے ملتا جلتا ہے اور یہ سوداگر لیو پر پڑا ہے۔ مگر یہ مسخرا تو عین میری تصویر ہے"۔

پھر وہ پوچھتا:

"تم مدرسے جاتے ہو؟"

وہ سب بیک آواز چلّاتے: "جی ہاں، دادا جان۔"

وہ دوسرا سوال کرتا:

"تم 'چہار پند' بھی پڑھتے ہو؟"

اس پر وہ سب یوں حقارت سے مسکراتے گویا جوانی بڑھاپے پر تبسم کر رہی ہو۔ اور انھوں نے جواب دیا:

"دادا جان، انقلاب کے بعد کوئی ان کتابوں کو پلٹ کر بھی نہیں دیکھتا"۔

وانگ لنگ نے تردّد سے کہا:

"میں نے بھی اس انقلاب کا نام سنا ہے لیکن مصروفیت ایسی رہی کہ اس کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔ کھیتی باڑی ایسی ہی چیز ہے"۔

لیکن لونڈے اسے چھیڑتے رہے اور جب وانگ لنگ وہاں سے اٹھا تو اس احساس کے ساتھ کہ یہاں اس کی حیثیت کسی مہمان کی سی ہے۔

کچھ عرصے بعد بیٹوں کے گھر جانا اس نے چھوڑ دیا۔ کبھی کبھی وہ کویل سے پوچھ لیتا:

"اب تو میری بہوؤں کو مل جل کر رہنے کا ڈھنگ آگیا ہوگا؟"

لیکن وہ "آخ تھو" کہکر جواب دیتی:

" اجی ان کی نہ پوچھو۔ یہ تو بلّیاں ہیں بلّیاں۔ اور بڑے صاحبزادے بھی اپنی بیوی کے شکوہ شکایت سے تنگ آگئے ہیں۔ ایسی تربیت کو لے کر کوئی کیا کرے۔ جب دیکھو اپنے میکے کا ذکر کرتی ہے جس سے میاں کا دل پک گیا ہے۔ سنا ہے کہ وہ کسی داشتہ کی تلاش میں ہیں۔ اب وہ اکثر چائے خانوں کی سیر کو جاتے ہیں۔"

یہ سن کر وانگ لنگ کے منہ سے ایک طویل آہ نکل گئی۔

حالانکہ یہ معاملہ غور طلب تھا مگر کچھ دیر میں وہ اس کے بدلے چائے خانے کا دھیان کرنے لگا اور سوچنے لگا کہ بہار کی تازی ہوا سے کاندھے اکڑ گئے ہیں۔

دوسری مرتبہ اس نے کویل سے پوچھا:

"میرے چھوٹے بیٹے کا بھی کوئی حال معلوم ہوا ——— وہ جو عرصے سے غایب ہے۔"

کویل کو حویلی کا ایک ایک رتی حال معلوم ہوتا رہتا تھا:

وہ چھٹی پتری تو لکھتا نہیں۔ مگر دکن سے آنے والے بتلاتے ہیں

کہ وہ بڑا فوجی افسر بن بیٹھا ہے اور جس چیز کو انقلاب کہتے ہیں اس کا ایک لیڈر ہے۔ میں تو کچھ سمجھی نہیں کہ یہ کیا چیز ہے۔ شاید کسی قسم کا کاروبار ہو۔"

یہ سن کر وانگ لنگ نے دوبارہ آہ کھینچی۔

ممکن ہے کہ اس معاملے میں وہ سوچ بچار کرتا لیکن اب جھٹپٹا ہو چلا تھا اور دھوپ ڈھل جانے کے بعد ہوا میں خنکی پیدا ہو گئی تھی جس کی وجہ سے اس کی ہڈیوں میں درد ہونے لگا۔ اب اسے اپنے دماغ پر قابو نہ رہا تھا، جدھر چاہے ادھر نکل جاتا تھا۔ اس کے گلے ہوئے جسم کو تازہ خوراک اور گرم چائے کی سخت ضرورت رہا کرتی تھی۔ لیکن رات کی خنکی میں جب بی ناشپاتی اس سے بھڑکر سو جاتیں تو بڑے میاں کی ساری سردی ہرن ہو جاتی۔

اس طرح بہار آتی جاتی رہی اور اس کی آمد کا احساس وانگ لنگ میں برابر کم ہوتا گیا۔ لیکن زمین سے اسے جو محبت تھی وہ کسی طرح کم نہ ہوئی۔ اس نے دھرتی تج دی تھی، شہر میں رہنے لگا تھا اور امیر ہو گیا تھا۔ لیکن اب تک اِس پیڑ کی جڑ انھیں کھیتوں میں تھی ۔ مہینوں وہ ان کی خبر نہ لیتا مگر جب بہار آتی تو وہاں گئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ حالانکہ اب وہ ہل سنبھال بھی نہ سکتا تھا۔ پھر بھی دوسروں کے ہل چلانے کا تماشا دیکھا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنا بستر لے کر ایک نوکر کے ساتھ اسی دیہاتی گھر میں جاتا اور اسی پرانے پلنگ پر سویا کرتا جس پر اولان کا دم نکلا تھا اور جس پر اس نے بچوں کو جنم دیا تھا۔ صبح اٹھ کر

وہ باہر جاتا اور اپنے تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے بید مجنوں کی ایک ٹہنی اور ناشپاتی کے پھولوں کا گچھا توڑتا اور دن بھر انھیں لیے رہتا۔

ختمِ بہار کے موقع پر ایک روز یونہی ٹہلتے ہوئے وہ کھیتوں سے کچھ دور اس ٹیلے کی طرف نکل گیا جہاں گھر کے مردے دفن تھے۔ لکڑی کا سہارا لیے ہوئے وہ کانپنے لگا اور جب قبروں پر نگاہ گئی تو یادِ رفتگاں تازہ ہوگئی۔ اس کے تصور میں ان کی تصویریں جتنی صاف تھیں اتنی دیوانی بیٹی اور باندی ناشپاتی کے علاوہ کسی زندہ کی بھی نہ تھی۔ اس کا دماغ ماضی کی ورق گردانی کرنے لگا اور ہر چیز اسے صاف صاف یاد آئی۔ اس چھوٹی لڑکی کو بھی وہ نہ بھول سکا جس کی کوئی اطلاع عرصۂ دراز سے نہ ملی تھی۔ اب اس کے بچپن کی مورت سامنے آگئی —— ریشم کے سے پتلے اور لال ہونٹھ۔ اب اس کا وجود یا عدم وجود وانگ لنگ کے لیے برابر ہوگیا تھا۔ یک بیک اسے خیال آیا:

"اب میرا نمبر ہی۔"

قبرستان کے اندر جاکر اس نے غور سے اس جگہ کو دیکھا جہاں وہ دفن کیا جائے گا۔ یہ جگہ ابّا اور چچا کی قبروں کے نیچے اور چنگ کی بغل میں تھی۔ اولان کی قبر بھی قریب ہی تھی۔ پہلے تو اس نے ان مٹی کے تودوں کو دیکھا جن کے نیچے ہمیشہ کے لیے سونا تھا اور پھر اپنی وسیع زمین کو۔ پھر اپنے آپ کو جتایا:

"تابوت کی فکر کرنا چاہیے۔"

بڑے جتن سے یہ تجویز اس نے اپنے ذہن میں محفوظ رکھی اور شہر پہنچتے ہی بڑے بیٹے کو بلا کر کہا:

"میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"میں حاضر ہوں عزور فرمائیے۔"

لیکن عین اسی وقت وانگ لنگ وہ بات بھول گیا اور بے بسی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کیونکہ اس نے اپنے حافظے پر زور دیا تھا اور اس کے باوجود اسے کچھ یاد نہ رہا تھا۔ ناشپاتی کو بلا کر وہ پوچھنے لگا:

"ننھّی میں کیا کہنا چاہتا تھا؟"

ناشپاتی نے نرمی سے کہا:

"آج آپ کہاں رہے؟"

وانگ لنگ نے ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا:

"میں زمین پر تھا۔"

"زمین کے کس حصے پر؟"

اس سوال نے پھر اس کی یادداشت تازہ کر دی اور اس کی اشک آلود آنکھیں ہنس پڑیں۔ وہ چلّایا:

ہاں، ہاں مجھے یاد آ گیا۔ بیٹے میں اپنی قبر کے لیے جگہ کا انتخاب کر چکا ہوں۔ یہ ابا اور چچا اور چنگ و اولان کی قبروں کے بیچ میں واقع ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ انتقال سے پہلے اپنے تابوت کو دیکھ لوں۔"

یہ سن کر لڑکا رسم کے مطابق احترام سے پکار اٹھا:

"ابّا جان، آپ ایسی باتیں زبان مبارک سے نہ نکالیں۔ لیکن فرماں برداری سے میں کیوں کر عذر کر سکتا ہوں۔"

وہ جا کر ایک خاص قسم کی خوشبودار لکڑی کا نہایت عمدہ تابوت لایا۔ یہ لکڑی صرف تابوتوں کے استعمال میں آتی تھی کیونکہ وہ لوہے سے زیادہ مضبوط اور انسان کی ہڈی سے زیادہ دیرپا ہوتی ہے۔ اسے دیکھ کر وانگ لنگ کو اطمینان ہوا۔

اپنے کمرے میں تابوت رکھ کر روز وہ اسے دیکھا کرتا تھا۔ پھر یک بیک اسے کچھ اور خیال آیا:

"یہ اسی دیہاتی مکان میں منتقل کر دیا جائے کیونکہ زندگی کے باقی ماندہ اوقات میں وہیں گزارنا چاہتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ وہیں دم نکلے۔"

اس کی مرضی پر عمل کیا گیا۔ وانگ لنگ پگلی بیٹی اور ناشپاتی کے ساتھ کچھ نوکر چاکر لے کر وہاں چلا گیا۔ اس طرح ایک بار پھر وہ اپنے اصلی مسکن کو لوٹ آیا:

جب بہار رخصت ہوئی تو گرمی آئی۔ فصلیں لہلہائیں اور پھر جب سردی سے پہلے بیت جھڑ کا آفتاب عالمتاب جگمگایا تو وانگ لنگ اسی دیوار کے سائے میں بیٹھنے لگا جہاں اس کا باپ بیٹھا کرتا تھا۔ کھانے پینے اور کھیتی باڑی کے سوا اور کوئی موضوع اب اس کے ذہن میں نہ رہا تھا۔ لیکن جب وہ زمین کے متعلق سوچتا تو یہ فصل یا بارش یا بیج کا ذکر نہ ہوتا ——— بس زمین کا خیال ہوتا تھا۔ کبھی کبھی جھک کر وہ مٹھی بھر مٹّی اٹھاتا اور اسے

ہاتھ میں لیے بیٹھ جاتا کیونکہ اسے محسوس ہوتا کہ اس میں جان پڑگئی ہے۔ اس سے اسے تسکین ہوتی اور کبھی وہ مٹی کا اور کبھی اپنے تابوت کا دھیان کرتا۔

اور دھرتی ماتا تھی کہ صبر سے اس کی آمد کا انتظار کیا کرتی تھی۔

بیٹے اب بھی ادب سے پیش آتے اور روزانہ یا ہر دوسرے روز مزاج پرسی کے لیے آتے تھے۔ اس کی عمر کا لحاظ رکھتے ہوئے وہ بھانت بھانت کے پکوان اس کے لیے پکواتے تھے۔ لیکن اب وانگ لنگ کو صرف ابالی ہوئی گرم گرم چیز ہی پسند آتی تھی جو جلدی سے کھائی جا سکے۔

اگر بیٹے کسی روز نہ آتے تو وہ بڑبڑاتا اور ناشپاتی سے پوچھتا:
"آخر انھیں ایسی کون سی مشغولیت ہے؟"

ناشپاتی جواب دیتی کہ وہ بھی بڑے ہو گئے ہیں اور مختلف کاروبار ان کے ذمے ہیں۔ بڑے صاحب زادے شہر کی میونسپلٹی کے میر ہو گئے ہیں اور ایک نئی بیوی بھی کرلی ہے۔ اور منجھلے صاحب زادے خاص اپنا بازار بنوا رہے ہیں!" مگر وانگ لنگ کی سمجھ میں کچھ نہ آتا اور زمین کو دیکھتے دیکھتے وہ یہ سب باتیں بھول جاتا تھا۔

صرف ایک روز لمحہ بھر کے لیے حقیقت پر اس کی نظر گئی۔ اس دن دونوں بیٹے آئے تھے اور سلام و کلام کے بعد گھر کے باہر چہل قدمی کر رہے تھے۔ وانگ لنگ چپکے چپکے ان کے پیچھے جا کر

کھڑا ہو گیا اور انھوں نے اس کے پانو کی آہٹ بھی نہ سنی اور نہ گیلی مٹی پر اس کی لاٹھی کی آواز ہوئی۔ وانگ لنگ نے اپنے منجھلے بیٹے کو مخصوص چکنے چپڑے انداز میں یہ کہتے سنا:

"ہم فلاں فلاں کھیت بیچ کر ان کی قیمت آپس میں برابر برابر تقسیم کرلیں گے۔ آپ کا سرمایہ میں خاصے سود پر لے لوں گا کیونکہ ریل نکل آنے کی وجہ سے میں جنس سمندر کی راہ دساور نہیں بھیج سکتا ـــــ"

بوڑھے کے کانوں میں "کھیت بیچ دیں گے ـــ" یہ محاورہ گونجنے لگا اور لاکھ ضبط کرنے پر بھی وہ اپنے غصّے کو نہ روک سکا اور چلّا اٹھا:

"ارے کاہل اور کمینے لڑکو، کھیتوں کو بیچ دو گے؟"ـــــ اس کی آواز رندھ گئی اور اگر لڑکے تھام نہ لیں تو وہ گر پڑتا۔ وہ زار زار رونے لگا۔

لڑکوں نے اسے لاکھ سمجھایا بجھایا:

"جی نہیں، ہم ہرگز زمین نہ بیچیں گے ـــ"

بوڑھے نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا: "زمینوں کی بکری کے ساتھ خاندان کا خاتمہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہم زمین سے نکلے اور اسی میں سما جائیں گے ـــــ اور اگر زمین باقی رہنے دو گے تو زندہ رہو گے ـــــ زمین تم سے کوئی نہیں چھین سکتا ـــ"

بوڑھے کے آنسو گالوں پر سوکھ گئے اور وہیں نمکین دھبے بن گئے۔ جھک کر اس نے مٹھی بھر مٹّی اٹھائی اور آہستہ سے کہا:

"اگر زمین کو بیچو گے تو برباد ہو جاؤ گے۔"
دونوں بیٹوں نے آزو بازو کا سہارا دے کر اسے اٹھایا۔ نرم نرم گرم گرم مٹی اب بھی اس کی مٹھی میں بند تھی۔ دونوں لڑکے تسلی دینے کے لیے رہ رہ کر کہنے لگتے:
"ابا جان، یقین کیجیے اطمینان رکھیے۔ یہ زمین ہرگز نہ بکے گی۔"
لیکن بوڑھے کی پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر وہ مسکرا دیتے تھے۔

تمام شد

عام پسند سلسلہ

اُردو زبان کی ترقی و اشاعت کے لیے بہت دنوں سے یہ ضروری خیال کیا جارہا تھا کہ سلیس عبارت میں مفید اور دل چسپ کتابیں مختصر حجم اور کم قیمت کی بڑی تعداد میں شایع کی جائیں۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) نے اسی ضرورت کے تحت عام پسند سلسلہ شروع کیا ہی اور اس سلسلے کی پہلی کتاب ہماری قومی زبان ہی جو اُردو کے ایک بڑے محسن اور انجمن ترقی اُردو (ہند) کے صدر جناب ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو کی چند تقریروں اور تحریروں پر مشتمل ہی۔ امید ہی کہ یہ سلسلہ واقعی عام پسند ثابت ہوگا اور اُردو کی ایک بڑی ضرورت پوری ہوکر رہے گی قیمت ۸ر

ہمارا رسم الخط

از جناب عبدالقدوس صاحب ہاشمی

رسم الخط پر علمی بحث کی گئی اور تحقیق و دلیل کے ساتھ یہ ثابت کیا گیا ہی کہ ہندستان کی مشترکہ تہذیب کے لیے اُردو رسم الخط مناسب ترین اور ضروری ہی۔ گیارہ پیسے کے ٹکٹ بھیج کر طلب کیجیے۔